تحقیق و مکالمہ پر مبنی علمی و فکری جریدہ

کتابی سلسلہ

سالنامہ اسلام آباد

تحقیقات

TAHQIQAAT

2024

مُسلم دُنیا اور دستوری بحران

مدیرِ اعلیٰ

محمد اسرار مدنی

خصوصی اشاعت
2024

سرپرستِ اعلیٰ
پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز

مدیرِ اعلیٰ
محمد اسرار مدنی

مدیر
شفیق منصور

تحقیق و مکالمہ پر مبنی علمی و فکری جریدہ

سالنامہ — کتابی سلسلہ — اسلام آباد

تحقیقات

TAHQIQAAT
2024

مُسلم دُنیا اور دستوری بحران

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی اُمور
اسلام آباد، پاکستان
+92 311 02 99 995
+92 51 27 26 805

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها

وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل

إن الله نعما يعظكم به إن الله كان سميعا بصيرا

Indeed, Allah commands you to render trusts to whom they are due and when you judge between people to judge with justice. Excellent is that which Allah instructs you. Indeed, Allah is ever Hearing and Seeing.

النساء: ٥٨

فہرست

- پیش لفظ (علامہ ڈاکٹر راغب حسین نعیمی) 5
- مقدمہ مسلم دُنیا کے دساتیر، بحران اور ممکنہ حل (محمد اسرار مدنی)..... 7

دستور: مفہوم، تاریخ اور تشکیل کے عناصر

- دستور: تعارف و خصوصیات 17
- مغرب میں دستور: تاریخ، ارتقاء اور مسائل 21
- مذہب و ریاست کے مابین تعلق کا تحقیقی مطالعہ 29
- معاصر دساتیر اور مذہب 33

مسلم دُنیا میں دساتیر: تاریخی، ثقافتی اور قومیتی پہلو

- مسلم دُنیا میں دستور سازی کا آغاز..... 39
- اسلامی دستور: ارتقائی مراحل اور فنی تشکیل 52
- عصر حاضر میں اسلامی دساتیر کی کاوشیں..... 71
- 'اسلامی تمدن میں آئینی بحران'..... 82
- عصر حاضر میں آئین سازی کے اختیارات اور اسلامی نقطہ نظر..... 97
- اسلامی فقہی نقطہ نظر اور جدید آئینی تصورات: تطبیقی مسائل 105

مسلم ممالک میں دساتیر: مذہبی نقطہ نظر اور عملی کاوشیں

- اسلامی دستور میں حقوقِ انسانی کی مرکزیت 115
- مسلم ممالک کے دساتیر کی جامعیت 128
- او آئی سی کے مسلم رکن ممالک کے دساتیر میں اسلامی عنصر..... 133
- مسلم ممالک کے دساتیر میں بنیادی انسانی حقوق 136

- مسلم ممالک کے دساتیر میں مذہبی آزادی اور اقلیتی حقوق کی دفعات 146
- آئینی بحران، نوآبادیاتی اثرات اور چیلنجز 152
- عرب بہار کے دساتیر پر اثرات..... 159
- ریاست کے اسلامی ہونے کے معیارات اور سیاسی تشکیل کی قدریں 168

دستور سے متعلق مذہبی تحریکات کے نظریات

- جدید آئینی تشکیل: مذہبی جماعتوں کے نظریات کا تجزیہ 179
- افغان جہاد اور اسلامی دستور 188
- ریاستِ پاکستان کی شرعی حیثیت: تحریکِ طالبان پاکستان کا موقف 201

مسلم دنیا میں دساتیر: سیاسی و قانونی پہلو

- تیونس کا دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات 211
- انڈونیشیا کا آئین: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات..... 219
- بنگلہ دیشی دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات..... 227
- خلیجی ریاستوں کے دساتیر: سیاسی و قانونی مسائل و خصوصیات 235
- ملائیشیا کا آئین: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات 242
- ترکی کا دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات..... 249
- مصر کا دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات 255
- پاکستان کا دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات..... 261
- پاکستان کے دستور کا اسلامی تشخص 270
- پاکستان کے تجربات سے اسلامی آئین سازی کا سبق 279

پیش لفظ

دنیا بھر کے ممالک میں دساتیر ایک بنیاد فراہم کرتے ہیں، جو نہ صرف ریاست اور عوام کے درمیان تعلقات کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ بنیادی حقوق، حکومتی ڈھانچے، اور ریاستی اختیارات کی حدود کا تعین بھی کرتے ہیں۔ پھر ان میں مسلم دنیا کے دساتیر ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان میں اکثر اسلامی اصولوں اور جدید سیاسی تقاضوں کے امتزاج کی کوشش کی گئی ہوتی ہے۔ یہ کتاب "مسلم دنیا اور دستوری بحران" انہی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی ایک سنجیدہ کاوش ہے، جو دساتیر کی تشکیل اور ان کے عملی نفاذ میں موجود چیلنجز اور مواقع کو سامنے لاتی ہے۔

مسلم دنیا کے بیشتر ممالک نے اپنی آزادی کے بعد اپنے آئینی ڈھانچے کی تشکیل کے دوران نوآبادیاتی اثرات، مقامی روایات، اور مذہبی اصولوں کے درمیان ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان ممالک میں دساتیر کے ذریعے اسلامی اقدار کو ریاستی ڈھانچے میں شامل کرنے کے مختلف تجربات کیے گئے۔ ان تجربات نے مسلم دنیا میں ایک وسیع آئینی مباحثے کو جنم دیا ہے، جو ریاست کی نوعیت اور عوام کے حقوق و فرائض کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مسلم دنیا کے دساتیر میں اقلیتوں کے حقوق، خواتین کے کردار، اور مذہبی آزادی جیسے موضوعات ہمیشہ اہم رہے ہیں۔ جہاں کچھ ممالک نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے واضح قوانین بنائے ہیں، وہیں کئی ریاستوں کو ان معاملات پر بین الاقوامی دباؤ اور مقامی سطح پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس کتاب میں ان پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ قارئین کو یہ سمجھنے میں مدد ملے کہ یہ چیلنجز مسلم دنیا کے سیاسی استحکام اور سماجی ترقی پر کس طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ یہ کتاب ان تمام پہلوؤں کا ایک جامع تجزیہ پیش کرتی ہے، جس کا مقصد نہ صرف موجودہ دساتیر کا جائزہ لینا ہے بلکہ ان کے پس منظر، ارتقاء، اور چیلنجز کو بھی سمجھنا ہے۔

سالنامہ تحقیقات کا یہ کتابی سلسلہ ایک عمدہ کاوش ہے جو نہ صرف مسلم دنیا کے آئینی ڈھانچوں کا تجزیہ

کرتا ہے بلکہ یہ بھی دکھاتا ہے کہ کس طرح ان دساتیر کے ذریعے اسلامی اور جمہوری اصولوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب محققین، طلبہ، اور پالیسی سازوں کے لیے ایک قیمتی دستاویز ہے، جو مسلم دنیا کے سیاسی اور آئینی بحرانوں اور مستقبل کے حوالے سے اہم سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

مسلم دنیا نے گزشتہ صدیوں میں بے شمار سیاسی، سماجی، اور اقتصادی تبدیلیوں کا سامنا کیا ہے، جنہوں نے ان ممالک میں آئینی ڈھانچوں کی تشکیل پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ خلافت عثمانیہ کے سقوط سے لے کر نوآبادیاتی نظام کے خاتمے تک، اور موجودہ جمہوری و آمریت پر مبنی نظاموں تک، ہر دور نے اپنے مخصوص نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ کتاب ان تمام مراحل کو تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کرتی ہے تاکہ قارئین ان تغیرات کو ایک وسیع تر تناظر میں سمجھ سکیں۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ مسلم دنیا کے آئینی بحرانوں کا صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملی پہلوؤں سے بھی تجزیہ کرتی ہے۔ کیا دساتیر نے اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا ہے؟ کیا طاقت کے مراکز میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی؟ اور کیا ان آئینی ڈھانچوں نے عوامی بہبود اور سماجی انصاف کو یقینی بنایا ہے؟ ان سوالات کے جواب میں کتاب مختلف ممالک کے آئینی ماڈلز کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب قارئین کو مسلم دنیا کے آئینی بحرانوں، کامیابیوں، اور ناکامیوں کو سمجھنے میں مدد دے گی۔

علامہ ڈاکٹر راغب حسین نعیمی

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد

پرنسپل جامعہ نعیمیہ لاہور

مقدمہ

مسلم دُنیا کے دساتیر، بحران اور ممکنہ حل

جدید دور میں مسلم دنیا کے دستوری ڈھانچوں کی تشکیل ہر جگہ ایک پیچیدہ اور متنوع عمل رہا ہے، جس کی جڑیں خلافت عثمانیہ کے دور سے جاملتی ہیں۔ خلافت کے خاتمے اور نوآبادیاتی قوتوں کی آمد کے بعد مسلم دنیا میں آئینی ڈھانچوں نے ایک نیا رخ اختیار کیا، جہاں مقامی حکومتوں کو نوآبادیاتی طاقتوں کے قانونی اور سیاسی اثر ورسوخ کے تحت ڈھالنے کی بھی کوشش کی گئی۔

نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد مسلم ممالک نے اپنی خود مختاری حاصل کی، تو ان کی آئینی تشکیل میں دو اہم پہلو ابھرے: ایک طرف شریعت کو بنیاد بناتے ہوئے اسلامی اقدار کو آئین کا حصہ بنانے کی کوشش کی گئی، اور دوسری طرف جدید قومی ریاستوں کے تقاضوں کے مطابق جمہوری اصول اپنانے کی بحث چھڑی۔ اس دوہری کشمکش نے مختلف ممالک میں مختلف آئینی ماڈلز کو جنم دیا، جیسا کہ سعودی عرب نے شریعت کو مکمل آئینی بنیاد بنایا، جبکہ ترکی نے ایک سخت سیکولر آئین اپنایا۔ ان تاریخی عوامل نے مسلم دنیا میں آئینی ڈھانچوں کی تشکیل کو ایک منفرد اور متنوع عمل بنایا، جس کا اثر آج بھی کئی ممالک کی سیاسی اور سماجی صورتحال پر دکھائی دیتا ہے۔

اگرچہ مسلم دنیا کے اکثریتی ممالک نے کوئی نہ کوئی آئین وضع کر رکھا ہے، مگر دستور سے جڑے کئی بحران بھی بہت شدید ہیں۔ یہ آئینی بحران بنیادی طور پر سیاسی، مذہبی، اور سماجی عوامل کے پیچیدہ امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں، جہاں آئین کی تشکیل میں عالمی معیارات، شریعت کے اصولوں اور مقامی ثقافتوں کے درمیان توازن قائم کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ بیشتر مسلم ممالک نے مغربی ماڈلز کو اپنانا شروع کیا، تاہم ان کے آئینی ڈھانچے میں مقامی مذہبی اور ثقافتی شناختوں کو نظرانداز کرنے کے نتیجے میں سیاسی عدم استحکام جیسے مسائل نے جنم لیا۔ مزید برآں، اقلیتوں کے حقوق، طاقت کے

توازن اور عدلیہ کی خود مختاری جیسے مسائل نے آئینی بحران کو مزید گہرا بنا دیا، جس سے ان ممالک میں اصلاحات اور تبدیلیوں کی راہ میں رکاوٹیں آئیں۔ ان بحرانوں کا حل صرف آئینی ڈھانچوں میں اصلاحات اور مقامی اقدار کے ساتھ ہم آہنگی کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔

مسلم دنیا کو آئینی نظام کی تشکیل میں مغرب کی ہو بہو نقل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ہر معاشرتی اور سیاسی نظام اپنے تاریخی، ثقافتی، اور مذہبی پس منظر سے تشکیل پاتا ہے۔ مسلم دنیا کی اپنی سیاسی فقہ میں شورائیت، مشاورت، اور عوامی بہبود کے اصول موجود ہیں، جو اسلامی تعلیمات کا ایک اہم حصہ ہیں۔ یہ اصول نہ صرف مذہبی اعتبار سے معتبر ہیں بلکہ جدید سیاسی تصورات جیسے جمہوریت، سیاسی استحکام، اور انسانی حقوق کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہیں۔ عوامی بہبود کے اسلامی اصول معاشرتی انصاف، غربت کے خاتمے، اور انسانی ترقی پر زور دیتے ہیں، جو کسی بھی آئین کی روح ہونے چاہئیں۔ ان اقدار کو آئینی ڈھانچے میں دوبارہ زندہ کرنے سے ایسے نظام کی تشکیل ممکن ہے جو مقامی ضروریات اور عالمی تقاضوں دونوں کو پورا کر سکے۔

مسلم دنیا میں آئینی ڈھانچوں کی تشکیل کا ایک اہم پہلو یہ رہا ہے کہ اسلامی شریعت کے اصولوں کو جدید آئینی اور قانونی تقاضوں کے ساتھ کیسے ہم آہنگ کیا جائے۔ شریعت، جو اسلامی قوانین اور اخلاقیات کا مجموعہ ہے، مسلمانوں کے لیے ایک جامع ضابطہ حیات فراہم کرتی ہے۔ تاہم، جدید قومی ریاست کے تصور کے تحت آئین سازی میں جمہوری اصولوں اور انسانی حقوق جیسے تصورات کو بھی شامل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ امتزاج کئی مسلم ممالک میں ایک پیچیدہ عمل ثابت ہوا، جہاں بعض اوقات مذہبی اور سیکولر عناصر کے درمیان تنازعات نے آئینی استحکام کو چیلنج کیا۔ مثال کے طور پر، پاکستان کا آئین شریعت کو بنیادی ماخذ قرار دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی جمہوری اور انسانی حقوق کے اصولوں کو بھی تسلیم کرتا ہے، جس سے ایک متوازن آئینی ماڈل تشکیل دینے کی کوشش کی گئی۔

اسلام اور آئینی اصولوں کی مطابقت کی بحث مختلف مسلم ممالک میں متنوع شکلیں اختیار کرتی آئی ہے۔ کچھ ممالک جیسے سعودی عرب اور ایران نے اپنے آئین کو مکمل طور پر شریعت پر مبنی بنایا، جبکہ ترکی اور انڈونیشیا نے سیکولر آئینی اصول اپنائے، جہاں مذہب کو حکومتی معاملات سے الگ رکھا گیا۔

اس امتزاج کی عملی تعبیر میں چیلنجز اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب انسانی حقوق، خاص طور پر خواتین کے حقوق، آزادی اظہار، اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ جیسے امور شریعت کی روایتی تشریحات کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوں۔ ان اختلافات کو حل کرنے کے لیے اجتہاد، قانونی اصلاحات، اور سماجی مکالمے کی ضرورت ہے تاکہ آئین کو اسلامی اقدار اور جدید قانونی اصولوں کا ایک جامع اور عملی نمونہ بنایا جاسکے۔

مسلم دنیا میں آئینی ماڈلز کے تنوع کی جڑیں ان کے تاریخی، سماجی، اور سیاسی حالات میں پیوست ہیں۔ صدارتی نظام، جیسا کہ ترکی اور مصر میں دیکھا جاتا ہے، طاقت کے ارتکاز اور تیز فیصلے کرنے کی صلاحیت کے لیے جانا جاتا ہے۔ تاہم، یہ نظام اکثر آمرانہ طرز حکمرانی کا شکار ہو جاتا ہے، جیسا کہ مصر میں عبدالفتاح السیسی نے کیا۔ پارلیمانی نظام، جیسا کہ پاکستان اور عراق میں اپنایا گیا، زیادہ عوامی اور جمہوری سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ اکثر سیاسی عدم استحکام، مخلوط حکومتوں کے تنازعات، اور پالیسی سازی میں سست روی کا شکار ہوتا ہے۔ مخلوط نظام، جو دونوں ماڈلز کے عناصر کو یکجا کرتا ہے، تیونس جیسے ممالک میں تجربہ کیا گیا ہے، لیکن اس میں بھی اختیارات کے توازن اور حکومتی فیصلوں کی مؤثر عملداری کے مسائل سامنے آتے ہیں۔

ان آئینی ماڈلز کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار محض نظام کی ساخت پر نہیں بلکہ سیاسی کلچر، عوامی شعور، تعلیم، اداروں کی مضبوطی، اور عوامی شراکت کی نوعیت پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً، ترکی کا صدارتی نظام ابتدائی طور پر ترقی اور استحکام کا ذریعہ سمجھا گیا، لیکن حالیہ دہائیوں میں یہ نظام جمہوری اصولوں کی کمزوری اور اختیارات کے ارتکاز کا شکار ہوا۔ دوسری جانب، پاکستان میں پارلیمانی نظام کئی بار فوجی مداخلت اور سیاسی بحرانوں کی وجہ سے اپنی اصل روح میں کام نہیں کر سکا۔ تیونس کے مخلوط نظام نے جمہوری تبدیلی کی امید پیدا کی، لیکن سیاسی جماعتوں کے مابین اختلافات نے اس کے مؤثر ہونے پر سوالات اٹھائے۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آئینی ماڈلز کی کامیابی کے لیے محض ڈھانچے سے زیادہ مضبوط اداروں، سیاسی برداشت، اور عوامی حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسلم دنیا کے دساتیر میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا اعادہ کیا گیا ہے، لیکن کئی ممالک میں ان پر عمل

درآمد ہمیشہ ایک چیلنج رہا ہے۔ بیشتر دساتیر میں مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے اصول تو موجود ہیں، لیکن ان اصولوں کی عملی تشریح اور نفاذ میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، پاکستان کے آئین میں اقلیتوں کو مساوی حقوق فراہم کیے گئے ہیں، مگر، عملی طور پر، کبھی کبھار مسائل بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔اسی طرح، مصر میں قبطی مسیحیوں کو آئینی حقوق حاصل ہیں، لیکن ان کے خلاف سماجی اور قانونی امتیاز کی مثالیں بھی بار بار سامنے آتی ہیں۔

ان چیلنجز کی ایک بڑی وجہ آئین اور اس کی تشریح کے درمیان موجود فرق ہے۔ کئی مسلم ممالک میں آئینی دفعات کو اس طرح نافذ کیا جاتا ہے کہ وہ صرف اکثریتی برادری کے مذہبی یا سماجی اصولوں سے مطابقت رکھیں، جس سے اقلیتوں کے حقوق پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ایران میں آئینی طور پر زرتشتی، یہودی، اور مسیحی اقلیتوں کو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن بہائی برادری کو قانونی اور سماجی مشکلات کا سامنا ہے۔ ان مسائل کی جڑیں بعض اوقات اکثریتی برادری کے نظریات، سماجی تعصبات، اور بعض اوقات ریاستی پالیسیوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس لیے مسلم دنیا میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے محض آئینی دفعات کافی نہیں، ان دفعات کے مؤثر نفاذ اور اقلیتوں کو عملی تحفظ فراہم کرنے کے لیے سیاسی عزم، قانونی اصلاحات، اور سماجی شعور کی بھی ضرورت ہے۔

مسلم دنیا میں آئینی نظام کے تحت جمہوریت کو فروغ دینے کی کوششیں ایک اہم لیکن متنازع موضوع رہی ہیں۔ کئی ممالک نے جمہوری اصولوں کو اپنانے کے لیے آئینی ترامیم کیں، جن میں انتخابات، انسانی حقوق، اور اقتدار کی پرامن منتقلی شامل ہیں۔ لیکن فوجی مداخلتوں اور آمرانہ حکومتوں نے ان کوششوں کو بار بار نقصان پہنچایا۔ آمرانہ نظام کی تقویت کی ایک بڑی وجہ مسلم دنیا کے کئی ممالک میں سیاسی اور سماجی استحکام کا فقدان ہے۔ آمرانہ حکومتیں عموماً آئینی اصولوں کو توڑ مروڑ کر اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرتی ہیں، جس سے جمہوریت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، مصر میں 2011 کے عرب بہار کے بعد جمہوریت کے قیام کی امیدیں پیدا ہوئیں، لیکن آئینی تبدیلیوں کے باوجود آمرانہ نظام دوبارہ غالب آ گیا۔ یہ مسائل جمہوریت کے ساتھ ساتھ آئینی فریم ورک کی کمزوری کو بھی ظاہر کرتے ہیں، جہاں سیاسی جماعتوں، عدلیہ، اور دیگر اداروں کو مؤثر طریقے سے کام کرنے کے

لیے آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ نتیجتاً، جمہوریت اور آمرانہ نظام کے درمیان کشمکش مسلم دنیا میں آئینی استحکام اور عوامی اعتماد کو نقصان پہنچا رہی ہے۔

مسلم دنیا میں آئینی اصلاحات کے ضمن میں عالمی دباؤ اور بین الاقوامی قوانین کا اثر بھی ایک نمایاں حقیقت ہے۔ اقوام متحدہ، یورپی یونین، اور دیگر بین الاقوامی ادارے اکثر انسانی حقوق، جمہوریت، اور شفافیت کو فروغ دینے کے نام پر حکومتوں پر دباؤ ڈالتے ہیں اور نتیجے میں کئی مرتبہ آئینی ترامیم کی جاتی ہیں۔ مگر، یہ اصلاحات مقامی سطح پر ہمیشہ مؤثر یا مقبول نہیں ہوتیں۔ اکثر ان پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ وہ عوامی امنگوں کے بجائے عالمی طاقتوں کو مطمئن کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ مصر میں عرب بہار کے بعد آئینی اصلاحات کا نفاذ ایک مثال ہے، جہاں جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے عالمی دباؤ کے تحت تبدیلیاں تو کی گئیں، لیکن ان کا عملی نفاذ محدود رہا۔ مزید برآں، بعض ممالک میں یہ دباؤ قومی خود مختاری کے اصولوں سے متصادم سمجھا جاتا ہے، جس سے عوام اور حکومت کے درمیان عدم اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ نتیجتاً، بین الاقوامی دباؤ کے تحت کی گئی آئینی اصلاحات عموماً دودھاری تلوار ثابت ہوتی ہیں، جو ایک طرف انسانی حقوق کے فروغ میں مددگار ہوتی ہیں، تو دوسری طرف سیاسی اور سماجی تنازعات کو جنم دیتی ہیں۔

مسلم دنیا میں آئینی استحکام اور اس کے معیشت پر اثرات کا مسئلہ بھی ایک گہرے تجزیے کا متقاضی ہے۔ آئین کی مضبوطی اور شفافیت کسی بھی ملک میں سرمایہ کاری کے ماحول کو بہتر بنانے اور معیشت کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جن ممالک میں آئینی ڈھانچہ مستحکم ہے، وہاں معیشت زیادہ متحرک اور ترقی پذیر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، ملائیشیا اور انڈونیشیا نے آئینی استحکام اور جمہوری اداروں کی مضبوطی کے ذریعے غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دیا، جس کے نتیجے میں ان کی معیشت نے نمایاں ترقی کی۔ آئین کے تحت واضح کیے گئے قانونی اقدامات سرمایہ کاروں کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں اور معاہدوں پر عمل درآمد یقینی ہے۔ اس کے برعکس، جہاں آئینی عدم استحکام پایا جاتا ہے، وہاں معیشت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے کئی ممالک میں، سیاسی بحرانوں اور آئینی تنازعات کی وجہ سے معیشت میں زوال آیا۔ آئینی شفافیت اور

عوامی شمولیت کے بغیر، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور کرپشن جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جو نہ صرف معیشت بلکہ معاشرتی ڈھانچے کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس لیے، آئینی استحکام نہ صرف سیاسی نظم وضبط بلکہ معیشت اور معاشرتی فلاح وبہبود کے لیے بھی ناگزیر ہے۔

مسلم دنیا میں آئینی اصلاحات کے آئندہ امکانات کا جائزہ لینے کے لیے کئی اہم پہلوؤں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ موجودہ دور کے تقاضے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آئین کو معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لیے مزید جامع اور شفاف بنانا ناگزیر ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم تجویز یہ ہے کہ آئین میں شہری حقوق اور آزادیوں کو زیادہ وضاحت اور زور کے ساتھ شامل کیا جائے، تاکہ عوام کا اعتماد آئینی نظام پر بحال ہو۔ اسی طرح، آئین سازی کے عمل میں عوامی شمولیت کو یقینی بنانا بھی ایک لازمی قدم ہوگا، کیونکہ عوامی مشاورت سے تشکیل دیے گئے آئین زیادہ مستحکم اور قابل قبول ثابت ہوتے ہیں۔

علاقائی اور بین الاقوامی تجربات کو مد نظر رکھتے ہوئے، مسلم دنیا کے آئینی نظام کو عالمی معیار کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے، جس میں انسانی حقوق، خواتین کے حقوق، اور اقلیتوں کے تحفظ پر خاص زور دیا جائے۔ ایک اور اہم پہلو آئینی عدالتوں اور آزاد عدلیہ کے کردار کو مضبوط بنانا بھی ہے، تاکہ آئینی تنازعات کو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ طریقے سے حل کیا جا سکے۔ آئینی اصلاحات کے ذریعے سیاسی نظام میں طاقت کی تقسیم کو متوازن بنایا جا سکتا ہے، تاکہ آمرانہ رجحانات کا خاتمہ ہو اور جمہوریت کو فروغ ملے۔

پاکستان سمیت مسلم دنیا میں عسکریت پسند جماعتیں جو جدید آئینی ڈھانچے کو تسلیم نہیں کرتیں، انہیں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جدید آئینی نظام میں اصلاحات اور شریعت کے اصولوں کا انضمام ممکن ہوتا ہے۔ یہی سبق پوری مسلم دنیا کی آئینی روایت سے ملتا ہے۔ تاریخی طور پر، مسلم دنیا میں مختلف ریاستوں نے اسلامی اقدار اور جدید آئینی اصولوں کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آئینی اصلاحات صرف طاقت کے ذریعے نہیں، بلکہ سیاسی، سماجی اور قانونی مکالمے اور مفاہمت کے ذریعے ہی ممکن ہوتی ہیں۔ پاکستان میں بھی آئین سازی کے عمل میں علماء کرام کی شمولیت سے اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ وہ اسلامی شریعت کے اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اس موضوع پر مزید

مکالمہ بھی کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے لیے پہلے ضروری ہے کہ تشدد کا راستہ ترک کیا جائے۔

بہر حال، مسلم دنیا کی سیاسی اشرافیہ، عوامی نمائندگان اور مذہبی طبقات کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آئین کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود، معاشی ترقی، اور قومی ہم آہنگی کو فروغ دینا ہوتا ہے، اور اس کے لیے ایک جامع، متوازن اور دین سے ہم آہنگ آئینی ڈھانچہ ضروری ہے۔ کامیاب آئینی اصلاحات ایک ایسے مسلم معاشرے کی تشکیل میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں جو ماضی کی روایات کا احترام کرتے ہوئے جدید دور کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو۔

سالنامہ تحقیقات کے کتابی سلسلہ کا یہ شمارہ (2024ء) ایک کاوش ہے کہ مسلم دنیا میں دستور سازی کے عمل کی جامع تفہیم فراہم کی جائے، جس میں مختلف مسلم ممالک کے آئینی بحران، سیاسی نظام، مذہبی عنصر اور سماجی استحکام کے باہمی تعلق کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں مسلم دنیا کی آئینی تاریخ، شرعی تقاضوں، عملی مشکلات، قانونی و سیاسی پیچیدگیوں، اور دستوری تبدیلیوں اور ان کے اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا مقصد مسلم دنیا میں آئینی عمل کی موجودہ صورتحال کو سمجھنا اور ممکنہ اصلاحات کا جامع تجزیہ کرنا ہے، تاکہ دستوری عمل کے مختلف پہلوؤں کا ایک وسیع تناظر سامنے آسکے۔ اگرچہ ان موضوعات پر اردو زبان میں مواد انتہائی محدود تھا، لہذا ہم نے ٹیم سمیت شب و روز محنت کر کے کئی اہم مضامین و مقالات کے تراجم اور پھر ان کی تلخیص میں کلیدی کردار ادا کیا، جبکہ کچھ اہل علم کے مضامین، تراجم اور نتائج فکر کو شامل کر کے یہ مجموعہ مرتب ہوا، خصوصاً ادارتی ٹیم کے فعال رکن شفیق منصور نے تراجم میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ہم اِس کاوش میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

محمد اسرار مدنی

مدیر اعلیٰ تحقیقات

tahqiqaat.pk

دستور:

مفہوم، تاریخ اور تشکیل کے عناصر

دستور: تعارف و خصوصیات

دستور کا مفہوم

دستور کے لغوی معنی قاعدہ، قانون، طرز، روش، رسم و رواج، معمول، عادات، ڈھنگ اور اجازت کے ہیں۔ دراصل یہ لفظ ''دست'' اور ''ور'' سے مرکب ہے جس کے معنی صاحبِ پسند کے ہیں۔ اس طرح دستور کے معنی بنیادی قاعدے یا قوانین کے ہیں جن کے مطابق امور مملکت انجام دیے جاتے ہیں۔

دستور کی تعریف مختلف سیاسی مفکرین نے مختلف انداز سے کی ہے۔ ان اختلافات کی وجوہات وہ تصورات اور نظریات ہیں جنہیں سیاسی مفکرین نے دستور کی تعریف و توضیح میں سمونے کی کوششیں کی ہیں۔ دستور کی چند منتخب تعریفیں یہ ہیں:

ارسطو کے الفاظ میں:

''دستور ان بنیادی اصولوں کو کہتے ہیں جن کے مطابق حکومت کا انتظام چلایا جاتا ہے''۔[1]

پروفیسر ڈائیسی Prof. Dicey دستور کی تعریف اس طرح کرتے ہیں

''دستور ان قاعدوں کو کہتے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ امور مملکت پر اثر انداز ہوتے ہیں''۔[2]

گل کرائیسٹ Gillchrist دستور کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

The constitution of a state is that body of rules and laws written or unwritten which determine the organization of government, the distribution of the various organs of government general principles on which these powers are to be exercised.[3]

''کسی ملک کا دستور ان تحریری اور غیر تحریری اصولوں اور قوانین کا مجموعہ ہوتا ہے جن کے ذریعہ

---

[1] blerton Sınanı, A Critical-Legal Overview of the Concept of Constitution

[2] International IDEA, What is a Constitution? Principles and Concepts

[3] blerton Sınanı, A Critical-Legal Overview of the Concept of Constitution

نظام حکومت کو متعین کیا جاتا ہے اور مختلف شعبہ جات حکومت کے درمیان تقسیم اختیارات عمل میں لائے جاتے ہیں اور عام اصولوں کے مطابق اختیارات کا استعمال ہوتا ہے"۔

ان تعریفات سے پتہ چلتا ہے کہ دستور ان بنیادی اصولوں، خاص ضابطوں اور طریقوں سے منظور شدہ قوانین اور رسم و رواج کے مجموعے کو کہتے ہیں جن کے مطابق مملکت کی تنظیم کی جاتی ہے۔ دیگر لفظوں میں دستور ریاست کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ ہم کسی مملکت کے دستور سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ حکومت کن اصولوں پر قائم ہے۔ جمہوری یا شخصی، پارلیمانی یا صدارتی، وحدانی یا وفاقی۔ اس سے ہم یہ بھی پتہ لگا سکتے ہیں کہ اختیارات حکومت کس طرح تقسیم کیے گئے ہیں۔ مجلس، قانون ساز اور اختیارات کے علاوہ ہم عدالتی نظام کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں۔

اقتدار کا یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ اپنے تئیں مزید اختیارات کو مجتمع کرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حکمرانوں کے اختیارات کے حدود متعین کر دیے جائیں، اور یہ حدود دستور کے تحت متعین کیے جاتے ہیں۔ دستور مملکت کا اعلیٰ قانون ہوتا ہے۔ اور بغیر دستور کے کوئی حکومت نہیں چل سکتی اس لیے یہ سیاسی لحاظ سے اہم اور سب سے اعلیٰ قانون ہوتا ہے۔

مثالی دستور

دستور کی تدوین میں چند اہم اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو وہ پائیدار اور مثالی بن سکتا ہے۔ مثالی دستور کی چند اہم ضروریات حسب ذیل ہیں:

(۱) دستور کی زبان صاف اور واضح ہونے کے علاوہ لفظی ہیر پھیر اور نظریات و تصورات کی پیچیدگیوں سے پاک ہونی چاہئے۔

(۲) دستور کی زبان آسان ہو تاکہ دستور عام فہم ہو سکے۔ ذو معنی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جانا چاہئے۔ یہ امر واقع ہے کہ تحریری دستور بہ مقابلہ غیر تحریری دستور کے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ تحریری دستور میں معنی و مطالب متعین کیے جا سکتے ہیں۔ آئین کے الفاظ اس خوبی سے ترتیب دیے جائیں کہ مطلب بھی واضح ہو اور زبان کی خوبی بھی برقرار رہے۔ تاکہ اس کی تشریح اور تعبیر بھی وقت اور زمانہ کے لحاظ سے مناسب طریقہ پر کی جا سکے۔ گنجلک

اور بھونڈے الفاظ آئین کی اہمیت کو گھٹا دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ الفاظ کو درست کرنے کے لیے بار بار ترمیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ شکوک اور شبہات دور کرنے کے لیے آئین کافی غور و فکر کے بعد مرتب کیا جائے، اور الفاظ وہ استعمال کیے جائیں جو نہ زیادہ مشکل اور مبہم ہوں اور نہ اتنے آسان اور عام فہم جس سے عوام غلط نتیجہ اخذ کر لیں۔ عموماً ایسے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں جو عام آئینی الفاظ تصور کیے جاتے ہیں اور جن کے معنی بھی متعین اور واضح ہوں۔

(۳) ایک خصوصیت آئین کی جامعیت ہے یعنی اس میں اتنی وسعت ہونی چاہیے کہ وہ حکومت کے تمام شعبوں کے اختیارات، ان کے باہمی تعلقات، ترمیم کا طریقہ، بنیادی حقوق اور دیگر ضروری باتوں کا احاطہ کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بنیادی بات تحریر کرنے سے رہ جائے۔ ورنہ اس کے عمل میں زبردست خلا پیدا ہو جائے گا۔ اس قسم کا دستور آسانی کے ساتھ عوام کے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے اور اس کو ہر صورتحال کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔

(۴) آئین کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ نہ وہ بہت زیادہ ضخیم ہو اور نہ انتہائی مختصر۔ مختصر آئین زیادہ الجھن اور پراگندگی کا باعث ہوتا ہے۔ ضخامت اس کی ترمیم کو دشوار گزار بنا دے گی۔ اس لیے کہ اس میں حال اور مستقبل کے لیے تمام ضروری اور غیر ضروری باتیں درج ہوں گی۔ ضرورت اور وقت کے مطابق اگر اس میں ترمیم نہ ہو سکی تو عوام میں بے چینی پھیلے گی اور یہ ہو سکتا ہے کہ اعتماد اٹھ جائے اور سرے سے آئین ختم کرنا پڑے۔ آئین میں غیر ضروری تفصیلات کا درج کرنا ضروری نہیں ہے اگر اس میں وقت اور ضرورت کے مطابق بعض ترمیموں کی گنجائش رکھی جائے تو یہ زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

(۵) اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ دستور میں ترمیمات آسانی کے ساتھ لائی جا سکیں تاکہ یہ آئندہ وقتوں کا ساتھ دے سکے۔ نیز دستور میں ترمیم اور نئی شقوں کے لیے عوامی رائے بھی اہم ہے۔

(۶) دستور میں شہریوں کے بنیادی حقوق کا ذکر کیا جانا چاہیے تاکہ عوام اپنے حقوق سے بہ خوبی

واقف ہوں اور انہیں اطمینان ہو کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں۔

دستور میں ترامیم کا حق

یہ بات مسلم ہے کہ تحریری آئین حال اور مستقبل کی تمام ضروریات اور حالات کا جائزہ نہیں لے سکتا۔ اور نہ انہیں ضبط تحریری لا سکتا ہے اس لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ تحریری آئین میں وقت اور ضرورت کے مطابق ترمیم کی جائے، تاکہ ترقی پذیر حالات اور زمانہ سے مطابقت کر سکے۔ ہر تحریری آئین میں ترمیم کا بھی طریقہ وضاحت سے درج ہوتا ہے۔

مختلف ممالک میں ترمیم کے لیے مختلف طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ عام طور پر ترمیم کے لیے مندرجہ ذیل طریقے استعمال ہوتے ہیں۔

بعض تحریری دساتیر میں ترمیم مقننہ کے اراکین کی مخصوص اکثریت سے کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مقننہ کے کل اراکین کی دو تہائی یا تین چوتھائی اکثریت سے۔ زیادہ تر ممالک میں بشمول ہندوستان، پاکستان، روس، امریکا وغیرہ میں یہی طریقہ رائج ہے۔

ترمیم کے لیے ایک مخصوص ادارے کی بھی تشکیل کی جاتی ہے۔ امریکا میں ترمیم کے لیے ایک قومی کنونیشن ریاستوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے دو تہائی اکثریت سے بلایا جاتا ہے۔

ترمیم استصواب رائے کے ذریعے بھی کی جاتی ہے۔ اس میں آئینی ترمیمات پر عوام کی رائے لی جاتی ہے یہ طریقہ برطانیہ اور آسٹریلیا میں نافذ ہے۔ پہلے، ترمیم کی کسی تجویز کا پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی مطلق اکثریت سے منظور ہونا ضروری ہے پھر اس تجویز کو کم سے کم دو مہینہ گزرنے کے بعد یا زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر ہر ریاست کے رائے دہندوں کی رائے لینے کے لیے پیش کرنا ضروری ہوگا۔

وفاقی ریاستوں میں ترمیمات کے لیے ریاستوں (یا صوبوں) کی قانون ساز اسمبلیوں کی منظوری بھی ضروری ہوتی ہے۔ خصوصی طور پر آئین کی وہ دفعات جو صوبوں اور وفاق کے مابین اختیارات کی تقسیم سے متعلق ہیں، ان کی ترمیم کے لئے ریاستوں کی اکثریت لازمی ہے۔ آسٹریلیا، بھارت، امریکا وغیرہ میں بھی یہی طریقہ رائج ہے۔

مغرب میں دستور: تاریخ، ارتقاء اور مسائل

مغربی اور یورپی ممالک میں آجکل مذہب کو چونکہ ریاستی معاملات سے الگ رکھا جاتا ہے، اس لیے دستور سازی میں بھی مذہب کے اثرات نظر نہیں آتے، کہ یہ ایک بنیادی عمرانی معاہدہ ہے۔ اگر تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ایسا ہمیشہ سے نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چرچ اور ریاست کے تعلقات میں تبدیلیاں آئیں اور سیکولرازم کے بڑھتے اثرات کے ساتھ چرچ کا اثر کم ہوتا گیا، پھر بھی کئی یورپی ممالک میں مذہبی ادارے ریاست کے امور میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ مثال کے طور پر، اسپین اور اٹلی جیسے ممالک میں اب بھی مذہب اور ریاست کے درمیان تعلقات موجود ہیں، جہاں آئینی اور قانونی معاملات میں کیتھولک چرچ کا اثر اور دخل ہوتا ہے۔

ذیل میں پہلے مغربی تناظر میں آئین سازی اور مذہب کے تعلق کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا جاتا ہے، اس کے بعد موجودہ مغربی دساتیر کو درپیش مسائل پر بھی اختصار سے تبصرہ کیا جائے گا۔

مذہب کی بنیاد پر ابتدائی آئین سازی

قدیم تہذیبوں میں مذہب کو ریاستی قوانین اور آئینی ڈھانچے کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ ان معاشروں میں مذہب اور سیاست ایک دوسرے کے ساتھ مربوط تھے، اور مذہبی اصولوں کو ریاستی زندگی میں بھرپور طریقے سے نافذ کیا جاتا تھا۔

رومی تہذیب

روم کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے میں مذہب کا اہم کردار تھا۔ رومی حکام نے مذہب کو نہ صرف عوامی زندگی میں بلکہ حکومتی فیصلوں میں بھی شامل کیا۔ "پانتھین" (Pantheon) کے طور پر جانے جانے والے رومی معبد خانے اور مذہبی ادارے، ریاستی امور کی تنظیم میں ایک فعال کردار ادا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ رومی آئین میں مذہبی قوانین اور اقدار سے لاتعلقی جرم تھا، اور ان قوانین کی

پابندی ریاست کے مستحکم نظام کا ایک اہم جزو تھی۔

یونانی تہذیب

یونانی تہذیب میں بھی مذہب اور ریاست کی تفریق نہیں تھی۔ یونانی فلسفہ میں مخصوص مذہبی نظریات کو معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے میں ضم کیا گیا تھا۔ "افلاطون" اور "ارسطو" جیسے فلسفیوں نے سیاسی حکمرانی کے نظریات کو مذہبی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی کتابوں میں اکثر مذہب کو ریاستی حکمرانی کے اصولوں کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے، تاکہ عوامی زندگی میں اخلاقی اور دینی اصولوں کو تحفظ حاصل ہو سکے۔

مذہبی اداروں کی ریاستی اختیارات میں شراکت

قدیم تہذیبوں میں مذہبی ادارے صرف روحانی رہنمائی تک محدود نہیں تھے، بلکہ ریاستی اقتدار میں بھی ان کی ایک اہم جگہ تھی۔ رومی سلطنت میں مذہبی رہنما، جیسے "Priest" اور "Auguste" (مذہبی عہدیدار)، حکومتی مشیر کا کردار ادا کرتے تھے اور ریاستی فیصلوں میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ یونانی معاشرے میں بھی مذہبی ادارے مختلف ریاستی امور میں مشورہ دیتے تھے اور ان کی رہنمائی پر فیصلے کیے جاتے تھے۔

مذہب اور قانون میں ہم آہنگی کا تصور

ان قدیم معاشروں میں، قوانین اور مذہب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ تھے، جس کا مقصد معاشرتی استحکام اور اخلاقی نظم وضبط کو برقرار رکھنا تھا۔ مذہبی اصولوں کی بنیاد پر بنائے گئے قوانین کے ذریعے حکومت نے شہریوں کو اخلاقی اور سماجی ذمہ داریوں کا شعور دیا۔

قرونِ وسطیٰ کے دوران یورپ میں ریاست اور چرچ کے درمیان جو قریبی تعلق تھا، وہ آئین سازی کے عمل میں مذہبی قوانین کی پیروی کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کرتا تھا۔ چرچ نے حکومتی معاملات پر گہرا اثر ڈالا، اور آئین سازی میں اس کا کردار ایک لازمی جزو بن چکا تھا۔ ریاستی نظام کو مذہب سے جڑا ہوا سمجھا جاتا تھا اور حکومت کے قوانین کو مذہبی اصولوں کے مطابق تشکیل دیا جاتا

تھا۔اس وقت کے بیشتر یورپی ممالک میں ریاستی آئین اور قوانین مذہبی تعلیمات پر مبنی ہوتے تھے۔ "پاپائیت" ایک اہم ادارہ تھا، اور پوپ کو ریاست کے معاملات میں بھی اثر ورسوخ حاصل تھا۔ مثال کے طور پر، "رومن ایمپائر" میں پوپ اور بادشاہ کا ایک خاص قسم کا تعلق تھا، جہاں پوپ نہ صرف مذہبی امور کے لئے ذمہ دار تھا بلکہ سیاسی فیصلوں میں بھی مداخلت کرتا تھا۔ یہ اتحاد ایسی نوعیت کا تھا کہ کسی بھی بادشاہ کو تخت پر بیٹھنے سے پہلے پوپ کی باقاعدہ تائید درکار ہوتی تھی۔

چرچ کا آئینی عمل میں اثر ورسوخ

مذہبی اداروں کی ریاستی امور میں مداخلت نے آئین سازی کے عمل میں مذہبی قوانین کے نفاذ کو ممکن بنایا۔ ریاستی آئین میں مذہب کے اثرات کے تحت قوانین مرتب کیے جاتے تھے تاکہ وہ چرچ کی تعلیمات کے مطابق ہوں۔ اس کی ایک نمایاں مثال "کینن لاء" (Canon Law) ہے، جو کیتھولک چرچ کا مذہبی قانون تھا اور جس کا اثر یورپ کے ریاستی آئینی ڈھانچے پر نمایاں تھا۔ کینن لاء نے قانون کی تفصیلات اور حکومت کے عملی اصولوں کو مذہبی عقائد کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، اس طرح چرچ اور ریاست کا اختلاط زیادہ مستحکم ہوا۔

16 ویں صدی میں، "ہنری ہشتم" (Henry VIII) کے دور میں انگلینڈ میں چرچ اور ریاست کے اتحاد کو قانونی طور پر مضبوط بنایا گیا۔ ہنری ہشتم نے انگلینڈ کو کیتھولک چرچ سے الگ کرنے کے بعد "چرچ آف انگلینڈ" قائم کیا، لیکن پھر بھی چرچ کو ریاست کے امور میں اثر ورسوخ حاصل رہا۔ اس وقت انگلینڈ میں بادشاہ کو اپنی سلطنت کے معاملات میں چرچ کی تائید حاصل کرنا ضروری تھا۔

آئین سازی میں چرچ کے فرامین کو اس وقت کے سیاسی رہنماؤں کے توسط سے نافذ کیا جاتا تھا۔ "اقتدار اعلیٰ" کا تصور بھی چرچ کے اثر سے وابستہ تھا، جس کے مطابق تمام ریاستی اختیارات خدا کی مرضی سے ہونے ہوتے اور ریاستی حکام کو چرچ کی رہنمائی کے تحت فیصلے کرنا ضروری تھا۔ اِس دور کے آئین میں روحانی اور مذہبی رہنماؤں کو قانونی تحفظ حاصل تھا۔

نشاۃ ثانیہ اور سیکولر آئینی تحریک

نشاۃ ثانیہ کے دور میں مغربی دنیا میں ایک فکری انقلاب آیا جس نے ریاست اور مذہب کے تعلقات میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ انسانی فکر میں نیا جذبہ پیدا ہوا اور مذہب کی تقدیس کے ساتھ ساتھ عقل اور سائنس کو بھی اہمیت دی جانے لگی۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں ریاست اور مذہب کے علیحدہ ہونے کے تصورات ابھرے، اور اس نے مغربی آئین سازی میں مذہب کی جگہ کو چیلنج کیا۔ چرچ کے اختیارات کو محدود کیا گیا اور ایک سیکولر آئینی نظام کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں دنیا بھر کے آئینوں میں ایک اہم ماڈل بن گیا۔

نشاۃ ثانیہ کا آغاز

نشاۃ ثانیہ کا آغاز 15ویں صدی کے آخر میں ہوا، جب یورپ میں علمی، فنی اور ثقافتی تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ اس دور کا آغاز خصوصاً اٹلی کے شہر فلورنس میں سے شروع ہوئی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہی چرچ کا سماجی، سیاسی اور ریاستی امور میں اثر کم ہونے لگا۔ اس دوران "مذہب سے علیحدگی" کے تصورات کی اہمیت بڑھ گئی، جس کی ایک اہم مثال "مارٹن لوتھر" کی تحریک ہے۔ 1517 میں لوتھر نے اپنے 95 نکات پیش کیے، جن میں چرچ کی اجارہ داری کو چیلنج کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ افراد کو اپنے مذہبی معاملات میں آزادانہ اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ لوتھر کی تحریک نے چرچ کے طاقتور اثرات کو محدود کرنے کی کوشش کی اور لوگوں کو مذہبی معاملات میں براہ راست خدا کے ساتھ تعلق رکھنے کا شعور دیا۔ اس طرح، ریاستی حکام نے اپنے اختیارات کو مذہبی اداروں سے آزاد کرنے کی کوشش کی، جس نے مغربی ممالک میں آئین سازی کے عمل کو ایک نیا رخ دیا۔ اس کا ایک بڑا اثر انیسویں اور بیسویں صدی میں ہونے والی آئینی اصلاحات پر پڑا۔ سیکولر دساتیر میں مذہب کو ریاستی معاملات سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس کی جگہ شہری آزادی، مساوات، اور جمہوری اقدار کو اہمیت دی گئی۔

فرانس کی انقلابی تحریک اور سیکولر آئین

فرانس کا انقلاب (1789) ایک اہم موڑ ثابت ہوا، جہاں ریاست اور مذہب کی علیحدگی کو عملی طور پر نافذ کیا گیا۔ فرانس کا جدید "آئین 1791" منظور کیا گیا، جس میں ریاستی معاملات سے چرچ کو علیحدہ

کر دیا گیا تھا۔ اس آئین میں مذہب کو ذاتی معاملہ قرار دیا گیا اور ریاست کا کوئی مذہب نہیں تھا، جس سے فرانس میں سیکولر آئین سازی کا آغاز ہوا۔ 1790 میں "کلیسیائی آئین (Civil Constitution of the Clergy)" کو منظور کیا گیا جس کے تحت چرچ کے تمام روحانی افعال کو ریاستی سطح پر قابو کیا گیا۔ اس انقلاب نے صرف فرانس کی تقدیر بدلی بلکہ دنیا بھر کے آئینی ماڈلز اور ریاستی نظاموں پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس دور میں، فرانس میں مذہب اور ریاست کے تعلقات میں جو تبدیلی آئی، وہ بعد کے تمام سیکولر آئینی ماڈلز کی بنیاد بن گئی۔ اس آئین کے تحت، فرانس میں مذہب کا کوئی سرکاری کردار نہیں تھا اور چرچ کی ریاستی معاملات میں مداخلت کو روک دیا گیا۔ اس آئین میں شہریوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دی گئی، مگر حکومت اور ریاست کو مذہبی معاملات میں مداخلت سے آزاد رکھا گیا۔ اسے آئینی سیکولرازم کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ اس میں حکومتی عملداری کو صرف انسانی حقوق اور انصاف کی بنیاد پر استوار کیا گیا، نہ کہ مذہبی عقائد یا چرچ کی ہدایات پر۔

مغربی دساتیر میں سیکولر تشریحات

نشاۃ ثانیہ اور فرانس کے انقلاب کے اثرات نے مغربی دساتیر میں سیکولر تشریحات کو تقویت دی۔ 18ویں اور 19ویں صدی کے دوران آئینی اصلاحات میں مذہب کے بجائے انسانی حقوق، آزادی، اور مساوات کو مرکزی اہمیت دی گئی۔ امریکہ کا آئین (1787) بھی اس کی ایک اہم مثال ہے۔ ''آئین امریکہ'' میں کہا گیا کہ حکومت کسی بھی مذہب کی تائید نہیں کرے گی اور عوام کو مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو گی۔

سیکولر دستوری ماڈلز کا عالمی پھیلاؤ

نشاۃ ثانیہ اور اس کے بعد کی سیکولر تحریک نے مغربی دنیا کے دستوری ماڈلز کو عالمی سطح پر متاثر کیا۔ بہت سے ممالک نے اپنے آئین میں مذہب اور ریاست کو علیحدہ کرنے کے اصولوں کو اپنایا۔ مثال کے طور پر، ہندوستان میں شروع سے ہی آئین کی رو سے مذہب کا ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں اور ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح ترکی نے 1923 میں اپنے آئین میں مذہب کو ریاستی امور سے علیحدہ کر لیا اور اسے سیکولر آئینی ماڈل میں ڈھالا۔ اس کے علاوہ، لاطینی

امریکہ میں کئی ممالک نے بھی فرانس کی انقلاب سے متاثر ہو کر اپنے آئینوں میں سیکولر اصول اپنائے اور مذہب کو ریاستی معاملات سے الگ کیا۔ان میں میکسیکو،ارجنٹینا اور چلی جیسے ممالک شامل تھے۔

خلاصہ یہ کہ نشاۃ ثانیہ اور سیکولر آئینی تحریک نے مغربی ممالک میں سیکولر ریاستی ماڈلز کی بنیاد رکھی اور دنیا بھر میں آئینی اصلاحات کو ایک نیا رخ دیا۔

معاصر نسل پرستانہ نظریات اور آئینی چیلنج

پچھلی دو دہائیوں سے،یورپی ممالک میں سفید فام بالادستی اور انتہا پسندی کے نظریات نے آئینی اور قانونی ڈھانچوں کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر کیا ہے۔اگرچہ یورپ میں زیادہ تر ممالک نے انسانی حقوق، مساوات اور عدل و انصاف کو اپنی آئینی بنیادوں میں شامل کیا ہے، لیکن سفید فام بالادستی اور نسل پرستانہ نظریات کے حامل افراد ان اصولوں کے خلاف سر گرم رہتے ہیں اور معاشرے میں تقسیم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سفید فام بالادستی کی تحریکیں اکثر یورپ میں اپنی نسل کو برتر سمجھتی ہیں اور دیگر نسلوں یا اقوام کو کمتر گردانتی ہیں۔اس قسم کی انتہا پسندی نے تاریخی طور پر کچھ ممالک میں دستوری اصولوں اور قوانین کو متاثر کیا اور بعض خطوں میں نسلی بنیادوں پر امتیاز کی پالیسیوں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

قوم پرستی اور نسلی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل

یورپ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران قوم پرستی کے ابھرنے سے سفید فام بالادستی کے خیالات نے زور پکڑا۔کئی ممالک میں آئینی ڈھانچے ایسے بنائے گئے جس میں قومی تشخص کو فوقیت دی گئی،اور یہ قوم پرستی کی سوچ بعض اوقات دیگر نسلوں اور قومیتوں کے خلاف امتیازی رویوں کا باعث بنی۔مثال کے طور پر، نازی جرمنی میں ہٹلر کی قیادت میں آئین اور دیگر قانونی ڈھانچوں میں ایسی ترامیم کی گئیں جس سے جرمن نسلی برتری کو آئینی جواز ملا۔یہ آئینی تبدیلیاں یہودیوں اور دیگر اقلیتوں کے خلاف قانونی بنیاد پر امتیاز اور ظلم کا سبب بنیں۔

امیگریشن قوانین میں سختی

سفید فام بالادستی کے حامی ممالک میں اب امیگریشن قوانین میں سختی دیکھنے میں آئی ہے۔ان ممالک نے اپنے آئینی ڈھانچے اور قوانین میں تبدیلیاں کر کے تارکین وطن کے حقوق کو محدود کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یورپ کے کئی ممالک میں تارکین وطن، خاص طور پر مسلم ممالک سے آنے والے افراد کے خلاف قوانین میں سختی لائی گئی۔فرانس میں 2000 کے بعد سے کئی ایسی قانونی اصلاحات دیکھنے میں آئیں جن کا مقصد تارکین وطن کی آمد کو کنٹرول کرنا تھا۔اگرچہ بظاہر یہ قوانین سیکیورٹی اور معاشی مقاصد کے لئے بنائے گئے تھے، لیکن سفید فام بالادستی کے حامی حلقے ان قوانین کو اپنی برتری کے نظریے کو فروغ دینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آزادی اظہار پر پابندیاں اور نسلی منافرت

کچھ ممالک میں انتہا پسند گروہوں نے آزادی اظہار کی آڑ میں نسلی منافرت اور امتیاز کو فروغ دینے کی کوشش کی۔اس کا اثر آئین اور قانونی ڈھانچوں پر بھی پڑا، اور مختلف ممالک میں نسلی بنیاد پر تشدد یا نفرت انگیز تقاریر پر دستوری سطح پہ پابندیاں عائد کی گئیں۔اس کا مقصد مختلف مذاہب اور قومیتوں کے حقوق کا تحفظ تھا، لیکن سفید فام بالادستی کے نظریات رکھنے والے افراد ان پابندیوں کے مخالف ہیں اور انہیں آزادی اظہار پر قدغن سمجھتے ہیں۔مثال کے طور پر، برطانیہ میں نسلی منافرت سے متعلق قوانین کو 1965 میں متعارف کرایا گیا تھا۔ان قوانین کا مقصد یہ تھا کہ نسلی منافرت کے خلاف قانونی تحفظ فراہم کیا جا سکے، لیکن سفید فام بالادستی کے حامی حلقے ان قوانین کو اپنے نظریات کے خلاف سمجھتے ہیں۔

انتہا پسندی اور آئینی استحکام

موجودہ دور میں مذہبی انتہا پسندی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے نہ صرف مسلم دنیا، بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں سیاسی اور آئینی استحکام کو چیلنج کیا ہے۔ مغربی ممالک میں بھی، جہاں آئینی اصولوں کی بنیاد سیکولر اور جمہوری نظریات پر رکھی گئی ہے، مذہبی انتہا پسندی نے وہاں بھی آئینی ڈھانچوں کی جڑوں کو ہلا دیا ہے۔شدت پسند مذہبی نظریات اور گروہوں نے ان ممالک کے آئینی نظام کو نہ صرف آزمائش

میں ڈالا ہے بلکہ اس نے حکومتی اداروں اور ریاستی پالیسیوں پر بھی اثر ڈالا ہے۔ان کے آئین میں امتیاز اور اقلیتوں کو دبانے پر پابندی عائد ہے، لیکن عملی سطح پر سیاست میں بھی بڑے پیمانے پر اس آئینی تقاضے کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

آئینی استحکام کے لیے قوانین کا کردار

مذہبی انتہا پسندی کی بڑھتی ہوئی لہر نے مغربی ممالک کو اپنی آئینی دفعات کی از سر نو تشریح کرنے پر مجبور کیا۔ان ممالک میں آئین کا بنیادی مقصد فرد کی آزادی، انسانی حقوق اور عوامی امن کا تحفظ کرنا ہے۔اسی لیے اب پچھلے چند برسوں سے آئین میں ایسے قوانین شامل کیے گئے ہیں جو شدت پسند گروپوں کی سرگرمیوں کو محدود کرتے ہیں، اور کسی بھی گروہ کو تشدد یا دہشت گردی کے ذریعے اپنے عقائد کو دوسروں پر مسلط کرنے سے روکتے ہیں۔

مذہبی انتہا پسندی کی روک تھام کے لیے بعض مغربی ممالک نے اپنے آئینی قوانین میں تبدیلیاں کی ہیں، جن میں مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ عوامی مفاد کی حفاظت کے لیے مخصوص حدود متعین کی گئی ہیں۔مثال کے طور پر، بلجیم اور جرمنی میں مسلمانوں کے مذہبی گروہوں کو سرکاری نگرانی میں رکھنے کی پالیسی اپنائی گئی ہے تاکہ ان گروہوں میں شدت پسندی کے امکانات کو کم کیا جاسکے۔یہ تمام اقدامات آئینی سطح پر کیے گئے ہیں۔

مذہب وریاست کے مابین تعلق کا تحقیقی مطالعہ

جوناتھن فاکس

جوناتھن فاکس (Jonathan Fox) اسرائیل کی ایک یونیورسٹی میں شعبہ 'مذہب وسیاسیات' کے پروفیسر ہیں۔ وہ 90 کی دہائی سے بین الاقوامی سطح پر ایسے تحقیقاتی منصوبوں کے ساتھ منسلک ہیں جن میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دنیا بھر کے ممالک میں مذہب کا اثر ورسوخ کتنا ہے، اس کی شرح کیا ہے، ان خطوں میں مذہبی اثرات کی نوعیت اور اس کا پس منظر کیا ہے، اور مذہب وریاست کے تعلق میں مضبوطی آرہی ہے یا اس میں کمی واقع ہورہی ہے۔ اسی طرح ریاستوں اور معاشروں کے اندر مذہب کا دیگر عناصر کے ساتھ کیا ربط ہے، جیسے ان کی ایک تحقیق اس پر بھی ہے کہ دنیا میں مذہب اور نسل پرستی کے عنصر کا باہمی تعلق کیا ہے اور خطوں کے اعتبار سے اس کی نوعیت کیا ہے۔ مذہب اور مذہبی اثرات وعوامل کے ساتھ جڑے مسائل اور پہلوؤں پر جوناتھن فاکس کی زیر سرپرستی بہت سے دلچسپ موضوعات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مزید چند موضوعات یہ ہیں:

- سیکولرازم اور مذہب کے مابین مسابقت، 1990 سے 2014 تک کی ریاستی پالیسیوں کا عالمی تحقیقاتی سروے۔
- بین الاقوامی تعلقات کے نظریات میں مذہب کا تصور اور اثر ورسوخ۔
- مذہب اور جمہوریت: ایک بین الاقوامی تقابلی مطالعہ۔
- روس یوکرین تنازعہ میں مذہب کا کردار اور حیثیت۔
- اقوام خدائی حکم کے ماتحت: گرجا گھر کیسے اپنی اخلاقی اتھارٹی کو استعمال کرتے ہوئے ریاستی

پالیسیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

- عرب بہار کے بعد حکومتوں کی تبدیلی اور مذہبی امتیاز۔
- مذہبی آزادی کے فروغ سے دہشت گردی کا مقابلہ۔

زیر نظر سروے جس پر ہم بات کر رہے ہیں اس کا عنوان ہے 'مذہب اور ریاست سے متعلق ایک عالمی سروے (A world survey of religion and the state)'اس مطالعہ میں بہ ظاہر کچھ سادہ س اور آسان سوالات کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے حکومتوں کا مذہب سے متعلق رویہ کیا ہے، اس میں ان کے کردار اور فعالیت کی نوعیت کیا ہے، کیا اس کردار اور فعالیت کی حدود و شرح میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے، کونسے سماجی وسیاسی عوامل ہیں جو ان امور میں اہم سمجھے جاتے ہیں، کیا بعض مذاہب کے لیے ترجیحی رویہ اختیار کیا جاتا ہے، کیا ریاست کا کوئی سرکاری مذہب ہے، کیا اقلیتوں کے خلاف مذہبی امتیاز برتا جاتا ہے؟ وغیرہ۔ اس سروے میں 175 ممالک کو شامل کیا گیا ہے۔ اور اس تحقیقاتی مطالعے کا دورانیہ 1990 سے 2002 تک کا ہے۔

مطالعے میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح بہ ظاہر ان سوالات کے جوابات بہت سادہ ہو سکتے ہیں، لیکن حقیقیت میں یہ ایک پیچیدہ عمل ہے اور ہر ملک و معاشرے کے اعتبار سے عوامل واسباب اور اثرات کا ایک الگ ڈھانچہ ہے۔ مذہب، ریاست اور معاشرے کے درمیان تعلق پیچیدہ ہے اور پوری طرح سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سروے کا عمومی مقصد 1990 اور 2014 کے درمیان سالانہ بنیادوں پر 175 ریاستوں کے تناظر میں مذہب اور ریاست کے تعلق سے جڑے متعدد پہلوؤں پر تفصیلی توضیحات فراہم کرنا ہے۔

سروے کے اندر بنیادی طور پہ خطوں کی تقسیم کی گئی ہے، پھر اس میں ممالک اعتبار سے امور کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سروے میں ایک تقسیم سابق سوویت بلاک کی شامل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کیمونسٹ مرحلے کے دوران اس بلاک میں مذہب کی اہمیت کو سختی سے کم کیا گیا تھا اور اس کے لیے باقاعدہ ریاستی وفکری سطح پر اقدامات کیے گئے تھے۔ البتہ سرد جنگ کے اختتام کے بعد اس بلاک میں مذہب کی واپسی ہوئی ہے، لیکن اس میں یہ یقینی بنایا گیا ہے مذہبی حیثیت، اثرات اور اس کی حدود پر

ریاست کا کنٹرول باقی رہے۔لہذا ان ممالک میں مذہبی کردار کا دائرہ ریاستی مفادات اور اس کی پالیسیوں کے ماتحت تشکیل پایا ہے۔

براعظم ایشیا میں مذہب کا تنوع دیگر خطوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ایسے ریاستی کردار کے حوالے سے بھی تنوع ملتا ہے۔اس خطے میں ممالک کے اندر کسی نہ کسی ایک مذہب کے لیے بہت زیادہ حمایت پائی جاتی ہے۔اگرچہ چند ممالک ایسے بھی ہیں جہاں ریاست تمام مذاہب کے خلاف ہے۔البتہ خطے کے تمام ممالک میں ایک چیز مشترک ہے کہ اس کی ریاستیں نمایاں طور پہ مذہبی امور میں بہت زیادہ مداخلت کرتی ہیں۔28 ممالک میں سے 9 کا سرکاری مذہب ہے،دس ممالک مذہب کی طرف میلان اور اس کے لیے حمایت رکھتے ہیں،پانچ ایسے ہیں جو مذہب اور مذہبی جکڑبندی کا شکار ہیں،جبکہ چار ممالک میں ریاست اور مذہب کی علیحدگی کو قائم رکھا گیا ہے۔

مشرق وسطی اور شمالی افریقا ایسے خطے ہیں جہاں ریاست اور مذہب کے مابین تعلق سب سے زیادہ اور گہرا ہے۔اگرچہ ان ممالک میں کئی چیزوں پر اشتراک ہے لیکن حکومتوں کی مذہبی مداخلت کی نوعیت میں فرق بھی پایا جاتا ہے۔اس خطے میں اسلام نمایاں مذہب ہے۔مشرق وسطی کی بیس ریاستوں میں سے اٹھارہ میں مسلمان حکمران ہیں۔اسرائیل میں یہودی حکومت ہوتی ہے لیکن وہاں مسلمانوں کی آبادی بھی ہے اور وہاں پارلیمان میں منتخب بھی ہوتے ہیں۔جبکہ لبنان میں مسیحی اور مسلمان دونوں کی مشترک حکومت ہوتی ہے۔اس خطے میں تین ممالک ایسے ہیں جو آئین میں سرکاری مذہب کا دعوی کرتے ہیں۔

صحرائے اعظم افریقا کے جنوب میں واقع خطے (Sub-Saharan Africa) میں مذہب کے اعتبار سے کافی تنوع ہے۔اس خطے میں کوئی بھی ایسا ملک نہیں جو مذہب وریاست کے مابین علیحدگی کا قائل ہو۔اوراس کے باوجود بہت کم ایسی ریاستیں ہیں جہاں ریاست کی مذہبی امور میں مداخلت زیادہ ہو۔اس میں بیس ریاستیں ایسی ہیں جو کسی ایک مذہب پر زور نہیں دیتیں اور نہ سرکاری طور پہ مذہبی حدود پر زور دیا جاتا ہے۔اکیس ممالک ایسے ہیں جو کسی ایک مذہب پر زور دیتے مذہبی حدود کا تعین کرتے ہیں۔اس خطے کے پانچ ممالک ایسے ہیں جہاں کسی نہ کسی ایک مذہب کو غیر قانونی قرار دیا

گیا ہے۔

لاطینی امریکا میں زیادہ تر لوگ کیتھولک مسیحی ہیں اور غیر کیتھولک ہیں وہ بھی بہر حال مسیحیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً کیتھولک مسیحی ریاستیں مسیحیت کے لیے ترجیحی پالیسی رکھتی ہیں۔ کیتھولک ریاستوں کا سرکاری مذہب مسیحیت ہے۔ ایسے ممالک جہاں کیتھولک آبادی زیادہ ہے ان میں چار ممالک برازیل، میکسیکو، یوراگوئے اور ایکواڈور ایسے ملک ہیں جہاں کیتھولک چرچ کے لیے ترجیحی رویہ اختیار نہیں کیا جاتا ہے۔ غیر کیتھولک مسیحی ریاستوں میں صرف جمیکا ایسا ملک ہیں جہاں مسیحیت کے لیے ترجیحی پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ سلوک کے معاملے میں لاطینی امریکا مکمل طور پر تو نہیں البتہ نسبتاً ایک روادار خطہ سمجھا جاتا ہے۔

یورپ میں مسیحیت سب سے بڑی آبادی والا مذہب ہے۔ یورپ کی 72 فیصد آبادی مسیحی ہے، اس میں کیتھولک آبادی کا تناسب 48 فیصد ہے۔ عموماً وہاں مذہب اور ریاست کے مابین علیحدگی کی حمایت کی جاتی ہے۔ لیکن یورپ میں مذہب کے ساتھ ایک خاص طرح کا ریاستی ربط بھی موجود ہے، جیسا کہ انگلینڈ، فن لینڈ، ڈنمارک اور یونان میں۔ جبکہ فرانس اور نیدرلینڈ ایسے ملک ہیں جہاں مذہب و ریاست کے مابین علیحدگی کا تصور بہت سخت ہے۔

(تفصیل کے لیے جوناتھن فاکس کی کتاب A World Survey of Religion and the State ملاحظہ فرمائیں)

معاصر دساتیر اور مذہب

دنیا کی غیر مسلم ریاستوں کے آئین زیادہ تر سیکولر ہیں اور مغربی ریاستوں میں آئین میں مذہب کے لیے مخصوص کردہ کردار کا تعین ان ممالک کے تاریخی، ثقافتی، اور سیاسی پس منظر کے مطابق ہوتا ہے۔ ان ملکوں میں آئین اور مذہب کے تعلق کو سمجھنے کے لیے، ان دساتیر کی اس طرح تقسیم کی جاسکتی ہے:

مکمل سیکولر دساتیر

ان ممالک میں آئین میں مذہب اور ریاست کو مکمل طور پر الگ رکھا گیا ہے، اور یہ ریاستیں اپنے آئین میں مذہب کی کسی بھی قسم کی مداخلت کو مکمل طور پر مسترد کرتی ہیں۔ ان ممالک میں عوامی زندگی میں مذہب کا دخل کم سے کم ہوتا ہے، اور مذہبی آزادی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ دنیا کے وہ ممالک جن کے دساتیر کو مکمل طور پہ سیکولر سمجھا جاتا ہے ان میں میں چند اہم نام یہ ہیں:

- **فرانس:** فرانس کا آئین مکمل طور پر سیکولر ہے اور یہاں مذہب کو ریاستی امور سے الگ رکھا گیا ہے، جسے "لاسیکول (Laïcité) "کہا جاتا ہے۔
- **امریکا:** امریکا کا آئین بھی مذہب اور ریاست کو مکمل طور پہ الگ رکھتا ہے، اور اس میں مذہب کے اثرات کو آئین میں شامل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- **کینیڈا:** کینیڈا کا آئین بھی سیکولر ہے، یہاں مذہب کے لیے ریاستی معاملات میں کوئی جگہ نہیں ہے۔
- **جنوبی کوریا:** ملک کا آئین بالکلیہ سیکولر ہے۔ البتہ مسیحیت اور بدھ مت کو بڑے مذہبوں کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم، یہ دونوں مذاہب ریاستی معاملات میں اثرانداز ہونے کی بجائے، ایک ثقافتی حیثیت رکھتے ہیں اور ملک کے آئینی معاملات میں ان کا کوئی خاص اثر نہیں

ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ سرکاری سطح پر مذہب کی بناپر کوئی خاص پالیسی نہیں اپنائی جاتی۔

- **چین** :چین دنیا کے سب سے بڑے کمیونسٹ ممالک میں سے ایک ہے اور یہاں کا آئین مخصوص ریاستی سیکولرازم کاپرچارک ہے۔چین میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔
- **جاپان**: جاپان کا آئین بھی ایک مکمل سیکولر آئین ہے۔البتہ اس کے آرٹیکل 20 میں مذہب کی آزادی کی ضمانت بھی دی گئی ہے۔ جاپان میں ریاست نے مذہب کو ایک نجی معاملہ قرار دیتے ہوئے آئین میں کسی مذہبی گروہ کو ترجیح نہیں دی۔ وہاں مذہب اور ریاست کے تعلقات میں مکمل علیحدگی کی کوشش کی گئی ہے۔
- **آسٹریلیا**: آسٹریلیاکا آئین مذہب اور ریاست کے درمیان مکمل علیحدگی کی حمایت کرتا ہے۔
- **نیوزی لینڈ**: نیوزی لینڈ کا آئین بھی سیکولر ہے اور یہاں مذہب ریاستی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔
- **بیلجیم**: بیلجیم کا آئین بھی مکمل طور پر سیکولر ہے،اور یہاں مذہب کا کوئی سرکاری کردار نہیں ہے۔
- **سوئٹزرلینڈ**: سوئٹزرلینڈ کا آئین بھی سیکولر ہے اور یہاں مذہب کا ریاستی امور میں کوئی خاص اثر نہیں ہے۔

مذہب کی جزوی شناخت کے حامل دساتیر

- **بھارت**: بھارت کا آئین سیکولر ہے،اور یہاں مذہب کا آئینی مقام محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر ملک میں ہندوتوا کے اثرات نے آئینی ڈھانچے میں عملی سطح پر پیچیدگی پیدا کی ہے۔ہندوتوا(ہندو قوم پرستی) کے اثرات بعض اوقات ریاستی معاملات میں نظر آتے ہیں۔ بھارت میں مذہب کی آزادی کے باوجود، سیاسی جماعتوں کے درمیان مذہب کے حوالے سے تنازعات اور فرقہ وارانہ سیاست نمایاں ہیں، جو آئین میں موجود مذہبی آزادی کے اصولوں کے باوجود ایک چیلنج کے طور پر موجود ہیں۔
- **اسرائیل**: اسرائیل کا آئین مکمل سیکولر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک "یہودی ریاست" کے طور پر

مذہبی شناخت رکھتا ہے۔

- **پولینڈ** :پولینڈ میں کیتھولک چرچ کا گہرا اثر ہے، اور پولش آئین میں مذہب کو ایک اہم حیثیت دی گئی ہے۔ پولینڈ میں شادی اور طلاق کے قوانین میں کیتھولک عقائد کا اثر موجود ہے،اور یہاں کے عوامی اداروں میں بھی مذہبی تعلیمات کا پرچار کیا جاتا ہے۔
- **پرتگال**: پرتگال کا آئین مذہب اور ریاست کے درمیان علیحدگی کو تسلیم کرتا ہے، مگر عیسائی عقائد کا اثر ملک بھی اس میں موجود ہے۔
- **تھائی لینڈ**: تھائی لینڈ کا آئین ایک سیکولر آئین ہے، مگر اس کا آئین بدھ مت کو ریاست کا غالب مذہب تسلیم کرتا ہے، تاہم آئین میں تمام دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو بھی اپنی عبادات کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔اس کے باوجود، بدھ مت کا ریاستی معاملات میں ایک خاص اثر ہے، جیسے کہ سرکاری تقاریب میں بدھ مت کے عقائد کی نمائش ہوتی ہے۔
- **اٹلی**: اٹلی کا آئین سیکولر ہے لیکن کیتھولک چرچ کا اثر ابھی بھی ملک کے دستوری، معاشرتی اور سیاسی معاملات پر موجود ہے۔
- **یونان**: یونان کا آئین سیکولر ہے، مگر یونانی آرتھوڈوکس چرچ کا اثر ملک میں اہم ہے۔
- **آئرلینڈ**: آئرلینڈ کا آئین مذہب کے اثرات کو جزوی طور پر تسلیم کرتا ہے،اور کیتھولک عقیدہ ملک میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔
- **بیلاروس**: بیلاروس کا آئین بھی بنیادی طور پر سیکولر ہے، لیکن مذہب کے ثقافتی اثرات اس میں موجود ہیں۔
- **ڈنمارک**: ڈنمارک کا آئین ایک سیکولر آئین ہے، مگر وہاں کے آئینی ڈھانچے میں لوتھرن چرچ کو ریاست کے سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

مسلم دُنیا میں دساتیر:
تاریخی، ثقافتی اور قومیتی پہلو

مسلم دُنیا میں دستور سازی کا آغاز

19ویں صدی کے دوران مسلم دنیا میں مغربی استعمار کا اثر بڑھا۔ یورپی طاقتوں کی جانب سے مسلم ریاستوں کی زمینوں پر قبضے اور سیاسی، اقتصادی اثر ورسوخ نے مسلم حکمرانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ان کے سیاسی ڈھانچوں کو جدید ضروریات کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم دنیا میں جدید ریاستی ڈھانچے اور آئینی دستاویزات کی ضرورت کا احساس بڑھا۔ یہ بیداری صرف اشرافیہ تک محدود نہیں تھی بلکہ عوام میں بھی اس کی گونج سنائی دی۔ ان مسلم ممالک نے مغربی جمہوریت کی بنیادوں پر اپنے آئین کی تشکیل کی، ساتھ ساتھ اسلامی اقدار اور روایات کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

ابتدا میں مغربی خیالات اور آئینی حکومت کے نظام پر بعض مذہبی حلقوں کا ردعمل منفی تھا۔ بعض علماء نے مغربی اصولوں اور سیاسی خیالات کو اسلام سے متصادم سمجھا اور انہیں اسلامی اقدار کے خلاف قرار دیا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ "شوریٰ (consultation) "اور "بیعت (pledge of allegiance) " جیسے روایتی اصولوں کو ترک کرنا غیر اسلامی ہے۔ ان کے مطابق، اسلامی ریاست کا اصل قانون شریعت ہے، اور اس میں کسی قسم کی تخفیف یا اس کے مقابلے میں دوسرے قوانین کا نفاذ نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پہ وہ آئینی اصلاحات کی حمایت اس صورت میں کرتے تھے جب ان میں شریعت کی بالادستی اور اسلامی قوانین کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔ تاہم، علماء کے دوسرے طبقے نے اس بات کو تسلیم کیا کہ جدید معاشی اور سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حکومتوں کو بعض اصلاحات کرنا ضروری ہیں، اور آئین کی موجودگی میں ان اصلاحات کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

آئین کی تشکیل میں ہر ملک نے اپنے مخصوص چیلنجز اور حالات کے مطابق قدم اٹھایا۔ یہاں ہم مسلم دنیا کے پہلے ایسے چند ممالک کا جائزہ لیں گے جنہوں نے دستور وضع کیا۔ مسلم دنیا میں آئینی اصلاحات کی تحریک کا آغاز مختلف ممالک میں مختلف انداز میں ہوا، تاہم عثمانی سلطنت اور تیونس کی

مثالیں اس تحریک کا نقطہ آغاز تھیں۔

عثمانی سلطنت اور تیونس میں آئینی اصلاحات کی تحریکوں کا ایک بڑا محرک عوامی بیداری تھی۔ مغربی تعلیم، پریس، اور تجارتی تعلقات نے مسلم عوام کو آئینی اصلاحات کی اہمیت کے بارے میں آگاہ کیا۔ ان اصلاحات کا مقصد صرف حکومتی ڈھانچے کی تبدیلی نہیں تھا، بلکہ عوامی حقوق کے تحفظ، حکومت کے اختیارات کی تقسیم، اور شفافیت کو یقینی بنانا تھا۔

تیونس–1861

تیونس میں 1861 میں مسلم دنیا کا پہلا آئین متعارف کرایا گیا تھا جو اصل میں مغربی دنیا سے متاثر ہو کر بنایا گیا تھا۔ اُس وقت تیونس کے حکمران احمد باشا نے اس کی تشکیل کا اعلان کیا تھا، جسے (Code of Fundamental Laws) کہا گیا۔

اس آئین کا مقصد ملک کے حکومتی ڈھانچے کو جدید بنانا تھا اور سلطنت کی قدیم بادشاہت کو آئینی شکل میں ڈھالنا تھا۔ اس آئین میں شریعت کو بھی اہمیت دی گئی تھی۔ آئین میں حکومت کی شکل، اختیارات کا تقسیم اور شہری حقوق کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس میں ایک آئینی پارلیمنٹ کی تشکیل کی تجویز بھی دی گئی تھی، جسے عوام کی نمائندگی ملنی تھی۔ تاہم، اس آئین کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ اسلامی شریعت کے اصولوں کو مکمل طور پر نظرانداز نہ کیا جائے اور انہیں حکومت کی بنیاد بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس دستور کی تشکیل کے بعد بھی تیونس میں مختلف سیاسی اور سماجی گروپوں کے درمیان اس بات پر اختلافات قائم رہے کہ آیا یہ آئین اسلامی شریعت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ تیونس میں اُس وقت آئین میں ذکر کردہ مغربی جمہوریت کے اصولوں کا عملی طور پر نفاذ کرنا بھی چیلنج تھا، کیونکہ تیونس میں عوامی سیاسی شعور اور جمہوری اداروں کا فقدان تھا۔ جمہوری اداروں کے قیام کے لیے عوامی حمایت حاصل کرنا ایک مشکل امر تھا، اور ملک کے اندرونی معاملات میں اصلاحات کے لیے اچھی خاصی مزاحمت موجود تھی جس کا فائدہ بادشاہت کو ہوا۔ اس کے علاوہ، حکومتی ڈھانچوں میں عملی تبدیلی کے لیے طاقتور طبقات کی رضامندی کی بھی ضرورت تھی، جس میں فوج اور جاگیردار طبقہ شامل تھا، جنہوں نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

تیونس کے 1861 کے آئین میں پانچ اہم ترین شقیں درج ذیل تھیں:

(1) بادشاہت کے محدود اختیارات

اس آئین کے ذریعے بادشاہ کے اختیارات کو محدود کیا گیا، جس سے دستوری بادشاہت (Constitutional Monarchy) سامنے آئی۔ بادشاہ کے فیصلے حکومتی اداروں اور آئینی اصولوں کے تابع کر دیے گئے، اور حکومتی امور میں بادشاہ کو مکمل آزادی حاصل نہیں تھی۔

(۲) وزارت عظمیٰ اور کابینہ کی تشکیل

آئین کے تحت وزیرِ اعظم کا عہدہ وضع کیا گیا، جس کی ذمہ داری حکومتی معاملات کی نگرانی تھی۔ کابینہ اور دیگر وزراء کو بھی آئینی حیثیت دی گئی، جس سے حکومتی ڈھانچے میں ایک منظم طریقہ کار قائم ہوا۔

(۳) شریعت اور جدید قوانین کا امتزاج

آئین میں شریعت کے قوانین کو اہمیت دی گئی، اور تیونس کی قانونی روایات کو بھی برقرار رکھا گیا۔ لیکن یہ مکمل طور پر اسلامی قوانین پر مبنی نہیں تھا بلکہ اس میں مغربی قانونی اصولوں کا بھی امتزاج تھا۔

(۴) شہری حقوق اور انصاف کی فراہمی

آئین میں پہلی بار شہریوں کے حقوق اور انصاف کی فراہمی کی یقین دہانی کرائی گئی۔ اس میں خاص طور پر جائداد کے حقوق، عدلیہ کا معیار، اور عوامی معاملات میں شفافیت کو اہمیت دی گئی، جس سے تیونس میں انصاف کے نظام کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔

(۵) مشاورتی اسمبلی کا قیام

آئین کے مطابق ایک مشاورتی اسمبلی (Consultative Assembly) یا پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا، جس کے اراکین کو ملک کی نمائندگی کی ذمہ داری دی گئی۔ اس اسمبلی کا مقصد عوامی مفادات کو حکومتی پالیسیوں میں شامل کرنا اور قوانین کی تشکیل میں عوامی نمائندوں کی شمولیت کو یقینی بنانا تھا۔

عثمانی سلطنت (ترکی)۔1876

عثمانی سلطنت کا پہلا آئین 1876 میں نافذ کیا گیا تھا۔ یہ آئین سلطنت کی پہلی تحریری قانونی دستاویز تھی، جو مشروط بادشاہت کے اصولوں پر مبنی تھی۔ سلطان عبدالحمید دوم کے عہد میں یہ آئین متعارف کرایا گیا، جس کا مقصد سلطنت عثمانیہ کو جدید بنانا تھا۔ اس آئین میں سلطان کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا تھا۔ بعد میں 1908 میں آئینی انقلاب کے دوران اس دستور کو مزید مؤثر بنایا گیا۔ عثمانی سلطنت میں اسلامی شریعت اور مغربی جمہوری اصولوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ایک بڑا چیلنج تھا۔ اس آئین نے سلطنت میں ایک قانونی نظام متعارف کرایا تھا، لیکن مغربی ماڈل کو اپنانے کی وجہ سے بہت سے علما نے اسے غیر اسلامی قرار دیا۔ مغربی طاقتیں خاص طور پر برطانیہ اور فرانس عثمانی سلطنت میں اپنے اثرات بڑھانے کے لیے آئینی اصلاحات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتی تھیں، جس کی وجہ سے مقامی سطح پر بھی ایک تنازعہ پیدا ہوا۔

عثمانی عہد میں سب سے پہلے 1839 میں "تنظیمات (Tanzimat) "کی تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ تحریک عثمانی سلطنت کے حکمرانوں کی جانب سے آئینی اصلاحات کی ایک کوشش تھی، جس کا مقصد ریاستی اداروں میں اصلاحات اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم کرنا تھا۔ 1876 کا عثمانی آئین، جو 'بنیادی قانون' (قانونِ اساسی) کے نام سے جانا جاتا ہے، سلطنت کی پہلی تحریری قانونی دستاویز تھی اور اس کا مقصد سلطنت عثمانیہ میں جدید اصلاحات لانا تھا۔ اس آئین کے نفاذ کا بنیادی مقصد سلطنت کو داخلی طور پر مستحکم بنانا اور اسے مغربی جمہوریت کے اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا، تاہم اس میں اسلامی شریعت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ یہ آئین سلطنت کے مرکزی اداروں میں اصلاحات اور مشروط حکمرانی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

عثمانی سلطنت میں پہلے آئین کی ضرورت اس وقت شدت سے محسوس کی گئی جب سلطنت ایک طرف مغربی دنیا سے صنعتی اور علمی میدان میں پیچھے جا رہی تھی، اور دوسری طرف سلطنت کو اندرونی مسائل جیسے کہ بڑھتی ہوئی کرپشن، عسکری ناکامیاں، اور علیحدگی پسند تحریکوں کا سامنا تھا۔ اس پس منظر میں سلطان عبدالحمید دوم کی حکومت میں آئین بنانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس آئین کے

تحت ایک پارلیمنٹ کا قیام شامل تھا جس کے ذریعے عوامی نمائندگی کو یقینی بنایا گیا تھا۔ اس آئین نے سلطان کے اختیارات کو محدود کر دیا تھا۔ اس میں شریعت کے اصولوں کو نظرانداز کیے بغیر، ریاستی نظام میں جدید اصلاحات کی گئیں۔ آئین کے اندر سلطنت میں تمام افراد کے مساوی حقوق کی ضمانت دی گئی تھی، اور عوامی آزادی، اظہار کی آزادی، اور تنظیم بنانے کی آزادی جیسے بنیادی حقوق فراہم کیے گئے تھے۔

اس آئین کو کچھ علماء نے "غیر اسلامی" قرار دیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مغربی جمہوری ماڈل اسلامی اصولوں کے خلاف تھا۔ خاص طور پر، آئین میں بادشاہ کے اختیارات کو محدود کرنے کی کوشش ان کے مطابق بالکل صحیح نہیں تھی، کیونکہ یہ ان کے مطابق اسلامی شریعت کے تحت حکمرانی کے اصولوں کے خلاف عمل تھا۔ اسلامی حکمرانی میں "خلافت" یا "امارت" کا تصور ہے جو ایک مضبوط مرکزی قیادت کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔

اگرچہ یہ آئین 1876 میں نافذ کیا گیا تھا، لیکن اسے مکمل طور پر فعال نہ کیا جا سکا۔ اس کی ایک بڑی وجہ سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں میں اس کی حمایت نہ ہونا تھی، اور بادشاہ کی جانب سے اس آئین پر عمل نہ کرنا بھی ایک سبب تھا۔ اس لیے، 1908 میں "آئینی انقلاب (The Young Turk Revolution)" کے دوران، اس آئین کو فعال اور مؤثر بنا دیا گیا۔ یہ انقلاب ان ترک قوم پرستوں کی تحریک کا نتیجہ تھا جنہوں نے "جمعیت اتحاد و ترقی (Committee of Union and Progress)" کے زیر اہتمام عثمانی سلطنت میں جمہوری اصلاحات لانے کی کوشش کی تھی۔ 1908 کے انقلاب کے نتیجے میں، عثمانی پارلیمنٹ کا کردار مزید مضبوط ہوا، اور عوام کے حقوق کے تحفظ کی طرف ایک اہم قدم بڑھایا گیا۔ اس انقلاب کے بعد سلطنت عثمانیہ میں سیاسی اور سماجی تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔

عثمانی سلطنت کے اس آئین کی پانچ اہم ترین خصوصیات یہ تھیں:

(ا) سلطان کے اختیارات کی تحدید

اس آئین نے سلطان کے اختیارات کو محدود کیا۔ اس کے تحت ریاستی فیصلوں میں سلطان کے اختیارات کو آئینی اصولوں کے تابع کر دیا گیا۔

(۲)مذہبی اقلیتوں کے حقوق

آئین میں غیر مسلم اقلیتوں، جیسے مسیحیوں اور یہودیوں، کے حقوق کو تسلیم کیا گیا اور انہیں عثمانی سلطنت کے شہریوں کے مساوی حقوق دیے گئے۔اس شق کا مقصد سلطنت میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنا تھا،تاکہ سلطنت کے اندر اتحاد اور ہم آہنگی کو فروغ دیا جاسکے۔

(۳)آزادانہ پریس کا حق

آئین میں پہلی بار آزادیِ صحافت کو تسلیم کیا گیا، جس کے تحت سلطنت کے اندر اخبارات اور رسائل کو حکومتی نگرانی کے بغیر کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہ شق اس بات کا اظہار تھی کہ حکومت شہریوں کو معلومات تک رسائی کے حق کو تسلیم کرتی ہے اور حکومت کی پالیسیوں پر عوامی مباحثے کو فروغ دینا چاہتی ہے۔تاہم، بعد میں یہ آزادی مختلف وجوہات کی بنا پر محدود کی گئی۔

(۴)شورائیت اور پارلیمنٹ کا قیام

آئین میں پارلیمنٹ کے دو ایوانوں پر مشتمل ایک نظام کا قیام عمل میں لایا گیا : مجلسِ شوریٰ (Senate)اور مجلسِ نمائندگان (Chamber of Deputies)۔ مجلسِ نمائندگان کے اراکین کا انتخاب عوامی نمائندگی کی بنیاد پر ہونا تھا، جبکہ مجلسِ شوریٰ کے اراکین کا تقرر سلطان کرتا تھا۔

(۵)وزارتوں اور سرکاری اداروں کی تشکیل

آئین میں مختلف وزارتوں کا قیام اور ان کے اختیارات کی وضاحت کی گئی، جس کے تحت سلطنت کے مختلف انتظامی شعبوں کو منظم کیا گیا۔ یہ دفاتر، جیسے کہ وزارتِ عدلیہ، وزارتِ مالیات، اور وزارتِ خارجہ کا قیام۔

ایران۔1906

ایران میں پہلی آئینی تحریک 1906 میں شروع ہوئی، جس کے نتیجے میں ایران کا آئین 1906 میں منظور کیا گیا۔ یہ آئین "مجد الشریعت" کے اصولوں پر مبنی تھا اور اسے ملکی سیاست میں اسلامی کردار کا

مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اس آئینی تحریک کا اصل مقصد شاہی حکومت کی مطلق العنانیت کو محدود کرنا اور ایک آئینی بادشاہت قائم کرنا تھا۔ اس تحریک کا آغاز سماجی اور سیاسی اصلاحات کی ضرورت کی وجہ سے ہوا، کیونکہ عوام میں شاہی حکومت کے جابرانہ طریقوں کے خلاف نارضگی بڑھ رہی تھی۔ ایران میں شاہ کی حکومت کے خلاف عوامی مزاحمت پہلے سے موجود تھی، پھر اس میں علماء کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہو گئی۔ ایرانی عوام اور علماء نے مل کر آئینی تحریک شروع کی، جس کے نتیجے میں 1906 میں ایران کا آئین منظور کیا گیا۔ اس مرحلے میں شاہی حکومت اور علماء کے درمیان مسلسل تنازعہ رہا، جس میں بے پناہ ریاستی طاقت اور اسلامی اقدار کے تحفظ کے درمیان توازن قائم کرنا مشکل تھا۔ بعد میں 1979 کے اسلامی انقلاب کے دوران یہ آئین مکمل طور پر تبدیل کر دیا گیا۔ اس آئین کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اسلامی شریعت کو آئین کا حصہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ آئین میں یہ طے کیا گیا تھا کہ تمام قوانین اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں گے، اور شریعت کے مطابق عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے گا۔ آئین میں اسلامی عدالتوں کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا تھا۔ اگرچہ ایران کا آئین 1906 میں منظور کیا گیا تھا، لیکن اس کے نفاذ کے دوران کئی مشکلات پیش آئیں۔ آئین میں متعین اصولوں کو عملی طور پر نافذ کرنا آسان نہیں تھا۔ شاہی حکومت نے آئین کے تحت اپنی طاقت کو محدود کرنے کے لیے کوئی خاص اقدامات نہیں کیے۔ پھر 1979 میں اسلامی انقلاب کے دوران ایران میں ایک نیا آئینی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا، جس میں اسلامی جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس انقلاب نے شاہی حکومت کو ختم کیا اور ایران کو ایک اسلامی جمہوری ریاست میں تبدیل کر دیا۔

ایران کے 1906 کے آئین کی پانچ اہم ترین شقیں یہ تھیں:

(ا) قانون سازی میں مذہبی علماء کا کردار

آئین کی ایک اہم شق یہ تھی کہ قانون سازی میں اسلامی شریعت کا احترام کیا جائے گا، اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے علماء کو قومی مجلس کے قوانین کی منظوری میں کردار دیا گیا۔ اس کے تحت علماء کو مجلس کی قانون سازی کے جائزے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہونے کے بارے میں حتمی رائے دینے کا اختیار حاصل تھا۔

(۲) مجلس شورائے ملی کی خود مختاری

آئین میں مجلسِ شورائے ملی (قومی اسمبلی) کی خود مختاری کو یقینی بنایا گیا، جو اس وقت کے سیاسی نظام میں ایک نیا قدم تھا۔ مجلس کو مالیات، ٹیکس، اور حکومتی پالیسیوں پر فیصلہ سازی کا اختیار دیا گیا۔ اس سے ایرانی عوام کو پہلی بار حکومتی معاملات میں باقاعدہ نمائندگی ملی۔

(۳) قضاء کا نظام اور عدالتی اصلاحات

1906 کے آئین نے ایک عدالتی نظام متعارف کرایا جس میں اسلامی شریعت کی بنیاد پر قضاء کا نظام قائم کیا گیا۔ اس میں روایتی اسلامی عدلیہ کو برقرار رکھا گیا اور اس کے تحت قضا کے امور کو شریعت کی روشنی میں چلایا گیا۔ تاہم، آئین میں عدلیہ کی تنظیم کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔

(۴) مقامی حکومتوں کو اختیارات کی فراہمی

آئین میں مقامی حکومتوں کو اختیارات کی فراہمی پر بھی زور دیا گیا، جس کے تحت ایران کے مختلف علاقوں میں مقامی حکومتیں خود مختار طور پر انتظامی معاملات چلا سکتی تھیں۔ اس شق کا مقصد علاقائی مسائل کے حل کے لیے مقامی سطح پر فیصلہ سازی کو فروغ دینا تھا۔

(۵) وزراء کے احتساب کا اصول

آئین میں وزراء کے احتساب کا اصول شامل کیا گیا، جس کے تحت وزیر اعظم اور دیگر وزراء کو پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ بنایا گیا۔ اس سے حکومت کے مختلف شعبوں میں شفافیت اور احتساب کا نظام متعارف کرایا گیا، تاکہ وزراء کی کارکردگی پر نظر رکھی جا سکے اور وہ عوامی مفاد کے مطابق کام کریں۔

مصر۔1923

مصر کا آئین 1923 میں تیار کیا گیا، جس کے تحت ملک میں آئینی بادشاہت کا آغاز ہوا۔ یہ آئین مصر میں جمہوری نظام کے آغاز کا پیش خیمہ تھا، اور اس میں اسلامی اصولوں کو بھی اہمیت دی گئی تھی۔ اس آئین میں پہلی بار مصر میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے الگ الگ اختیارات کی وضاحت کی گئی۔ 1952

میں فوجی انقلاب کے بعد اس آئین کو منسوخ کر دیا گیا اور مصر میں آئینی اصلاحات کی ایک نئی لہر شروع ہوئی۔

1923 کے اس آئین میں ریاست کے تمام قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق ترتیب دینے کا عہد کیا گیا تھا، اور ساتھ ہی اسے مغربی جمہوری اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ 1952 میں مصر میں فوجی انقلاب آیا تو یہ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ اس انقلاب کی قیادت جمال عبدالناصر نے کی تھی، اور اس کا مقصد مصر میں سیاسی نظام کی جڑوں کو تبدیل کرنا تھا۔ جمال عبدالناصر نے اس انقلاب کے بعد ملک میں ایک نیا آئین بنانے کی کوشش کی، جس میں زیادہ تر طاقت فوج کے ہاتھ میں آ گئی۔ فوجی انقلاب کے بعد، مصر میں آئینی اصلاحات کی ایک نئی لہر شروع ہوئی، جس میں پہلے سے موجود آئینی اور قانونی ڈھانچے کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا۔ ناصر کی حکومت نے اس بات کو یقینی بنایا کہ آئین میں کسی قسم کی اسلامی شریعت کی چھاپ نہ ہو، اور اس کے متبادل ایک سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے۔ ناصر کی حکومت میں سیکولرزم کی جانب ایک واضح جھکاؤ تھا۔

مصر میں 1923 کے دستور کی تشکیل کے دوران علماء کا ردعمل ملا جلا تھا۔ کچھ علماء نے آئین کی حمایت کی کیونکہ اس میں اسلامی احکام کا احترام کیا گیا تھا، تاہم بعض علماء کا خیال تھا کہ مغربی جمہوریت کا نفاذ اسلامی معاشرتی نظام کے خلاف ہے۔ ان علماء کا ماننا تھا کہ اسلامی ریاست کو مغربی جمہوریت کے اصولوں سے دور رہنا چاہیے، کیونکہ یہ اسلام کی حقیقی اقدار کے مطابق نہیں ہیں۔ تاہم، 1952 کے انقلاب بعد جب جمال عبدالناصر کی حکومت نے سیکولر اقدار کو اپنانا شروع کیا، تو علماء کی ایک بڑی تعداد نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اُس وقت مصر میں اسلامی حلقوں میں بڑے پیمانے پر ناراضگی پیدا ہوئی، کیونکہ انہیں احساس ہوا کہ اسلامی ریاست کی بنیاد پر جو نظام پہلے پیش کیا گیا تھا، اسے اب منسوخ کر کے ایک سیکولر نظام قائم کیا جا رہا ہے۔

1923 میں مصر کے آئین کی چند اہم شقیں یہ تھیں:

(۱)وزیر اعظم کی تقرری

آئین کے تحت وزیر اعظم کو بادشاہ کی منظوری سے مقرر کیا جاتا تھا، اور وہ کابینہ کا سربراہ ہوتا تھا۔ وزیر اعظم کے پاس حکومتی امور چلانے اور کابینہ تشکیل دینے کا اختیار تھا۔

(۲)مقننہ، عدلیہ، اور انتظامیہ کی علیحدگی

آئین میں قانون ساز، عدلیہ، اور انتظامی شعبوں کو الگ الگ حیثیت دی گئی۔ اس علیحدگی کا مقصد یہ تھا کہ ہر ادارہ اپنے اختیارات میں خود مختار رہے اور کسی دوسرے ادارے کی حدود میں مداخلت نہ کرے۔

(۳)ووٹ ڈالنے کا حق

آئین نے بالغ مردوں کو انتخابات میں ووٹ ڈالنے کا حق دیا، جو ملک میں عوامی نمائندوں کے انتخاب کے ذریعے جمہوری عمل کو فروغ دینے کی جانب ایک اہم قدم تھا۔

(۴)پارلیمنٹ کی تشکیل

اس آئین نے دو ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ تشکیل دی: ایوانِ نمائندگان اور ایوانِ شیوخ۔ یہ پارلیمنٹ قانون سازی اور حکومتی معاملات پر نظر رکھنے کی ذمہ دار تھی۔

(۵)عوامی نمائندگی اور آئین میں ترمیم کا حق

آئین نے پارلیمنٹ کو یہ اختیار دیا کہ وہ عوام کی خواہشات کے مطابق آئین میں ترمیم کر سکے، تاہم اس کے لیے سخت قواعد وضوابط مقرر کیے گئے تھے تاکہ آئین میں غیر ضروری تبدیلیاں نہ کی جا سکیں۔

لبنان۔1926

لبنان کا آئین 1926 میں فرانسیسی منصوبے کے تحت تشکیل دیا گیا، اور یہ ایک سیکولر آئین تھا۔ لبنان کے آئین میں تمام اقلیتی گروہوں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا تھا، اور اس میں کوئی خاص اسلامی شریعت کی دفعات نہیں تھیں۔ لبنان میں آئینی جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد مختلف مذہبی کمیونٹیوں کے درمیان توازن قائم کرنا تھا۔ لبنان کا آئین مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان سیاسی اقتدار کی تقسیم کو

واضح کرتا ہے۔ چونکہ یہ فرانسیسی عملداری کے تحت تشکیل دیا گیا تھا، اس کی وجہ سے اسے خطے کے دیگر مسلم ممالک کے آئین سے ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ یہ آئین بنیادی طور پر ایک سیکولر آئین تھا جس میں ملک کے تمام شہریوں کو مذہبی بنیاد پر برابر حقوق دینے کی کوشش کی گئی۔ اس آئین نے مسیحی، مسلمان، اور دیگر مذہبی کمیونٹیز کو سیاسی اور سماجی حقوق فراہم کیے اور ہر کمیونٹی کو پارلیمان میں نمائندگی کا حق دیا۔ مثال کے طور پر، صدر کا عہدہ مسیحی مراونی، وزیر اعظم کا عہدہ سنی مسلمان، اور پارلیمنٹ کے اسپیکر کا عہدہ شیعہ مسلمان کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اس طرح مختلف مذہبی کمیونٹیز کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ فرقہ وارانہ تقسیم اور سیاسی عدم استحکام لبنان کی سیاسی تاریخ میں اہم مسئلہ رہا ہے۔ اگرچہ آئینی ڈھانچے میں طاقت کی تقسیم تو کی گئی، لیکن یہ مختلف گروہوں کے درمیان کشیدگی کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکا۔

1926 میں لبنان کے آئین کی چند اہم شقیں یہ تھیں:

(۱) مذہبی تقسیم پر مبنی نظام حکومت

لبنان کے آئین کی ایک منفرد شق یہ تھی کہ ملک کا نظام حکومت مذہبی بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ صدر مسیحی، وزیرِ اعظم سنی مسلم، اور اسپیکر شیعہ مسلم ہوگا، تاکہ مختلف برادریوں کے درمیان توازن برقرار رکھا جا سکے۔

(۲) آزاد اور خود مختار ریاست کا قیام

آئین میں لبنان کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے طور پر تسلیم کیا گیا، حالانکہ فرانس کی نگرانی میں یہ آزادی محدود تھی۔

(۳) فرانس کے ساتھ خصوصی تعلقات

اگرچہ لبنان کو ایک خود مختار ریاست قرار دیا گیا تھا، لیکن آئین میں فرانس کے ساتھ خصوصی تعلقات کی شرط بھی شامل تھی، جس کے تحت فرانس لبنان کی خارجہ پالیسی اور سیکورٹی امور میں اثر و رسوخ رکھتا تھا۔

(۴)آزادیِ مذہب

آئین نے شہریوں کو مذہبی آزادی دی، اور ہر فرد کو اپنی مذہبی شناخت کو برقرار رکھنے اور اس کی پیروی کرنے کا حق دیا۔

(۵)آئینی عدالت کا قیام

لبنان کے آئین میں ایک آئینی عدالت کے قیام کی شق شامل تھی جس کا مقصد آئین کی حفاظت اور اس کی خلاف ورزیوں کو روکنا تھا۔ اس عدالت کا کردار آئینی قوانین کی تشریح کرنا اور ان پر عمل درآمد کی نگرانی کرنا تھا۔ ایسے ہی حکومت کے اقدامات کو آئینی حدود کے اندر رکھنا اور کسی بھی غیر آئینی اقدام کو روکنا بھی ہدف تھا۔

اُردن۔1946

اُردن میں 1946 میں آئین کی پہلی دفعہ تشکیل کی گئی، جس میں اسلام کو ریاستی مذہب قرار دیا گیا تھا۔ اسے شاہ عبداللہ اول کے دور حکومت میں وضع کیا گیا تھا۔ یہ ملک میں ایک جمہوری اقدار کو متعارف کرانے کی پہلی کوشش تھی۔ اس آئین میں شاہی نظام کو برقرار رکھا گیا اور سیاسی نظام میں اصلاحات کی کوشش کی گئی تھی۔ آئین میں اسلامی اقدار کو ریاستی نظام کا حصہ بنانے کی کوشش کی گئی، لیکن مکمل طور پر شریعت کو نافذ کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ اس میں پارلیمنٹ، مقننہ، اور انتظامیہ کے اختیارات کو واضح کیا گیا۔ دراصل اسلامی اقدار کو شامل کرنے کے نام پر شاہ عبداللہ اول نے آئین کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی، اور اسی لیے شاہی حکومت کو آئین میں مرکزی حیثیت دی گئی۔ دستور میں اسلامی اقدار کو نظری حوالے سے تو اہمیت دی گئی تھی، لیکن اس پر عمل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

اُردن کے اس آئین کی چند اہم ترین شقیں یہ تھیں:

(۱)ریاست کا دین اسلام

آئین میں واضح طور پر یہ بیان کیا گیا تھا کہ اردن کا ریاستی مذہب اسلام ہے، اور اس کی تمام قانونی اور

دستوری بنیادیں اسلامی اقدار پر استوار ہیں۔

(۲) سیاسی جماعتوں پر پابندیاں

آئین میں کسی خاص سیاسی جماعت کے قیام پر پابندی نہیں تھی، لیکن عملاً سیاسی جماعتوں کا کردار محدود رہا اور شاہی حکمت عملی کے مطابق سیاست کی جڑیں زیادہ تر پارلیمنٹ تک محدود رہیں۔

(۳) پارلیمنٹ کے دو ایوانوں کی تشکیل

آئین میں پارلیمنٹ کے دو ایوانوں کی تشکیل کا ذکر کیا گیا تھا: ایوانِ نمائندگان اور ایوانِ مشیران۔ دونوں ایوانوں کو قانون سازی میں حصہ لینے کی اجازت تھی، تاہم ایوانِ مشیران میں شاہی نمائندوں کی اکثریت تھی۔

(۴) عوامی انتخابات

آئین میں عوامی انتخابات کے ذریعے پارلیمنٹ کے اراکین کا انتخاب کرنے کا نظام وضع کیا گیا تھا۔ تاہم، انتخابات میں حکومتی کنٹرول اور شاہی اثر و رسوخ نمایاں تھا۔

(۵) شاہی فرمان کی اہمیت

آئین میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ بادشاہ کا فرمان تمام حکومتی فیصلوں میں اہمیت رکھتا ہے، اور شاہی فرمان کے بغیر کسی بھی اہم قانونی یا آئینی تبدیلی کا نفاذ ممکن نہیں تھا۔

اسلامی دستور: ارتقائی مراحل اور فنی تشکیل

ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین*

قرآن وسنت اور حدیث وسیرت میں جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں ہدایات اور اسوۂ رسول ﷺ کے نظائر موجود ہیں وہیں شعبۂ سیاست کے بارے میں بھی خاطر خواہ رہنمائی میسر ہے اور یہ اسلام کا امتیاز ہے۔ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے مبارک ادوار اس کی عملی تطبیق کی عمدہ مثال ہے۔ خیر القرون والی حدیث[1] کو دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح نظام سیاسی میں ارتقا اور زمانی وعرفی تبدیلیوں کی رہنما بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔اس میں عہد نبوی، عہد تابعین اور تبع تابعین کے لیے لفظ ''خیر'' استعمال کرکے جہاں ان تینوں زمانوں کو وحی الٰہی اور وجود پیغمبر ﷺ کی براہ راست برکات سے معمور قرار دیا گیا، وہیں بار بار لفظِ ''ثم'' یعنی اس کے بعد کے استعمال سے امت کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ زمانہ جوں جوں عہد نبوت سے دور ہوتا جائے گا اس عہد کی خیر سے استفادے میں کمزوریاں آتی جائیں گی۔اس استفادے میں تسلسل قائم رکھنے کے لیے لوگوں کو اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرنا پڑے گا، علم حاصل کرنا پڑے گا، فہم قرآن وحدیث اور فہم سیرت طیبہ کے لیے زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ چنانچہ یہ عمل عہد نبوی سے ہی شروع ہوگا اور تبع تابعین تک پہنچتے پہنچتے نصوص کتاب وسنت کے ساتھ اجتہادات اور انسانی فکر پر مشتمل اسلامی علوم معاشرے میں ظاہر ہوگئے۔ سیاسی نظام میں آئے روز تبدیلیاں اور حسبِ ضرورت نئے انتظامات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کئی معاصر محققین نے ان مبارک ادوار کے سیاسی نظام اور دستوری عناصر پر تحقیقی مضامین اور کتب لکھی ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی کے مضامین اور تالیفات اس کی

---

*سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان۔

[1] صحیح البخاري، کتاب الشهادات، باب لایشهد علی شهادة جور إذا أُشهد، 171/3، ط: دار طوق النجاة، ودیگر ابواب بخاری ومسلم۔

عمدہ مثالیں ہیں۔

''مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوی والخلافة الراشدة''، "The First written Constitution in the world"، "الاجتهاد فی عصر الصحابة"، ''رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی'' اور ''رسول اکرم ﷺ کا اندازِ حکمرانی'' وغیرہ اس موضوع پر شاہکار شمار ہوتے ہیں۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں مختلف کتب بھی تصنیف ہونے لگیں، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دستور سازی میں اسلامی تاریخ کو کس قدر سبقت حاصل ہے، البتہ جدید دستور سازی اور اسلامی دستور سازی میں ارتقائی فرق یہ ہے کہ مغرب میں یہ کام کہیں 18ویں صدی عیسوی میں شروع ہوا اور براہ راست حکومت اور ریاست کی طرف سے جاری ہوا جب کہ مسلمانوں نے اپنی روایت کو عصر حاضر تک جاری رکھا کہ اجتہاد پرائیویٹ علما اور مجتہدین کرتے تھے اور اس سے استفادہ حکومتوں سمیت سب لوگ کرتے تھے۔ قرونِ اولی سے ہی مسلم نظام سیاست میں دو مکاتبِ فکر پیدا ہوئے جن کے نام بعد میں جا کر ''اہل سنت'' اور ''شیعہ'' ہو گئے۔ اہل سنت کے ہاں نظام سیاست کے لیے ''خلافت'' کی اصطلاح استعمال ہوئی اور شیعہ کے ہاں امامت کی۔ شیعہ کے مختلف ذیلی مکاتب فکر میں امامت کا تعین مختلف طریقوں سے کیا گیا۔

سیاسیات پر کتب نویسی کا ارتقا

خلافتِ بنو امیہ کے اواخر میں نظام سیاست پر باقاعدہ کتب لکھی جانے لگیں۔ عبد الحمید الکاتب اور عبد اللہ بن المقفع کی تحریریں اولیات سیاسیات میں شمار ہو سکتی ہیں۔ خلافتِ عباسیہ میں متخصص سیاسی کتب کا ظہور ہوا۔ ابو نصر فارابی (339ھ/950ء)، تنظیم "اخوان الصفا وخلان الوفا" (373ھ/983ء)[2]

اس کے ساتھ ساتھ مختلف دستوری عناصر پر الگ الگ کتب بھی لکھی جاتی رہیں۔ ان میں ریاستی

---

[2] مقدمۂ تحقیق، عبد الکریم محمد مطیع الحمداوی، فقہ الأحکام السلطانیۃ، بر کتاب تحفۃ الترک فیما یجب أن یعمل في الملک، نجم الدین ابراہیم بن علی الحنفی الطرسوسی، دار الطلیعۃ/بیروت ط1 1423ھ، ص24-25

مالیات پر امام ابو یوسف (متوفی 182ھ / 798ء)، یحییٰ بن آدم (متوفی 206ھ)، ابو عبید القاسم بن سلاّم (224 متوفی ھ/838ء)، ابن زنجویہ (متوفی 251ھ)، ابو جعفر احمد بن نصر (متوفی 402ھ)، ابن رجب حنبلی (متوفی 795ھ / 1393ء) اور ابن تیمیہ (متوفی 728ھ) کی تحریریں اور کتب معروف ومتداول ہیں ۔ بین الاقوامی تعلقات میں ''سیَر''، ''مغازی''، ''عہد''، ''امان''، ''صلح''، ''موادعت''، ''جزیہ'' وغیرہ کے عنوانات کے تحت لکھنے میں امام اوزاعی (متوفی 157ھ)، امام شافعی، امام فزاری (متوفی 186ھ)، امام محمد بن حسن الشیبانی (متوفی 189ھ) اور شمس الائمہ سرخسی (متوفی 490ھ) صف اول میں نظر آتے ہیں۔ اسلام کے نظام عدل پر بہت سی کتب لکھی گئیں جن کے مولفین میں امام وکیع (متوفی 306ھ)، قاضی خصّاف (متوفی 261ھ) صدر شہید (متوفی 536ھ)، ابوالحسن ماوردی، ابن قیم الجوزیہ (متوفی 751ھ)، ابن فرحون مالکی (متوفی 799ھ)، علاء الدین طرابلسی (متوفی 844ھ)، شمس الدین منہاجی (متوفی 880ھ)، علامہ طوغان (متوفی 881ھ)، ابن الشحنہ (متوفی 882ھ) اور دده افندي (متوفی 1146ھ) قابل ذکر ہیں۔

مکمل دستوری تالیفات

خلافتِ عباسیہ میں مکمل دستوری خاکوں پر مبنی تالیفات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اسے سیاسی فکر کے ارتقا کے عروج اور سیاسی اجتہادات کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں ایک طرف سنی خلافتِ عباسیہ کے اطراف واکناف میں شیعہ اثنا عشری اور فاطمی اسماعیلی سیاسی قوتوں کا ظہور ہو چکا تھا، ایران میں بویہی سلاطین اور قاہرہ میں فاطمی سلاطین اپنی حکومتیں قائم کر چکے تھے اور دوسری طرف منصبِ خلافت کے ساتھ ساتھ کئی دیگر مناصب باقاعدہ دستوری قوت حاصل کر چکے تھے۔ اس طرح خلیفہ کے اختیارات کی مرکزیت ٹوٹ کر عملاً کئی مناصب میں تقسیم ہو چکی تھی۔ شیعہ سنی سیاسی فکر کو سامنے رکھتے ہوئے ابو نُعیم اصفہانی (430ھ/1038ء) نے اپنی کتاب ''تثبیت الإمامة وترتیب الخلافة''[3] تصنیف کی۔ اس موضوع پر دیگر کتب بھی لکھی گئیں مگر اسی زمانے میں اسلامی

[3] تثبیت الامامة وترتیب الخلافة، حافظ ابو نُعیم احمد بن عبد اللہ بن احمد بن موسی ابن مھران اصبہانی (متوفی 430ھ)، تحقیق وحواشی، ابراھیم علی تہامی، دار الامام مسلم | بیروت، لبنان، ط1، 1986ء مطابق 1407ھ، (صفحات 245)۔

نظامِ سیاست کو دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق چلانے کے لیے اجتہادات، تجزیوں اور تجاویز پر مشتمل پہلی کتاب قاضی ابوالحسن ماوردی (متوفی450ھ/1058ء) کی نظر آتی ہے۔ان کی علمی اور عملی زندگی زیادہ تر "القادر باللہ" اور ان کے بعد "القائم بامر اللہ" (422ھ—467ھ) مطابق 1031ء—1075ء) کے 45 سالہ طویل دور میں گزری۔ خلافتِ عباسیہ لگ بھگ 500 سال سے زائد عرصہ تک قائم رہی۔اس دوران بہت سی علمی اور سائنسی ترقی ہوئی، بہت سی سیاسی اور دینی تحریکات اٹھیں، کئی تہذیبوں کا ملاپ اور تصادم ہوا۔اس وقت کا مسلم معاشرہ عربی، فارسی، ترک، ساسانی، بیزنطینی، حمدانی وغیرہ پر مشتمل ایک تکثیری معاشرہ تھا، تمام فقہی مکاتب فکر کے مراکز اور کبار ائمہ اس کا حصہ تھے، کلامیات، فلسفیات، دینیات، سیاسیات اور معرفیات وصوفیات کی بحثیں اس دور میں عروج پر رہیں۔ دینی لحاظ سے معتزلہ، سنی، شیعہ امامیہ، شیعہ اسماعیلیہ نہ صرف عوامی سطح پر سرگرم تھے بلکہ ان کے درمیان سیاسی سطح پر بھی آنکھ مچولی چلتی رہی۔ سلاسلِ تصوف کا عروج، بیت الحکمت، پبلک لائبریریاں، سائنسی تحقیق کے مراکز، طبّی بنیادوں پر باغات کی شجر کاری، موسیقی، ماتمی جلوس، تعزیہ کی تیاری، تبرہ بازی وغیرہ اس معاشرے کے تنوع کی کچھ علامات تھیں۔ مقتدرہ میں کہنے کو تو خلیفہ ہی ملک کا سیاسی سربراہ ہوتا تھا مگر امام ماوردی کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے وزیر، وزیر تنفیذی، امیر الامرا اور سلطان کے مناصب اس قدر طاقت ور ہو گئے تھے کہ خلیفہ کی حیثیت ان کے سامنے شطرنج کے مہرے سے بڑھ کر کچھ نہ رہی تھی۔ موجودہ پارلیمانی نظام میں وزیرِ اعظم اور صدر مملکت یا وزیر اعظم اور روایتی بادشاہ کے درمیان اختیارات کی تقسیم بھی ان کی طاقت کے سامنے وضع دار سی نظر آتی ہے۔ سلطان کا منصب مجبوراً ان علاقائی قوتوں کو دینا پڑا جو خلیفہ کی مرضی یا اطلاع کے بغیر کچھ علاقے فتح کر کے ان کے مقتدر بن جاتے تھے، گویا یہ خود اختیاری صوبائی خود مختاری کی ایک قسم تھی جنھیں اپنے خلاف ہونے سے روکنے کے لیے خلفائے عباسیہ نے یہ عنوان دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مذہب اور جس عقیدے کے سلطان خلیفہ کی مدد کرتے انہی کو مرکز میں قوت حاصل ہو جاتی اور انہی کا مذہب سرکاری سطح پر طاقتور ہو جاتا۔ باقی دونوں مناصب مرکز کے پاس تھے اور خلیفہ کے تقرر و معزولی میں موثر کردار ادا کرتے تھے۔ کئی سلاطین مرکز کی مدد کرنے کی بنا پر

''امیر الامرا'' بنے۔ کئی ''امیر الامرا'' اتنے طاقت ور ہوئے کہ جمعہ کے خطبہ میں ان کا نام شامل کیا جانے لگا۔ ماوردی نے اپنی زندگی میں وہ دور بھی دیکھا جب دار الخلافہ ''بغداد'' میں قاہرہ کے فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔[4] ۔ماوردی کی کتاب ''الأحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ'' اسلامی نظام و آئینِ حکمرانی اور سیاست پر جامع کتاب شمار ہوتی ہے۔ اس میں خلفا، ملوک، سلاطین، وزرا، والیوں اور قاضی صاحبان کے اختیارات اور ان کے بارے میں احکام درج ہیں۔ امام ماوردی نے اپنی کتاب کا نام ''أحکام الخلافۃ والخلفاء'' کی بجائے ''الأحکام السلطانیہ'' رکھا اور اس کے ساتھ ''ولایات دینیہ'' کی اصطلاح استعمال کی۔ اس سے ایک طرف ''نظام خلافت'' کی طرح ''نظام سلطنت'' کا بھی احکام شرعیہ کا موضوع ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف امام یا سلطان کی طرف سے قائم کیے گئے محکموں کو بھی ''ولایات دینیہ'' قرار دینے کا پتہ چلتا ہے۔

دیگر مماثل کتب

قاضی ابو یعلیٰ محمد بن حسین الفراء (متوفی 458ھ) نے بھی ''الأحکام السلطانیۃ'' کے نام سے کتاب لکھی۔ البتہ امام الحرمین جوینی (متوفی 478ھ/1085ء) کی کتاب ''غِیاثُ الأمم في التیاث الظُّلَم''[5] (تہ بتہ اندھیروں میں قوموں کی دستگیری کرنے والی) علم سیاست پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اس کا اسم شہرت ''غیاثي'' ہے۔ کتاب کا اصل موضوع یہ ہے کہ جب کسی زمانے میں مسلمانوں کا کوئی والی اور سلطان نہ رہے تو امامِ مملکت سے متعلق فرائض کی انجام دہی کا طریقہ کیا ہوگا؟ اس میں سربراہ مملکت کے اختیار کے بارے میں جمہور کے کردار پر بھی عمدہ بحث ہے۔ مصنف نے اس موضوع پر محض سابقین کے اقوال نقل کرنے کی بجائے کچھ جدید پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، سربراہِ ریاست کی شرائط، شوریٰ، عباسی خلیفہ کے بارے میں موقف،

---

[4] خلیفہ القادر باللہ نے اپنے دور کے دیگر مسلم حکمرانوں کو سلطان کا لقب دیا۔ سلطان بعد کے تمام عباسی خلفا کے مذہبی نائب شمار ہوتے تھے۔ https://ur.wikipedia.org بحوالہ محمود شاکر ج2: ص176

[5] غیاث الامم فی التیاث الظلم، امام الحرمین ابی المعالی عبد الملک بن عبد اللہ الجوینی، تحقیق ودراسہ وفہارس، دکتور عبد العظیم الدیب، کلیۃ الشریعۃ، جامعۃ قطر، الطبعۃ الثانیۃ 1401ھ، مکتبۃ امام الحرمین، منحجہ فی الکتاب، ص63

انسانی آزادیوں کا تحفظ اور امن وامان وغیرہ اس کتاب کے خاص موضوعات ہیں۔

مسلم ممالک میں جدید دستور سازی

مسلم ممالک میں جدید دستور سازی کی ابتدا سلطنتِ عثمانیہ سے ہوئی۔ یہ تحریک مرکز اور کچھ صوبوں میں قریب قریب زمانوں میں شروع ہوئی مگر پہلی دستوری دستاویز خدیوی دور میں 27 نومبر 1824ء کو مصر نے جاری کی اس کے ذریعے ملکی سطح پر ''مجلسِ اعلیٰ'' (ہائر اسمبلی/سینٹ) کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے قواعد ضابطہ کار جاری کیے گئے۔ مجلسِ اعلیٰ (سینٹ) کے تاسیسی حکمنامے میں اس کی بنیاد قرآنِ مجید کے اصولِ شوریٰ کو قرار دیا گیا۔[6] اس کے جلد بعد مصر سلطنتِ عثمانیہ سے جدا ہو کر محمد علی کی سربراہی میں الگ ملک بن گیا اور محمد علی نے ''خدیو'' کا لقب اختیار کیا۔[7] مجلس کے قیام کے 9 سال بعد 12 جولائی 1833ء کو ''قانون ترتیب مجلس اعلیٰ'' جاری ہوا۔[8] پھر 1837ء میں ''قانونِ سیاستنامہ'' جاری کیا گیا۔ یہ دستاویز یورپی تجربے سے استفادہ کر کے مرتب کی گئی۔ مصر اگرچہ اس وقت نیم آزادی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا مگر ریاستی معاملات میں دینی عمل دخل وہی تھا جو خلافتِ عثمانیہ کے دیگر صوبوں میں تھا۔[9] سیاست نامہ کے عنوان سے تین دستور جاری ہوئے: پہلا 21 ربیع الاول 1245ھ مطابق 20 ستمبر 1829ء کو، دوسرا 12 شوال 1250ھ مطابق 10 فروری 1835ء کو اور

---

[6] سرائے ملکیہ، مصر، ''قسم المحفوظات التاریخیۃ''، بستہ نمبر 1، مجلس ملکیت، دستاویز نمبر 1، یا اس کی تصویر فوٹو گرافی۔

[7] https://ur.wikipedia.org/wiki محمد علی پاشا۔ ''خِدیو'' (Khidev) اور ''خدیوی'' فارسی زبان کا لفظ ہے، اس کا معنی بادشاہ، سلطان، حکمراں، مالک، آقا، شوہر ہے۔ یہ لفظِ ''خُدا'' سے ماخوذ ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ''خدا'' بمعنی مالک یا آقا کی طرف نسبت کر کے ''خُداوی'' بنایا گیا اور پھر ''خدیوی'' بن گیا اور پھر مختصر ہو کر ''خدیو'' کہلایا۔

https://ar.wikipedia.org/wiki خدیوی

[8] قانون ترتیبات المجلس العالی، الصادر فی 23 صفر 1249 (12 یولیہ 1833)، نص القانون۔

[9] قانون السیاستنامہ الصادر فی ربیع الثانی سنۃ 1253ھ یولیوسنۃ 1837ء۔ اصل نسخہ ترکی زبان میں شائع شدہ، از مطبعۃ بولاق'' شاہی اور اق ودستاویزات میں ملا۔ السیاستنامہ (1937): دراسۃ لاول قانون لنظام الحکومۃ المصریۃ، زین العابدین شمس الدین نجم، دار الکتاب الجامعی للطباعۃ والنشر والتوزیع، 1996ء

تیسرا سیاستنامہ ملکیہ (ربیع الاول 1253ھ مطابق جولائی 1837ء) جو کہ زیادہ مشہور ہے۔[10]

قاجاری ایران کا دستور

کسی شیعہ ریاست میں جدید دستور سازی کے لحاظ سے ایران کی قاجاری سلطنت (1796 تا 1925ء)[11] سب سے آگے نظر آتی ہے ۔ یہ دور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعتبار سے اور سلطنتِ برطانیہ کی بنیاد پر مشرق وسطیٰ اور بعد میں یورپ میں نپولین کے ساتھ جنگوں کے لحاظ سے اہم بھی رہا اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور سلطنت برطانیہ نے اس دوران بڑی اہم فتوحات بھی حاصل کیں۔ دیگر مسلم ممالک کی طرح ایران میں دستور سازی میں بھی یورپی ممالک کے تسلط اور اثر رسوخ کا کافی عمل دخل رہا۔ 1890ء کی دہائی سے ایران کے جدت پسند لوگوں نے ملک میں دستوری حکومت قائم کرنے کے لیے خفیہ انجمنیں قائم کرنی شروع کر دی تھیں، یہاں تک کہ 1899 میں قاجاری شہنشاہ ناصر الدین شاہ کو ایک ایرانی نوجوان نے قتل کر دیا۔ جنگ عظیم کے دوران ایران کی علاقائی یکجہتی مزید کمزور پڑ گئی۔ یہاں بھی آئینی جمہوریت کی تحریک 1905ء میں چلی جس کے نتیجے میں مظفر الدین شاہ قاجار کے دور میں 1906ء میں پہلا آئین نافذ العمل ہوا اور ایرانی پارلیمنٹ وجود میں آگئی۔[12]

برِّصغیر پاک و ہند میں مسلم حکومتیں اور دستوری فکر

مغلیہ سلطنت ظہیر الدین محمد بابر کے ہاتھ پر 1526ء میں قائم ہوئی اور سب سے بڑی اسلامی ریاست

---

[10] السیاستنامۃ الثانیۃ: صفحۃ مجھولۃ من تاریخ التشریع الجنائی فی عصر محمد علی، د۔ عماد ھلال-جامعۃ قناۃ السویس، الروزنامۃ، العدد الثامن—2010م، ص 41-74۔

[11] ہم سب 2024 03-29، (میدیا سلطنت سے 1979 کے اسلامی انقلاب تک)، https://ur.wikipedia.org/wiki/ایل خانی، https://ur.wikipedia.org/wiki عباس اول، ہم سب، انقلاب اسلامی کا تاریخی پس منظر، تاثیر عباس نقوی، 27- 02- 2021

[12] ایران کی ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت اور محمد رضا شاہ پہلوی، ڈاکٹر عرفان احمد بیگ، ایکسپریس نیوز 13 اگست 2023ء https://www.express.pk/story/2524395/10۔ قاجار خاندان (Qajar dynasty) ترک نسل سے ایک ایرانی شاہی خاندان تھا جس نے 1785ء سے 1925ء تک فارس (ایران) پر حکومت کی۔

بنی۔ یہاں مسلمانوں نے نظامہائے حکومت اور انتظامی واداری قوانین متعارف کرائے۔[13] اجمالی طور پر ہندوستان میں شریعت کو قانونی نظام کی بنیاد قرار دینے سلاطین دہلی کا نام آتا ہے جن میں فیروز شاہ تغلق اور علاؤالدین خلجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسلم سلاطینِ ہند کے سیاسی اور انتظامی اقدامات کا دستوری مطالعہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس پر کئی مطالعات ہو بھی چکے ہیں۔ یہاں کچھ ایسی فقہی کتب کا ذکر بہتر معلوم ہوتا ہے جو مختلف سلاطین یا ارباب مناصب کی طرف منسوب ہوئیں۔[14] ایسی کتب کا اس وقت کے سیاسی نظام میں عمل دخل ایک فطری امر ہے:

الفتاویٰ الغیاثیۃ: داود بن یوسف الخطیب الحنفی کی تالیف اور سلطان غیاث الدین بلبن (دورِ حکومت 664ھ مطابق 1266ء تا 686ھ مطابق 1287ء) کی طرف منسوب ہے۔ یہ فتنۂ تاتار کا زمانہ تھا اور یہ فتاویٰ اپنے دور کے مسائل کا احاطہ کرتا ہے جن میں سیاسی اور انتظامی مسائل پر بھی مستقل ابواب ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں بھی اس کے حوالے دیے گئے ہیں۔[15] فتاویٰ قراخانی۔ فقہ حنفی پر مشتمل فارسی زبان میں ہے۔ مؤلف کا نام مولانا امام ہمام صدر الملت والدین یعقوب مظفر کرامی ہے۔ یہ فتاویٰ ابوالمظفر سلطان فیروز شاہ خلجی (688-695ھ) کے نام منسوب ہے اور اس میں سلطان کے جو القاب ذکر کیے گئے ہیں ان سے اس زمانے کے سیاسی نظام اور نفاذ شریعت کی صورتحال معلوم ہوتی ہے۔ ان القاب کے علاوہ کتاب کے مقاصد بھی واضح طور پر لکھے گئے ہیں۔ اس عبارت کا ایک حصہ یوں ہے: ''وبعد بر ضمائر جہانیاں، وخواطر عالمیاں، چوں آفتاب روشن است کہ جامع ہمت ونواعت، نہمتِ خسروِ دین دار، سلطانِ شرع شعار، محی آثارِ شریعت، ماحی رسوم بدعت، مظہر دینِ مسلمانی، معلی معالم ملت ایمانی، ناصبِ رایاتِ ملک داری، رافع بنائے شہریاری، ناشر صحائف العدل والاحسان، ناسخِ رایات الکفر والطغیان، الواثق بتایید الرحمن ابوالمظفر فیروز شاہ السلطان''۔[16] فتاوی کے مختلف ابواب

---

[13] https://www.aljazeera.net/encyclopedia/2024 تاریخ الإسلام في الهند

[14] اس سلسلے میں مولانا اسحاق بھٹی کی ''برصغیر میں علم فقہ'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔

[15] برصغیر میں علم فقہ، مولانا محمد اسحاق بھٹی، ۔۔۔۔۔ ص 52-79

[16] برصغیر میں علم فقہ، مولانا محمد اسحاق بھٹی، ۔۔۔۔۔ ص 80-117

میں بکثرت غیر مسلموں کے ساتھ معاملات اور تعلقات کے مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں مغربی طرز کے دستور کا ظہور نہیں ہوا تھا، اس لیے اپنے وقت کے لحاظ سے یہ عمدہ دستوری اور قانونی مجموعہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ فوائد فیروز شاہی۔ مولف کا نام شرف محمد عطائی ہے اور یہ فیروز شاہ تغلق (عہدِ حکومت 752ھ مطابق 1351ء تا 790ھ مطابق 1389ء) سے منسوب ہے۔ اس میں علمی، فکری، اصطلاحی اور فقہی مباحث ہیں اور سیاست وجہاں بانی سمیت تمام ابواب پر مشتمل ہے۔[17]

فتاویٰ تاتار خانیہ: فرید الدین عالم بن علا اندرپتی[18] دہلوی حنفی (متوفی 786ھ) کی تالیف ہے۔ اسے تقریباً 30 جلدوں میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس کی تالیف ''خان اعظم تاتار خان'' کی خواہش پر کی گئی۔ اس کا اصل نام ''زاد السفر'' یا ''زاد المسافر فی الفروع'' رکھا گیا تھا۔[19] فتاویٰ حمادیہ۔ ابو الفتح رکن الدین بن حسام الدین الناگوری (متوفی تقریباً 9ویں صدی ہجری) کی تالیف ہے اور یہ انھوں نے ریاست گجرات کے شہر ''نہروالا'' کے قاضی القضاۃ حماد جمال الدین احمد بن القاضی محمد اکرم گجراتی (تقریباً 9ویں صدی ہجری) کی فرمائش پر لکھی۔ اس کا بنیادی مقصد عدالتی ضروریات کے لیے مسائل کو جمع کرنا تھا۔ کتاب کے اہم مسائل میں سے ایک مسئلہ ''اہل ذمہ'' کی عبادت گاہوں کا ہے۔ قدیم عبادت گاہوں کی مرمت وغیرہ کی اجازت دی گئی ہے، جدید کی ضرورت پڑے تو اہل ذمہ صرف اپنے رہائشی علاقے میں تعمیر کر سکتے ہیں۔ مسلم آبادی یا دہاتوں میں تعمیر کی اجازت نہیں ہوگی۔ اگر قدیم عبادت گاہوں کے بارے میں اگر یقین ہو جائے کہ انھیں مسلمانوں کے خلاف اجتماعات یا منصوبوں کے لیے استعمال کیا جائے گا تو انھیں گرانا بھی جائز ہے۔ اگر کوئی علاقہ صلح سے فتح ہو جائے تو اس میں غیر مسلم عبادت گاہوں کو گرانا جائز نہیں۔ مولف نے مختلف مناصب خدمات عامہ پر کام

---

17 برصغیر میں علم فقہ، مولانا محمد اسحاق بھٹی، ۔۔۔۔۔ ص 118-134

18 مؤرخین کی رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''دہلی'' کا قدیم نام ''اندرپت'' تھا، بعد میں دہلی ہوا۔ سر سید احمد خان نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ ''پت'' کے معنی صاحب اور مالک اور حاکم کے ہیں اور ''اندر'' جو اکاس اور مہشت کا راجہ تھا۔
https://www.madarisweb.com/ur/articles/5760

19 برصغیر میں علم فقہ، مولانا محمد اسحاق بھٹی، ۔۔۔۔۔ ص 135-145

کرنے والے لوگوں کے لیے تنخواہوں اور معاوضوں کے مسائل بھی بیان کیے ہیں۔ احتجاج، انقلاب اور تحریکات چلانے کے مسائل بھی بیان کیے ہیں۔ اپیل کے حق پر بھی بات کی ہے۔ اجتہاد کے ذریعے فیصلہ کرنے، ایک پارٹی کی عدم موجودگی میں فیصلہ کرنے، عدالتی کے سامنے آخری بیان کی اہمیت اور اس کے علاوہ قاضی کے شرائط و آداب بھی بیان کیے ہیں۔[20] فتاویٰ ابراہیم شاہی (حصہ فارسی)— مولف کا نام ''احمد بن حُمید الملقب بنظام (متوفی 875ھ) ہے۔ اور فتاویٰ کی نسبت سلطان ابراہیم شاہ شرقی (متوفی 844ء) کی طرف ہے۔ دوسرا حصہ عربی میں ہے۔[21]

مغلیہ دور کی سیاسی دستاویزات

ذیل میں مغلیہ ہندوستان کی کچھ سیاسی دستاویزات کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے برّ صغیر کے مخلوط معاشروں اور جدید سیاسی نظاموں میں ایک اسلامی دستور مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

فتاویٰ بابری: شیخ نور الدین بن قطب الدین خوافی (10 ویں صدی ہجری) کی تالیف ہے[22] اور ظہیر الدین بابر کی طرف منسوب ہے۔ اس فتاویٰ میں بادشاہ ظہیر الدین بابر کی فرمائش پر فارسی میں ''عبادات کے شرعی اور فرعی مسائل'' مرتب کیے گئے۔ سلطنتِ بابری کے سیاسی اور سماجی نظام میں فقہِ حنفی پر تعامل تھا۔ البتہ اس فتاویٰ میں نماز جمعہ کی اقامت کے سلسلے میں اہل تشیع کے موقف کے برعکس بادشاہ کے اختیار کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔[23] شیخ نور الدین خوافی نے فتاویٰ بابری کے دیباچہ میں بادشاہ ظہیر الدین بابر کے کئی ایسے القابات اور امتیازات لکھے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے عرف میں ایک مسلم بادشاہ کی کیا دستوری ذمہ داریاں ہوتی تھیں۔ ان صفات

---

[20] برصغیر میں علم فقہ، مولانا محمد اسحاق بھٹی، ۔۔۔۔۔ ص146-185

[21] برصغیر میں علم فقہ، مولانا محمد اسحاق بھٹی، ۔۔۔۔۔ ص186-197

[22] فتاوی بابری از متونِ مہم فقہی در عصرِ بابر، کریم نجفی برز گر، ص52، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، بابت ماہ جولائی 1950ء، جلد 66، عدد 1، ص49-57

[23] بر صغیر میں علم فقہ، مولانا محمد اسحاق بھٹی، ص 253-260، ماہنامہ معارف، جولائی 1950ء، ص49 (وحاشیہ-1)، فتاوی بابری از متونِ مہم فقہی در عصرِ بابر، کریم نجفی برز گر، ص51 (حاشیہ 2)

میں ''دین پناہ''(دین کا تحفظ کرنے والا)، ''معدلت گسترے''(عدل قائم کرنے والا)، بمقتضائے عدالتِ ذاتی و موروثی رعایتِ ہر امرے بہ قدرِ مرتبۂ آن فرمودہ، اجتناب از ترجیح مرجوح و احتراز از تفضیلِ مفضول (ذاتی طور پر بھی اور موروثی طور پر بھی ہر چیز کو اس کا اصل مقام دے اور کسی کم مقام کے مستحق کو بڑا مقام نہ دے) جیسے القاب شامل تھے۔

تُزک بابری: یہ ظہیر الدین بابر کی اپنی تصنیف ہے اور ان کی روزانہ کی ڈائری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ان کی جنگوں اور فتوحات کا ترتیب وار ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے اپنی زندگی کے اہم واقعات اس میں نقل کیے ہیں۔ بعد میں کتاب کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ تُزکِ بابری میں موجود بابر کی توبہ کا بیان ان کی آئندہ دستوری حکمتِ عملی کا بیان بھی ہے۔ بابر کے ہاں اصلاح نفس کے باقاعدہ اقدامات کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔[24]

شیر شاہ سوری: فرید خان (1472-22 مئی 1545ء) عرف شیر شاہ سوری کا تعلق پشتون کی مشہور شاخ اسحاق یعنی سہاک سے تھا۔ وہ بابر کے بعد نصیر الدین ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کے حکمران بنے۔ انھوں نے اپنی سلطنت کو 47 اضلاع میں تقسیم کر رکھا تھا اور ان کے دستوری بندوبست میں درجِ ذیل شعبے نمایاں تھے: ۱۔ دیوان وزارت، ۲۔ دیوانِ عرض: (فوج کی بھرتی اور نظم و نسق)، ۳۔ دیوانِ رسالت (وزارتِ خارجہ اور خط و کتابت)، ۴۔ دیوانِ انشا (شاہی احکام و فرامین کی تیاری)، ۵۔ دیوانِ قضا (شعبہ انصاف اور اپیل)، ۶۔ دیوان برید (شعبہ ڈاک، جاسوسی اور خبر رسانی)، ۷۔ خانساماں (شاہی محل کے اخراجات اور خوراک کی ذمہ داری)، ۸۔ بہتر، مؤثر اور محفوظ ذرائع رسل و رسائل۔ ۹۔ محصولات، ۱۰۔ (نقدی کے معیاری سکے)، ۱۱۔ مفلس، نادر، یتیم کی فلاح و بہبود کے لیے امدادی، خیراتی ادارے قائم کیے اور لنگر خانے۔ ۱۲۔ علما طالب علموں اور مساجد کے اماموں، مؤذنوں کو وظائف دینے کا اہتمام کیا۔ ۱۳۔ ہندو مسلمان دونوں کا یکساں خیال رکھا، سبھی کی سرپرستی خود

---

24 ترجمۂ تُزکِ بابری اردو ترجمہ معروفہ بابر نامہ، میرزا نصیر الدین حیدر گورگانی المتخلص بہ فانی، مطبع محمڈن پرنٹنگ ورکس دہلی، 1924ء، ص307-311

کی۔ ۱۴۔ زمین کی پیائش کرائی اور زمینوں کو بیگھوں میں تقسیم کیا۔[25] شیر شاہ سوری کے دور کے صدر الصدور حسن علی خان نے اپنی کتاب ''تواریخِ دولتِ شیر شاہی'' کے چھٹے باب میں شیر شاہ سوری کے 17 فرامین نقل کیے ہیں اور بعض کا صرف حوالہ دیا ہے جن کے ذریعے انھوں نے ملک میں اصلاحات نافذ کیں۔ یہ سب مل کر ایک عمدہ دستوری دستاویز کا کام دے سکتے ہیں۔[26]

جلال الدین محمد اکبر: جلال الدین محمد اکبر (15 اکتوبر 1542- 25 اکتوبر 1605ء) کا پچاس سالہ دورِ حکومت (11 فروری 1556—25 اکتوبر 1605) سیاسی، سماجی اور مذہبی تنوع کا دور ہے۔ جب ہم جدید دستور کی بات کرتے ہیں تو اس میں دیگر عناصر نظام سیاست کے ساتھ ساتھ کسی ملک کے باسیوں کی شہری حیثیت، بنیادی حقوق، مذہبی آزادی سمیت مختلف آزادیاں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب آزادیوں اور حقوق کی بات آتی ہے تو مذہب اور ریاست کا تعلق تفصیل سے زیر بحث آتا ہے۔ جلال الدین محمد اکبر کا دَورِ حکومت دینی حلقوں میں اس سلسلے میں کافی بدنام ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تمام مذاہب کو جمع کر کے ایک دینِ الٰہی ایجاد کیا۔ اکبر کی دینی پالیسی اور دینِ الٰہی کے بارے میں اس دور کی تاریخ کی کتابوں میں بڑی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان میں ابو الفضل علامی کی ''اکبر نامہ'' اور ''آئینِ اکبری''، سوانح عمری، جلال الدین محمد اکبر شاہنشاہ ہند مع نورتن اکبری، جلال الدین محمد اکبر شاہ تالیف میرزا حیرت دہلوی، دیوان اکبری از مولانا محمد حسین آزاد، منتخب التواریخ از مُلّا عبد القادر بدایونی وغیرہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کی تحریریں اس زمانے میں پیدا ہو جانے والی خرابیوں کی اصلاح کے لیے اہم

---

[25] شیر شاہ سوری: ریاضی کے ماہر بادشاہ جن کی پانچ سالہ حکومت پانچ صدیوں بعد بھی اچھی حکمرانی کا معیار ہے، وقار مصطفیٰ، عہدہ، صحافی و محقق، لاہور، 22 مئی 2022، https://www.bbc.com/urdu/pakistan-61538881

[26] تواریخِ دولتِ شیر شاہی (1557ء) (مع متن فارسی) از حسن علی خان صدر الصدور شیر شاہ سوری، مع اجینیہ کی ورتہ (1538) از بودھ راج بیکانیری، ترجمہ و تحقیق و حواشی ڈاکٹر سعود الحسن خان روہیلہ، بک فورٹ ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز، ہاؤس نمبر 9، سٹریٹ نمبر 32، غنی محلہ، سنت نگر، لاہور، 2011ء۔ اس کے علاوہ عباس خان سروانی کی کتاب 'تاریخِ شیر شاہی' ترجمہ شدہ مظہر علی خان ولا، ترتیب و حواشی ڈاکٹر سید معین الحق، شائع شدہ سلمان اکیڈمی، حق نشان، ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۵، 1963ء بھی شیر شاہ سوری کے نظام حکومت کے بارے میں مفید ہے۔

ہیں۔ مگر کسی کتاب سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اکبر نے باقاعدہ کوئی علیحدہ دین جاری کیا۔ کئی مصنفین نے اکبر کے سیاسی اور سماجی تعامل کو دین الٰہی کا نام دیا اور اس پر مستقل کتابیں بھی لکھیں جن میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے استاذِ تاریخ پروفیسر محمد اسلم کی ''دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر''، جناب شاہد مختار کی ''دینِ الٰہی آغاز سے انجام تک''، اور مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی کی ''دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر''اس تصور کے بارے میں مثبت اور منفی تبصروں کو سمجھنے میں مددگار ہو سکتی ہیں۔

نورالدین جہانگیر: اکبر کے بعد ان کے فرزند نورالدین جہانگیر (3 نومبر 1605 — 7 نومبر 1627) بادشاہ بنے۔ ان کی سیاسیات اور انتظامیات عموماً اکبر کے نظام کا تسلسل رہیں، البتہ دینی معاملات میں ان کی دلچسپی اس قدر نہ تھی جس قدر اکبر کی ہوتی تھی۔ انھوں نے بھی غیر مسلم شہریوں کو باعزت مقام دیا۔ مزید یہ کہ جہانگیر نے کان اور ناک اور ہاتھ وغیرہ کاٹنے کی سزائیں منسوخ کیں۔ شراب اور دیگر نشہ آور اشیا کا استعمال حکماً بند کیا۔ کئی ناجائز محصولات ہٹا دیے۔ خاص خاص دنوں میں جانوروں کا ذبیحہ بند کر دیا اور فریادیوں کی دادرسی کے لیے اپنے محل کی دیوار سے ایک زنجیر لٹکا دی، جسے زنجیر عدل کہا جاتا تھا۔[27] انھوں نے توزکِ جہانگیری بھی تصنیف کی جس میں اپنے دور حکومت کے اہم واقعات کو بڑے بے تکلف اسلوب میں بیان کیے ہیں۔ مجدد الف ثانی کو انھوں نے ایک عام قسم کا درویش لکھا جو ایک معاندانہ رویہ کو ظاہر کرتا ہے، البتہ وہ خواجہ معین الدین اجمیری پر فخر کرتے تھے کہ وہ ان کی دعاؤں سے تولد ہوئے۔[28]

---

[27] https://ur.wikipedia.org/wiki نورالدین جہانگیر

[28] https://mashriqtv.pk/latest/286588/ مشرق جمعہ، 13 جمادی الاول، 1446ھ 15 نومبر 2024ء 3 گھر، روشنی، ڈاکٹر ذکاءاللہ خان۔ سرسید احمد خان نے اِس کتاب کی تصحیح کر کے اِسے جنگ آزادی 1857ء سے دو سال قبل 1855ء میں دہلی سے شائع کیا تھا اور اِس میں کثرت سے تاریخی و توضیحی حواشی کا اضافہ کیا تھا۔ دوسری جلد جنگ آزادی 1857ء میں ضائع ہو گئی۔ پہلی اور تیسرے اب ناپید ہیں بلکہ کم ہی کسی کتب خانہ کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ بلاک مین نے سلسلہ کتب ہندیہ میں اِسے 1867ء سے 1877ء کے وسطی زمانہ میں کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ اِس اشاعت میں صرف فارسی متن تھا اور حواشی نہیں دیے گئے تھے۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ نے اِسے دو بار شائع کیا۔ اولاً راجا مہندر سنگھ والیٔ ریاست پٹیالہ کی فرمائش پر 1869ء میں شائع کیا۔ دوسری بار اُسی ایڈیشن کو شائع کیا جو سرسید احمد خان کا شائع کردہ نسخہ 1855ء ہے۔ مطبع منشی نول کشور نے دوسرا ایڈیشن اِ1882ء میں شائع کیا تھا

اسلامی قانون کا قیام: اورنگ زیب نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرا کر ملک کے لیے حنفی قانون مہیا کیا۔ انھوں نے اپنے دور حکومت میں اسلام کو ایک غالب قوت بنانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے انھیں احیائے اسلام کی مخالف قوتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ وہ مجددی سلسلے کے پیروکار اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے صاحبزادے کے شاگرد تھے۔ شریعت کے نفاذ میں وہ انہی سے رہنمائی لیتے تھے۔ مورخ کیتھرین براؤن نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کا نام تاریخی اصلاح سے قطع نظر سیاسی اور مذہبی تعصب اور جبر کی علامت کے طور پر بھی مشہور ہے۔ یہ بات جزوی طور پر درست بھی ہو سکتی ہے مگر حقیقتاً اس کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں غیر مسلم عبادت خانے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ہوں اور ان سے ملکی استحکام کو خطرہ لاحق ہو ان کے بارے میں شاہی فیصلے اگر عام مذہبی مقامات سے مختلف ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو ریاستی پالیسی قرار دینا مشکل ہو گا۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں یہ بات بھی منقول ہے کہ انھوں نے عبادت گاہوں کے لیے زمینیں الاٹ کیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے فنڈز فراہم کیے اور مندروں اور گوردواروں کی حفاظت کے اور تعمیر کے لیے احکامات جاری کیے۔ اورنگ زیب نے 1659 اور 1662 میں شریف خاندان کے لیے رقم اور تحائف کے ساتھ مکہ مکرمہ میں سفارتی مشن بھیجے۔ اس نے 1666 اور 1672 میں مکہ اور مدینہ میں تقسیم کرنے کے لیے خیرات بھی بھیجی، مگر کچھ عرصے بعد ان کی مفاد پرستی سے

اور یہ بلاک مین کے نسخہ اول (1867ء سے 1877ء کے وسطی زمانہ) کے مطابق تھا۔ آئین اکبری: مصنف: شیخ ابوالفضل علامی، ایڈیٹر: سر سید احمد خاں، ناشر: سر سید اکیڈمی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، سن اشاعت: 2005، زبان: فارسی، موضوعات: دستور، نصابی کتاب، ذیلی زمرہ جات: غیر افسانوی ادب، صفحات: 762، معاون: ریختہ۔ انگریزی زبان میں پہلی بار فرانسس گلیڈون نے اِس کا ترجمہ کیا جو لندن سے 1800ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس کے بعد دوسرا انگریزی ترجمہ تاریخی و تنقیدی حواشی کے ساتھ سلسلہ کتب ہندیہ میں تین جلدوں کی شکل میں 1868ء سے 1894ء تک بمقام کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔ پہلی جلد کا ترجمہ بلاک مین نے اور دوسری و تیسری جلد کا ترجمہ جیرٹ نے کیا تھا اور ولیم اِروِن نے اِس کا اشاریہ (انڈیکس) مرتب کیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولوی محمد فدا علی صاحب طالب نے کیا تھا اور پہلی مرتبہ اس کی اشاعت 1939ء میں دار الطبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے ہوئی۔ یہ کتاب اردو بک ڈاٹ کام پر دستیاب ہے۔

مایوس ہو کر یہ سلسلہ روک دیا۔[29]

فتاویٰ عالمگیری شہنشاہ کی سعی مسلسل سے معرض وجود میں آیا۔ وہ خود بھی عالم تھے اور انھوں نے علم دین مولانا عبداللطیفؒ، مولانا ہاشم گیلانیؒ اور شیخ محی الدین بن عبداللہ بہاریؒ سے حاصل کیا تھا۔ وہ خط نسخ اور خط نستعلیق کے ماہر اور عمدگی خط میں ضرب المثل تھے۔ تخت نشینی سے قبل انھوں نے اپنے ہاتھ سے ایک مصحف لکھ کر مکہ مکرمہ بھیجا، پھر حکمرانی کے دور میں دوسرا مصحف لکھا، جس پر اس زمانے میں سات ہزار روپیہ کا خرچ آیا اور اُسے مدینہ منورہ بھیجا۔ عالمگیرؒ کو علم حدیث میں بھی کمال حاصل تھا، دورِ حکمرانی سے پہلے ایک کتاب ''الأربعین'' لکھی، اسی طرح کی ایک اور کتاب کتاب زمانۂ بادشاہت میں لکھی، پھر ان دونوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور عمدہ حواشی لگائے۔ بادشاہ ہفتہ میں تین دن مولانا سید محمد حسینی قنوجی، علامہ محمد شفیع یزدی اور نظام الدین برہان پوری رحمہم اللہ کے ساتھ احیاء العلوم، کیمیائے سعادت اور فتاویٰ ہندیہ کا مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ وہ فقہ میں بھی مہارت اور اس کی جزئیات کا استحضار رکھتے تھے۔ انھیں ادب و شعر و شاعری پر بھی دسترس حاصل تھی، لیکن شعر کہنا پسند نہ تھا۔ وہ لوگوں کو بھی اشعار میں وقت ضائع کرنے سے روکتے تھے۔ شہنشاہ متقی، متورع، نماز باجماعت کے پابند اور تہجد گزار تھے۔ جن ایام میں نبی اکرم اسے روزہ رکھنا ثابت ہے، اُن ایام میں روزے رکھنے کا معمول تھا۔ برصغیر میں اسلامی احکام کی نشر و اشاعت میں اُن کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے پچاس برس حکومت کی اور نوے برس عمر میں وفات پائی۔[30] اورنگزیب عالمگیر علمی ذوق کے مالک تھے۔ اُن کا اپنا ذاتی وسیع کتب خانہ تھا، جو ان کے آباء و اجداد کے زمانے سے چلا آرہا تھا، اسی سے فتاویٰ کی ترتیب و تالیف میں علما مدد حاصل کرتے تھے۔ جو علمائے کرام ترتیب فتاویٰ کا کام انجام دے رہے تھے، ان کے علمی مرتبے کے مطابق ان کے لئے وظائف و عطایا کا انتظام کیا گیا تھا۔ اورنگزیبؒ کے زمانے میں علمائے کرام حنفی فقہ کے مطابق فتوے دیتے رہے اور عملی اسلامی زندگی فقہ حنفی کا مظہر ہوا کرتی تھی مگر فقہی ذخیرے میں اختلافِ آرا سے کچھ چیزیں خلط ملط ہو گئی

---

[29] https://ur.wikipedia.org/wiki اورنگ زیب عالمگیر

[30] نزہۃ الخواطر، ج:۶، ص:۳۷۷

تھیں۔ شہنشاہ نے بلند مرتبت علما وفقہا کے اشتراک سے مفتی بہا مسائل جمع کروانے کا عزم کیا تاکہ فتویٰ جاری کرنے میں قاضی اور مفتی صاحبان کو اس موضوع سے متعلق تمام کتب اور مختلف ذخائرِ فقہ کی ورق گردانی کے بغیر سہولت حاصل ہو جائے۔ اس کام کے لیے شہنشاہ نے شیخ نظام الدین برہان پوریؒ کی سرکردگی میں ایک جماعت تشکیل دی جس میں وہ علما اور فضلا مصروفِ کار ہوئے جو دار الخلافہ میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ سلطنتِ ہند کے ہر گوشے میں اطلاعات پہنچا کر اہل علم کو دعوت دی گئی اور سب کو معقول وظائف دیے گئے۔[31] قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ کی تالیف کا آغاز 1077 یا 1078ء میں اور تکمیل 1080 یا 1081ء میں ہوئی۔

برطانوی ہند کے مسلم مفکرین کے دستوری خاکے

علما اور سیاسی مفکرین کی حد تک برصغیر پاک وہند میں اسلامی نظام حکومت کے بارے میں لکھنے لکھانے کا ذوق انگریزی قبضے کے دوران ظاہر ہو گیا تھا۔ مولانا عبد القدیر بدایونی نے 1920ء میں 'مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا واضح خاکہ' گاندھی جی کے نام اپنے مفصل خط میں پیش کیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے سرور اجیہ جمہوریہ (سب کی حکومت والی جمہوریہ) کے عنوان سے ایک دستوری خاکہ مرتب کیا تھا۔ اس میں مذہب کو سرکاری حیثیت دینے کی گنجائش رکھتے ہوئے تمام مذاہب کے احترام اور ان کے پیروکاروں کو سہولیات دینے کا نظام تجویز کیا تھا۔ چودھری رحمت علی مرحوم نے پاکستان کا منصوبہ اور دیگر مسلم ممالک کی تجاویز پیش کی تھیں۔ تحریک ریشمی رومال کے ایک متحرک کارکن مولانا منصور انصاری نے ''حکومت الٰہی: دستور امامت امت'' کے عنوان سے ایک دستور فارسی میں مرتب کیا تھا۔ یہ دستور اور اس کا اردو ترجمہ انھوں نے ''مجلس دستور امت'' کی طرف سے شائع کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس کی اشاعت ''بسلسلۂ تحریک احیائے اجتماعیات اسلام'' ہوئی۔ اس دستور کے مصنف مولانا منصور انصاری کے صاحبزادے مولانا حامد الانصاری غازی (۱۹۰۹ء-۱۶/اکتوبر ۱۹۹۲ء) نے خود بھی اپنے والد گرامی کی خواہش پر ''اسلام کا نظامِ حکومت'' کے

---

[31] عالمگیر نامہ، منشی محمد کاظم بن محمد امین بحوالہ برصغیر میں علم فقہ، ص: 281

عنوان سے ایک کتاب لکھی جو پہلی مرتبہ ندوۃ المصنفین، فرول باغ، دہلی سے ۱۹۴۵ء کے اوائل میں شائع ہوئی۔[32]

پھر تحریکِ پاکستان کے دوران 1940ء میں قرار دادِ پاکستان پاس ہوئی تو اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ ممالک متحدہ (United Provinces) کی صوبائی تنظیم نے روایتی علما اور جدید محققین سے دو کتابیں مرتب کروانے کا اعلان کیا۔ ایک ''اسلام کا سیاسی نظام'' اور دوسری ''اسلام کا اقتصادی نظام''۔ اس سے نوعیت دستور کی ایک بحث چھڑ گئی جس میں مولانا عبد الماجد دریابادی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی اور مولانا مودودی کے تصوراتِ دستور زیر بحث آئے۔ وقتاً فوقتاً مسلم لیگ کی طرف سے دستور کی نوعیت پر کچھ بیانات آتے رہے۔ یہ بیانات زیادہ تر مولانا عبد الماجد دریابادی کے ہفت روزہ رسالہ ''صدق'' میں شائع ہوتے رہے اور مولانا مودودی کے مضامین اور آرا ترجمان القرآن میں چھپتے رہے۔ راقم نے یہ سب جمع کر کے اپنی کتاب ''قرار دادِ پاکستان اور ابتدائی دستوری تصورات'' میں مرتب کر دیے ہیں۔ یہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن سے شائع ہو چکی ہے۔ ان مباحث کے بعد یو پی مسلم لیگ نے ایک عملی قدم اٹھایا اور دار العلوم ندوۃ العلما لکھنو جا کر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ یہ کتابیں اپنی قیادت میں مرتب کرائیں۔ اس سلسلے میں 4 جنوری 1941ء کو ندوۃ العلما میں اجلاس ہوا جس میں مسلم لیگ کی طرف سے نواب محمد اسماعیل خان صدر صوبائی مسلم لیگ ممالکِ متحدہ اور چودھری خلیق الزماں شریک تھے اور سید سلیمان ندوی صاحب کے علاوہ کئی علما بھی موجود تھے۔ اس اجلاس میں ایک سید سلیمان ندوی صاحب کی سربراہی میں ایک ''مجلس نظامِ اسلامی'' قائم کی گئی اور یہ دونوں کتابیں تیار کرانے کی درخواست کی گئی۔ سید صاحب نے ملک کے کئی علما کو دستوری خاکے تیار کرنے کے لیے خط لکھے، صرف 4 علما کی طرف سے خاکے یا دستوری تصورات موصول ہوئے۔ سید صاحب نے ان کی بنیاد پر مسودہ تیار کرنے کا کام مولانا حکیم محمد اسحاق سندیلوی مدرس ندوۃ العلما لکھنو ذمے لگایا۔ انھوں نے بہت جلد مسودہ مکمل کر دیا اور اسے مختلف علما

---

[32] ان دساتیر کی تفصیل اور حوالے راقم کی زیر طباعت کتاب ''اسلام کا سیاسی نظام: تاریخی ارتقا اور تجزیاتی مطالعہ'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

کے پاس نظر ثانی کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کام کی روداد مسلسل معارف اعظم گڑھ میں سید صاحب کے شذرات کے ضمن میں چھپتی رہی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے صدق میں بھی اس کی خبر آتی رہی، مگر نہ معلوم وجوہات کی بنا پر علما کی نظر ثانیوں کا احوال معلوم نہیں ہو سکا اور اس کے بعد کافی عرصے تک اس مسودے کا ذکر بھی غائب ہو گیا۔ 1957 میں شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے ''اسلام کا سیاسی نظام'' تالیف مولانا محمد اسحاق سندیلوی کے نام سے اسے شائع کیا، اور پھر 1980ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان نے بھی اسے شائع کیا۔ راقم نے یہ ساری روداد جمع کر کے ایک دوسری کتاب بعنوان ''قراردادِ پاکستان اور نظامنامۂ حکومتِ اسلامی'' تیار کی۔ جن علما کے نام اس کتاب کی تالیف کے ضمن میں منقول تھے ان کا تعارف اور علمی مقام بھی اس کتاب کا حصہ بنا دیا اور آخر میں مولانا اسحاق سندیلوی صاحب کی اس کتاب کا مختصر سا دستوری مطالعہ اس طرح کیا کہ دستور پاکستان 1956ء میں اس کے اثرات کو تلاش کیا جا سکے۔ راقم کی یہ کتاب بھی بسلسلۂ ''مطالعۂ دستوریاتِ پاکستان'' نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کر دی۔

مولانا سندیلوی کے اس مسودے کے بعد بھی دستورِ پاکستان 1956 تک دستور کی تیاری کا علمی اور فکری کام جاری رہا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے کچھ کام 'مجلسِ تعمیرِ ملی'، 'مجلسِ عمل (Working Committee)' اور 'کمیٹی آف رائٹرز' کے ذمے بھی لگایا تھا آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عمل نے ایک دستوری سوالنامہ بھی تیار کر کے علما میں تقسیم کیا تھا اور بعض علما نے اس کے جوابات بھی دیے تھے۔ مولانا مودودی نے یہ سوالنامہ اور اس کے جوابات اس زمانے میں ترجمان القرآن میں شائع کیے۔ کمیٹی آف رائٹرز کی طرف سے اُس زمانے میں ''مسئلۂ پاکستان'' پر 12 مختصر رسالے مختلف قائدین تحریک پاکستان نے لکھے تھے اور شیخ محمد اشرف ناشران کتب لاہور نے 1946 میں شائع کیے تھے۔ ان میں زیادہ تر جدید اسلامی ریاست کے دستوری مسائل ہی زیرِ بحث آئے تھے۔

علامہ محمد اسد (سابق Leopold Weiss) نے اپنے ماہنامہ رسالہ ''عرفات'' میں جولائی 1947 اور مارچ 1948ء میں اسلامی دستور کے اصول مرتب کر کے شائع کیے تھے۔ پھر مئی 1948ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی درخواست پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور مولانا مناظر احسن گیلانی ہندوستان سے تشریف

لائے تھے اور کئی دیگر علما کے ساتھ مل کر اس وقت کے دار الحکومت کراچی میں دستورِ اسلامی کے بنیادی نکات مرتب کر کے حکومت کے حوالے کیے تھے۔ مارچ 1949ء میں قراردادِ مقاصد پاس ہوئی تو دستور کو اس قرار داد کے مطابق بنانے کے لیے مجلس دستور ساز پاکستان نے ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی'' تشکیل دی۔ اس کی کئی ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں اور ایک ''بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ'' تشکیل دیا گیا۔ اس بورڈ کا مقصد دستور کو قراردادِ مقاصد کے دائرے کے اندر اندر رکھنے کے لیے بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور ذیلی کمیٹیوں کے سوالوں کے جواب دینا اور اپنے طور پر انھیں تجاویز دینا تھا۔ اس بورڈ کے سربراہ سید سلیمان ندوی تھے اور سیکرٹری مولانا ظفر احمد عثمانی تھے۔ مفتی محمد شفیع صاحب اور مفتی جعفر حسین مجتہد اور دو جج صاحبان اس کے ممبر تھے۔ یہ بورڈ دستور جاری ہونے تک قائم رہا اور اپنا کام کرتا رہا۔ دستورِ پاکستان 1956ء کی تشکیل میں اس بورڈ کا بہت حد تک عمل دخل رہا، اگرچہ ان کی سب باتیں تسلیم نہیں کی گئیں مگر اس کا دینی رُخ انہی کی مشاورت سے طے کیا گیا۔ باقی دونوں دساتیر اور درمیان میں 1972 کا عبوری دستور در اصل دستور 1956 کے بنیادی اصولوں پر قائم ہوئے۔ ہر مجلس دستور ساز یا دستور ساز کمیشن نے جو اضافے یا تبدیلیاں کیں ان کے باوجود اس کے بنیادی مندرجات وہی رہے جو بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ سے مشاورت کے ساتھ طے ہوئے تھے۔

اب اگر ہم مسلم ممالک میں دستوری بحران کی بات کریں اور پاکستان کو بطورِ مثال لیں تو راقم کے خیال میں پاکستان کی اصل دستوری تاریخ کا مطالعہ کرنے اور اسے زیر بحث لانے سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔

عصر حاضر میں اسلامی دساتیر کی کاوشیں

خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد مختلف اسلامی تنظیموں، سکالرز اور اسلامی تحریکوں نے اسلامی اقدار پر مبنی مختلف آئینی مسودات تیار کیے تاکہ اسلامی ریاست کے قیام کا ایک عملی نمونہ فراہم کیا جاسکے۔ یہ منشور مسلم معاشروں کے لیے شریعت کے مطابق ایک ایسا حکومتی ڈھانچہ فراہم کرنے کی کوشش ہیں جو اسلامی قوانین اور اقدار پر قائم ہوں۔

ان اسلامی دساتیر کو متعلقہ تنظیموں اور مقاصد کی بنیاد پر مختلف انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ دساتیر مختلف اسلامی تحریکات اور تنظیموں نے پیش کیے، جن میں زیادہ تر کا مقصد اسلامی قوانین کو ایک جامع آئینی ڈھانچے میں سمونا تھا۔ یہ مختلف نوعیت کے مقاصد، سماجی نظریات، اور سیاسی افکار کو سامنے رکھتے ہوئے تشکیل دیے گئے ہیں۔ اس درجہ بندی اور تجزیے سے ہمیں ان کی نوعیت اور کردار کو بہتر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

(ا) شرعی دساتیر

شرعی دساتیر میں بنیادی طور پر اسلامی شریعت کو ریاستی قوانین اور آئینی ڈھانچے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کے دساتیر میں ریاست کے تمام شعبہ جات کو اسلامی قوانین اور شرعی اقدار کے تابع قرار دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پہ اسلامی کونسل آف یورپ کا آئینی خاکہ۔[33] 1983 میں شائع ہونے والا یہ آئینی خاکہ اسلامی ریاست کے ڈھانچے میں اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتا ہے اور شریعت کو قانونی نظام کی بنیاد بناتا ہے۔ اس میں مقننہ، عدلیہ، اور انتظامیہ کے اصول اسلامی نقطہ نظر سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس دستاویز میں اللہ کے قوانین کو انسانی قانون سازی سے بلند تر قرار دیتے ہوئے ایک خاص ضابطۂ حیات

[33] A Model of an Islamic Constitution

کی وضاحت کی گئی ہے۔

اس طرح کا شرعی آئینی ماڈل ایک مکمل اسلامی ریاست کا خاکہ پیش کرتا ہے جو صرف مسلم اکثریتی علاقوں میں ہی موثر ہو سکتا ہے اور اس کی کامیابی کا انحصار عوام میں شرعی اقدار کی مقبولیت پر ہے۔

(۲)انسانی حقوق پر مبنی اسلامی دساتیر

اس نوعیت کے دساتیر میں اسلامی انسانی حقوق اور ان کے نفاذ پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ دساتیر انسانی حقوق کو اسلامی شریعت کی روشنی میں بیان کرتے ہیں اور ان میں زیادہ زور شریعت کے دائرے میں رہ کر حقوق کی فراہمی اور ان کی حفاظت پر ہوتا ہے۔

جیسا کہ قاہرہ کا اسلامی انسانی حقوق کا اعلامیہ۔[34] یہ OIC کی جانب سے جاری کردہ ایک اہم اعلامیہ ہے جو انسانی حقوق کے اصولوں کو اسلامی نظریہ کے مطابق وضع کرتا ہے۔ اس میں بنیادی حقوق جیسے مساوات، تعلیم، اور انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس اعلامیہ میں انسانی حقوق کو اسلامی تعلیمات کے تناظر میں رکھا گیا ہے جس کا مقصد اسلامی دنیا میں مغربی انسانی حقوق کے نظام سے الگ ایک اصولی فریم ورک فراہم کرنا ہے۔

(۳)اسلامی اقتصادی دساتیر

ان دساتیر کا مقصد اسلامی اصولوں پر مبنی اقتصادی نظام اور سود سے پاک بینکاری کو فروغ دینا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پہ 'اسلامی ترقیاتی بینک کے مالیاتی اصول' کا منشور۔ اسلامی ترقیاتی بینک (IDB) نے اسلامی اقتصادی نظام کو فروغ دینے کے لیے حلال سرمایہ کاری اور سود سے پاک بینکاری کا نظام پیش کیا ہے۔ اس آئینی خاکے میں اسلامی اصولوں کے مطابق مالیات اور سرمایہ کاری کی رہنمائی کی گئی ہے۔

[34]Cairo Declaration on Human Rights in Islam

(۴)سیاسی اسلامی دساتیر

سیاسی اسلامی دساتیر میں ریاست کے مختلف شعبوں اور ان کے اختیارات کی تقسیم کو اسلامی اصولوں کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ ان دساتیر میں اسلامی طرز حکمرانی، انتخابی عمل، اور عدلیہ کے کردار پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

جیسا کہ اخوان المسلمون کا آئینی ماڈل۔ اخوان المسلمون نے اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ایک آئینی ماڈل پیش کیا جس میں اسلامی حکومتی ڈھانچے، اسلامی عدلیہ، اور قانون سازی کے اصولوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ماڈل میں اسلامی نظام حکومت میں عوامی شرکت اور شریعت کی بالادستی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اخوان المسلمون کا یہ ماڈل سیاسی اور مذہبی اصولوں کا ایک مجموعہ ہے جو مسلم ممالک میں اسلامی جمہوریت کو فروغ دینے کا ایک تصور دیتا ہے۔

(۵)سماجی اسلامی دساتیر

ان دساتیر میں مسلم سماج کے عمومی اصول اور اخلاقیات کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ان کا مقصد اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک مثالی اسلامی سماج تشکیل دینا ہے۔

جیسا کہ میثاق مکہ۔[35] 1981 میں جاری ہونے والا میثاق مکہ اسلامی معاشرتی اصولوں، اتحاد، اور حقوق و فرائض کو بیان کرتا ہے۔ اس میں اسلامی سماج کے اخلاقی اصولوں کو سماجی سطح پر فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ میثاق مکہ اسلامی سماجی اصولوں کا نظری فریم ورک تو فراہم کرتا ہے، مگر اس کے براہ راست سیاسی اور قانونی نفاذ کا خاکہ فراہم نہیں کرتا۔ اس کا استعمال زیادہ تر دعوتی سطح پر مختلف معاشروں میں عوامی سطح پر اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے لیے کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی دساتیر کا نفاذ

اسلامی تنظیموں کی جانب سے پیش کیے جانے والے دساتیر مختلف مقاصد اور فریم ورکس کے تحت تیار کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ مکمل اسلامی ریاستی ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں جبکہ کچھ مخصوص شعبوں

[35]Makkah Charter

میں اسلامی اصولوں کے اطلاق کا طریقہ بتاتے ہیں۔ان دساتیر کا مقصد اسلامی معاشرتی اصولوں اور عدل وانصاف پر مبنی ریاستی نظام کی تشکیل ہوتا ہے، مگران کے نفاذ میں مختلف نوعیت کے چیلنجز پیش آ سکتے ہیں،اور یہی وجہ ہے یہ دساتیر عملی سطح پر اتنے کامیاب ومقبول نہیں ہوئے۔

مسلم دنیا کی ہر ریاست میں الگ الگ سیاسی، سماجی،اور قانونی ڈھانچے ہیں۔ بعض ممالک میں بادشاہت یا موروثی حکمرانی کا نظام ہے، جبکہ بعض میں جمہوریت یا نیم جمہوری نظام رائج ہیں۔اس تنوع کے باعث ایک اسلامی دستور کو ہر ملک میں یکساں طور پر نافذ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ نتیجتاً، بعض اصول کسی ریاست میں نافذ کیے جاسکتے ہیں مگر کسی دوسری ریاست میں انہیں قبول نہیں کیا جاتا۔

اسلامی دساتیر اور بین الاقوامی چارٹر

اسی طرح، اسلامی دساتیر میں بعض ایسے اصول شامل ہوتے ہیں جو مغربی قوانین یا بین الاقوامی انسانی حقوق کے چارٹرز سے مطابقت نہیں رکھتے۔ جیسے سزا کا نظام، وراثت کے اصول، اور دیگر سماجی و معاشرتی امور۔اسلامی قوانین کے مطابق بعض جرائم کے لیے سزائیں مغربی قوانین سے سخت ہیں، جیسے چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا یا زنا کے لیے سنگساری۔ان سزاؤں کا اطلاق اکثر عالمی سطح پر تنقید کا باعث بنتا ہے اور مختلف بین الاقوامی معاہدات سے مطابقت نہیں رکھتا۔اسلامی اقتصادی اصول مثلاً سود کی حرمت جدید بین الاقوامی معاشی نظام سے متصادم ہیں۔ بینکنگ، مالیات،اور بین الاقوامی سرمایہ کاری کے جدید نظام سود پر مبنی ہیں، جبکہ اسلامی دستور اس سے بچنے کا تقاضا کرتا ہے۔اسلامی مالیات کے اصولوں پر مکمل عملدرآمد بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے تعاون میں مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ پاکستان جیسے ممالک میں اسلامی بینکنگ نظام کا اجرا تو کیا گیا ہے، مگر مکمل طور پر سودی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں ہو سکا کیونکہ بین الاقوامی تجارت اور مالیاتی معاہدات میں سود کا کردار اہم ہے۔اب حال ہی میں پاکستان کی چھبیسویں آئینی ترمیم میں سود کے خاتمے کی ڈیڈ لائن دی گئی ہے۔

دستور اور متنوع فکری و مسلکی مسائل

مسلم دنیا میں مختلف فقہی مسالک موجود ہیں جیسے حنفی، شافعی، مالکی،اور حنبلی۔ان مسالک کے اصول اور فتاویٰ بعض معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جس کے باعث ایک یکساں اسلامی دستور

بنانااور اس پر عملدر آمد کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ایک اسلامی دستور میں اگر کسی مخصوص فقہی مسلک کی ترجیحات شامل کی جائیں تو ممکن ہے کہ دوسرے مسالک کے پیروکار اسے قبول نہ کریں، جس سے داخلی اختلافات جنم لے سکتے ہیں۔

اور یہ بھی کہ ،اسلامی ریاست کے قیام کے تصور کو عالمی سطح پر سیاسی مخالفت کا سامنا ہوتا ہے۔ بعض طاقتور ممالک اسلامی ریاست کے تصور کو اپنے سیاسی یا سیکیورٹی مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں، جس کے باعث اسلامی دساتیر پر عملدر آمد کے لیے بین الاقوامی تعاون حاصل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

اسلامی دساتیر میں بعض قوانین جدید انسانی حقوق کے تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، جیسے خواتین کے حقوق، اقلیتوں کے حقوق، اور آزادئ اظہار۔ جدید انسانی حقوق کی تحریکوں میں ان مسائل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، مگر اسلامی دساتیر بعض معاملات میں شریعت کے تحت ان پر قدغن لگا سکتے ہیں۔

ایسے ہی،ان دساتیر کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عوام میں اسلامی اصولوں اور قوانین کے حوالے سے اتفاق نہ ہو۔

اسلامی کونسل آف یورپ کا دستوری خاکہ

اسلامی دستور کے جو رجحانات بیسویں صدی میں سامنے آئے،ان میں سے ایک اہم ادارے کے مجوزہ دستوری خاکے کا تذکرہ دلچسپی کا حامل ہے۔ لندن میں قائم اسلامک کونسل آف یورپ کے نام سے معروف اس ادارے نے سن 80 کی دہائی میں اہل علم اور علمائے سیاسیات کی قابل ذکر توجہ حاصل کی۔ 1983ء میں اس ادارے کے سیکریٹری جنرل جناب سالم عزام(Salem Azzam) نے اسلام آباد میں ایک کانفرنس منعقدہ16دسمبر 1983ء میں اسلامی دنیا کے سامنے ایک اسلامی دستور کا خاکہ (A Model of an Islamic Constitution)پیش کیا۔ یہ خاکہ اس تنظیم کی طرف سے سامنے آیا تھا۔اس کے حصہ تعارف میں اس کی تدوین میں شریک افراد یاداروں کے نام دینے کی بجائے صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ''اس دستاویز کی تدوین کئی مسلم اسکالرز، فقہاء، مدبرین اور اسلامی تحریکوں کے

نمائندوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے"۔[36]

اسلامی دستور کے اس خاکے کا متن 33 مختصر صفحات پر پھیلا ہوا ہے، دیباچہ اس کے علاوہ ہے۔ اس خاکے کے اپنے بیان کے مطابق "یہ خاکہ ایک اسلامی دستور کے لیے لازمی عناصر اصولوں پر مشتمل ہے۔ باقاعدہ اور مخصوص فنی طریق کار سے متعلقہ جزئیات اور تفصیلات اس توقع کے ساتھ دانستہ چھوڑ دی گئی ہیں کہ ریاستیں انفرادی طور پر اپنی خصوصی ضروریات اور ترجیحات سامنے رکھتے ہوئے کام کریں گی"[37]۔

یہ خاکہ مسلم اُمہ کو ایک خاص دائرے کی طرف لے جانے کی ایک مفید کوشش تھی۔ اس میں مسلمان ریاستوں سے توقع کی گئی تھی کہ وہ ابتداً اس خاکے کو اختیار کریں گیں، پھر اپنی ضرورتوں اور ترجیحات کے مطابق جزئیات اور تفصیلات طے کر لیں گیں۔ اس کی تیاری میں امریکی کانگریس کی قانون سازی والا اسلوب اپنایا گیا ہے جس کے تحت وفاقی قانون اس طرح بنایا جاتا ہے کہ ریاستوں سے متعلق جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ ہر ریاست خالی جگہ پر اپنے کوائف درج کر کے اسے اپنے قانون سازی کے عمل سے گزار کر اختیار کر لیتی ہے۔

87 آرٹیکل پر مشتمل اس دستوری خاکے میں 15 مقامات کو خالی (------) چھوڑا گیا ہے تاکہ انہیں مسلم ریاستیں اپنے حالات کے مطابق پر کر لیں۔

تقریباً نصف صدی کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اس قابل قدر دستاویز کو اسلامی ریاستوں میں معمولی سی پذیرائی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ گویا اس دستاویز کو علمی کاوش ہی کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ تاہم جہاں تک اس کے مندرجات کا تعلق ہے تو اس میں اسلامی دستور کے لیے بڑی مضبوط اور توانا فکر موجود ہے۔ اس کے پہلے باب کے پہلے آرٹیکل میں کم و بیش وہی بات ہے جو قرارداد مقاصد میں ہے۔

Sovereignty belongs to Allah alone, and the Shariah is paramount.

---

[36] A Model of an Islamic Constitution, Islamic Council of Europe, 16 Grosvenor, Crescent, London SW1, 1983, p-iv.

[37] Ibid, p-2

یعنی ''اقتدار اعلی صرف اللہ ہی کو سزاوار ہے اور شریعت کو بالادستی حاصل ہے''۔

آرٹیکل کے اگلے حصے میں کہا گیا ہے کہ شریعت سے مراد قرآن و سنت ہے جو قانون سازی اور پالیسی کے ماخذ ہیں۔ اتھارٹی لوگوں کے پاس ایک امانت ہے جسے وہ شریعت کے مطابق چلاتے ہیں۔

اس ماڈل دستور کی ابتدا تسمیہ سے ہوتی ہے پھر قرآن کی دو آیات دی گئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا۔[38]

(اے نبی) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے، اس کے مطابق لوگوں کے مابین فیصلہ کرو۔ تم بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو۔

یہ دستور کل 14 ابواب میں 87 آرٹیکل پر پھیلا ہوا ہے جس کی ابتدا میں دیباچہ بھی ہے۔

پہلے باب میں اختیارات کی بنیاد اور معاشرے کی اٹھان کا تذکرہ ہے۔ آغاز میں اللہ کے اقتدار اعلی کا ذکر ہے، اس کے بعد شریعت کی بالادستی کا اقرار ہے۔

دوسرے باب میں فرائض و حقوق کا بیان ہے۔

تیسرے باب میں مجلس شوری (Parliament) کی ساخت بتائی گئی ہے۔ ارکان کی تعداد اور دورانیہ طے کرنا متعلقہ ملک کی صوابدید پر رکھا گیا ہے۔ اس کے فرائض میں شریعت کے مقاصد کو فروغ دینے کے لیے قانون سازی کرنا ہے جسے ایک علماء کونسل کی رہنمائی سے مشروط رکھا گیا ہے۔ مالیاتی اور میزانیے سے متعلق امور اس مجلس کے ذمہ قرار دیئے گئے۔

چوتھے باب میں سربراہ ریاست کو امام (Chief Executive) کہہ کر حاشیے میں صراحت کی گئی کہ امام کی بجائے امیر، صدر جیسا کوئی اور لفظ بھی اپنایا جاسکتا ہے۔

پانچواں باب عدلیہ کے متعلق ہے جس میں بلا معاوضہ عدل کی ضمانت ہے۔ عدالتی کاروائی کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کھلے عام ہوگی۔ خصوصی عدالتوں کا امتناع ہے۔

---

[38] النساء:105

اگلے باب میں اسلام کے ایک اہم ادارے ''حسبہ'' کا ذکر ہے جس کے متعلق بعض بنیادی امور ملتے ہیں۔

ساتویں اور آٹھویں باب میں اقتصادیات اور دفاع سے متعلق امور کا بیان ہے۔

اس سے اگلے باب میں ایک سپریم دستوری کونسل کا ذکر ہے جس کا کام دستور کا تحفظ ہے۔

دسویں باب میں کونسل آف علماء کے نام سے ایک عدالتی اجتہادی ادارہ ہے جس کا کام شرعی امور میں مجلس شوریٰ کی مدد کرنا ہے۔اسی طرح الیکشن کمیشن، ذرائع ابلاغ اور نشرواشاعت کے متعلق اور آخر میں کچھ عمومی اور عبوری شقیں ہیں۔

اسلامی کونسل آف یورپ کے اس ماڈل میں سب سے پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔اس آئینی ماڈل کے مطابق، کوئی بھی قانون یا حکم تب تک نافذ العمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ قرآن وسنت کے اصولوں کے مطابق نہ ہو۔

اس میں حکومت کے تین بنیادی اداروں کی تفصیل بھی دی گئی ہے: مقننہ، عدلیہ، اور انتظامیہ۔اس آئینی ماڈل میں اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر ادارے کے اختیارات کو واضح کیا گیا ہے اور ان کے اختیارات کے دائرے کو شریعت کی حدود میں رکھا گیا ہے۔

مقننہ کو قانون سازی کے عمل میں قرآن وسنت کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے، یعنی یہ اسمبلی خود سے کوئی ایسا قانون پاس نہیں کر سکتی جو شریعت کے خلاف ہو۔عدلیہ کا کردار یہ ہے کہ وہ ریاستی قوانین اور عوامی حقوق کی حفاظت کرے، اور یہ بھی شریعت کی پابندی کے تحت عمل میں آئے۔انتظامیہ کا فرض ہے کہ وہ ریاستی معاملات کو شریعت کی روشنی میں چلائے اور ہر قسم کی ناانصافی کا سدباب کرے۔

اس آئین میں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔مسلمانوں کے لیے اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی اور مواقع فراہم کیے گئے ہیں، جبکہ غیر مسلموں کے لیے ریاست میں مذہبی آزادی اور ان کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

انفرادی حقوق کے زمرے میں بنیادی انسانی حقوق جیسے کہ آزادی، مساوات، اور انصاف پر زور دیا گیا

ہے۔ یہ آئین کہتا ہے کہ ہر شہری کو شریعت کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ سماجی اور معاشی حقوق کا بھی تذکرہ موجود ہے، جس میں خاص طور پر زکوٰۃ، صدقات، اور اقتصادی مساوات کے اصول کو نمایاں کیا گیا ہے تاکہ معاشرتی انصاف کو یقینی بنایا جاسکے۔

یہ آئین واضح کرتا ہے کہ حقوق اور فرائض میں توازن پیدا کیا جانا چاہیے اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کے حقوق کا احترام کرتے ہوئے ان کے فرائض کو پورا کرے۔

قانون سازی کا طریق کار

اسلامی دستور کے ماڈل میں قانون سازی کا طریقہ کار بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، اسلامی ریاست میں جو بھی قانون سازی ہو گی، وہ قرآن و سنت کے اصولوں پر مبنی ہو گی۔ قانون سازی کے عمل میں علماء اور ماہرینِ شریعت کی رہنمائی کو اہمیت دی گئی ہے تاکہ قوانین اسلامی اصولوں سے مطابق ہوں۔ اس دستاویز میں علماء اور فقہاء کی ایک ایسی کونسل کا تصور دیا گیا ہے جو قانون سازی کے عمل میں حکومت کو مشاورت فراہم کرے گی اور اس بات کو یقینی بنائے گی کہ قوانین شریعت سے متصادم نہ ہوں۔

قانون سازی کے اس نظام میں ریاست کی ساخت کو اس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر قانون کا مقصد اسلامی تعلیمات کا فروغ اور معاشرتی انصاف کی فراہمی ہو۔

عدلیہ کی آزادی

دستور میں عدلیہ کی آزادی کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ عدلیہ کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اسلامی قوانین کے مطابق انصاف فراہم کرے۔ اس آئین میں عدالتوں کے قیام اور ان کے دائرہ اختیار کو واضح کیا گیا ہے تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کو آزادانہ طور پر انجام دے سکے۔ یہ بات خاص طور پر بیان کی گئی ہے کہ عدلیہ کسی بھی قسم کے دباؤ سے آزاد ہونی چاہیے اور کسی بھی طرح کے غیر اسلامی قوانین یا احکام کی پیروی نہیں کرے گی۔

حکومت کی ذمہ داریاں

دستور کے اس ماڈل میں حکومت کی مذہبی اور سیاسی ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا ہے۔ اس آئین کے تحت، حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرتی انصاف، اقتصادی مساوات، اور اسلامی اصولوں کے مطابق عوامی فلاح و بہبود کے نظام کو یقینی بنائے۔ حکومت کو اسلامی تعلیمات کے فروغ، عوام کی خدمت، اور ان کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

اس دستاویز میں واضح کیا گیا ہے کہ غیر مسلم اقلیتوں کو ان کے مذہبی معاملات میں مکمل آزادی دی جائے گی اور ان کے حقوق کا احترام کیا جائے گا۔ یہ آئینی ماڈل اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق کی ضمانت دی جانی چاہیے اور ان کو دوسرے شہریوں کے برابر حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔

اس ماڈل کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ یہ اسلامی ریاست کا ایک جامع تصور فراہم کرتا ہے، مگر اس کے نفاذ کی راہ میں عملی چیلنجز موجود ہیں، خاص طور پر اس دور میں جب عالمی سطح پر مختلف قسم کے سیاسی اور سماجی نظریات کا غلبہ ہے جو عوامی اور سیاسی بنت کا حصہ بن گئے ہیں۔

اسلامی کونسل کے مجوزہ دستور پر ناقدانہ نظر

اس مجوزہ دستور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مرتب کرنے والے دین اسلام سے جذباتی حد تک لگاؤ رکھتے ہیں۔ جس جگہ اور جہاں پر جس کو جیسا موقع ملے، مقصد حیات کے لیے کچھ گزرنے کا حوصلہ اس کوشش میں نظر آتا ہے۔ تاریخی طور پر یہ ایک قیمتی دستاویز ہے جو ہزاروں کی تعداد میں لائبریریوں کی زینت بن چکی ہے۔ اس دستاویز کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ اسلام کے لیے تڑپ اور کچھ کر گزرنے کی خواہش اس پوری دستاویز میں موجود ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سیاسی سطح پر درجنوں مسلمان ممالک میں اس دستور کو معمولی پذیرائی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ حکومتوں کی ضروریات و ترجیحات کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں جن کی کتر بیونت میں لاتعداد عوامل کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے اس پر عدم توجہی کا مظاہرہ بعید از

فہم نہیں ہے۔ لیکن علمی سطح پر بھی اس قابل قدر دستاویز نے کوئی قابل ذکر توجہ حاصل نہیں کی۔ سیاسیات شرعیہ کے طالب علموں کو اس کے اس پہلو پر توجہ کرنا چاہیے۔

سرسری سی نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دستور کی تیاری میں اسلامی تحریکوں کا مزاج تو قدم قدم پر دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اس میں عہد حاضر کی دستوری و قانونی زبان مفقود ہے۔ وہ زبان جو عدالتوں اور حکومت کے لب و لہجے میں ہو اور جس سے کاروبار مملکت چلایا جاتا ہو، وہ اس میں نہیں ملتی۔ مثلاً حدیث "لاطاعۃفی معصیۃ" میں مذکور حکم کوئی ایسی سادہ سی بات نہیں ہے جسے کسی دستور کے ایک جملے میں سمو کر دوسرا موضوع چھیڑ دیا جائے۔ امام کی اطاعت کے لیے اس مجوزہ دستور کا ایک آرٹیکل 26 ہے جس کی عبارت ملاحظہ ہو:

The Imam is intitled to obedience by all persons even if their views differ from his. There is, however, no obedience if it involves disobedience of Allah and His Prophet (peace be upon him).

ترجمہ: امام تمام لوگوں سے اطاعت کا استحقاق رکھتا ہے، چتی کہ اگر ان کے خیالات امام سے مختلف ہوں تب بھی۔ تاہم اگر اس اطاعت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی آجائے تو کوئی اطاعت نہیں۔

اتنی اہم حدیث ایک سادہ سے انداز میں بیان کر کے عام مسلمانوں کو آزادی فکر و عمل دی جارہی ہے، اگر اسے عمل کی چھلنی سے گزارا جائے تو اس دستور کے تحت کوئی بھی شخص یا ریاستی ادارہ ذرا ذرا سے جواز کا سہارا لے کر نافرمانی کی اس دستوری شق کی چھتری تلے آسکتا ہے۔ مثلاً آج کل حکومتیں اپنی سیاسی مصلحتوں اور بین الاقوامی معاہدات کے تحت اپنی فوجیں دیگر مسلم غیر مسلم ممالک میں بھیجتی رہتی ہیں۔ ہر مسلم ملک کے اندر طرح طرح کے انداز فکر رکھنے والے افراد اور تنظیمیں اپنے اپنے انداز فکر کی ترویج کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا میلان کسی ایک پڑوسی ملک کی طرف ہو سکتا ہے۔ ان اختلافات میں مذہبی تشریحات کا بھی سہارا لے لیا جاتا ہے جو مختلف بھی ہوتی ہیں۔ اس طرح عدم استحکام کو ختم نہیں کیا جاسکے گا۔

'اسلامی تمدن میں آئینی بحران'

علامہ مختار الشنقیطی

مختار الشنقیطی موریطانیہ سے تعلق رکھنے والی عرب دنیا کی ایک اہم علمی شخصیت ہیں، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور جامعہ قطر میں استاد ہیں۔ انہوں نے مسلم دنیا میں دستور سازی سے جڑے مسائل پر ایک اہم کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ہے 'الأزمة الدستورية في الحضارة الإسلامية'۔ ذیل میں ان کی کتاب کا تعارف اور کچھ اہم مباحث کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ 'اسلامی تمدن میں آئینی بحران' کے نام سے جناب محی الدین غازی نے کیا ہے۔

آئینی بحران سے مراد

مختار شنقیطی کے ہاں 'آئینی بحران' کا تصور ایک وسیع اور گہرے معنوں میں سامنے آیا ہے، جو محض قانونی معاملات تک محدود نہیں ہے بلکہ مسلم معاشروں میں آئینی فکر اور سماجی ڈھانچوں کے بنیادی بحران کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ ان کے مطابق، یہ بحران بنیادی طور پر مسلم دنیا میں ریاست، شریعت، اور شہری حقوق کے درمیان عدم توازن کا نتیجہ ہے، جس نے مسلم معاشروں میں سیاسی اور قانونی استحکام کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

مصنف اس بحران کی جڑوں کو ان تاریخی مراحل اور فکری تبدیلیوں میں تلاش کرتے ہیں جنہوں نے مسلم دنیا کے آئینی ڈھانچوں کو کمزور کیا۔ مثلاً کالونیل دور اور اس کے بعد کے سیکولر اثرات۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اسلامی تہذیب میں ابتدا سے ایک ایسا سیاسی اور قانونی نظام موجود تھا جو اسلامی شریعت اور عوامی شرکت پر مبنی تھا، لیکن تاریخی حالات نے اس توازن کو بگاڑ دیا۔

مختار شنقیطی 'آئینی بحران' کی اصطلاح کو مسلم معاشروں میں شریعت اور جدید آئینی تقاضوں کے درمیان عدم موافقت کے اظہار کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مطابق، مسلم دنیا میں

موجودہ آئینی ڈھانچوں میں شرعی اقدار کا نفاذ یا تو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا انہیں ایک رسمی حیثیت دے دی گئی ہے، جس سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو مسلم معاشروں میں معاشرتی، سیاسی اور قانونی ناانصافیوں کا باعث بنتا ہے۔

آئینی بحران کے اس وسیع تصور میں الشنقیطی یہ واضح کرتے ہیں کہ یہ بحران ایک نظریاتی مسئلہ بھی ہے، کیونکہ یہ مسلم معاشروں کی شناخت اور نظریات کو براہِ راست چیلنج کرتا ہے۔

اس طرح شنقیطی کی نظر میں 'آئینی بحران' مسلم معاشروں میں ایک ایسے متوازن آئینی ماڈل کی عدم موجودگی کی طرف اشارہ ہے جو اسلامی شریعت، شہری حقوق، اور ریاستی اقتدار کے مابین ہم آہنگی قائم کر سکے۔

دستور کا وسیع مفہوم

مختار شنقیطی کی کتاب میں 'دستور' کا مفہوم بھی آئین کے روایتی مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ ان کے نزدیک 'دستور' محض عمرانی و قانونی دستاویز نہیں، بلکہ یہ اسلامی تہذیب کے بنیادی اصولوں، روایات، اور عوامی حقوق و فرائض کا ایک جامع فریم ورک ہے جس پر ایک اسلامی معاشرتی نظام کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ وہ 'دستور' کی اصطلاح کو ریاست اور معاشرت میں عدل، مساوات اور سماجی و سیاسی انصاف کے قیام کے لیے ایک ایسا ماڈل قرار دیتے ہیں جو اسلامی شریعت کے اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ ان کے مطابق، 'دستور' کا اصل مقصد اسلامی تہذیب میں ایک ایسے نظام کا قیام ہے جو حکومتی اقتدار کو محدود کرے اور عوام کو ان کے حقوق فراہم کرے۔

اس طرح، مصنف کی رائے میں 'دستور' ایک مکمل نظام ہے جو اسلامی طرزِ حکومت کی نمائندگی کرتا ہے اور مسلمانوں کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کو منظم کرنے کے لیے ضروری تمام اصولوں اور رہنما خطوط کو متعین کرتا ہے۔

آئینی بحران کے اسباب

مختار شنقیطی نے اپنی کتاب میں مسلم دنیا کو موجودہ آئینی بحران میں ڈالنے والی چند تاریخی رکاوٹوں کی

نشاندہی کی ہے۔ ان کے مطابق، یہ رکاوٹیں مسلم دنیا کی سیاسی، آئینی اور فکری ترقی کی راہ میں بڑی مشکلات کا سبب بنی ہیں۔ انہوں نے جن اہم تاریخی رکاوٹوں کا ذکر کیا، ان میں سے چند کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) استبداد

مختار شنقیطی نے واضح کیا ہے کہ تاریخ میں مسلم حکومتیں، خاص طور پر سلطنت عثمانیہ اور دیگر بادشاہتوں کے دور میں، استبدادی اور مطلق العنان حکمرانی کا رجحان غالب رہا۔ ان کے مطابق، حکمرانوں نے اسلامی اقدار سے انحراف کیا اور ریاستی اختیارات کو لامحدود کر دیا۔ اس استبدادی حکمرانی نے جمہوریت، شوریٰ (مشاورت)، اور عوامی شراکت جیسے اسلامی اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم دنیا میں ایک ایسا نظام قائم ہو گیا جو عوامی حکمرانی اور سیاست شرعیہ سے کوسوں دور ہو گیا۔

(۲) کالونیل ازم اور مغربی اثرات

آئینی بحران کا ایک اور بڑا سبب، کالونیل ازم اور مغربی طاقتوں کی مسلم دنیا پر اجارہ داری تھی۔ مغربی طاقتوں کے زیر اثر آنے والی مسلم ریاستوں نے اپنے آئینی ڈھانچے میں مغربی اصولوں کو اپنا لیا، جن میں سیکولرازم، لبرل ازم اور مغربی جمہوریت کے تصورات شامل تھے۔ اس عمل میں اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں اور شریعت کے کردار کو نظرانداز کر دیا گیا۔ مغربی استعمار نے مسلمانوں کو اپنے اصل آئینی و حکومتی اصولوں سے منحرف کر دیا، جس کے نتیجے میں مسلمان ممالک میں ایک متضاد اور غیر اسلامی آئینی ڈھانچہ تشکیل پا گیا۔

(۳) فقہی جمود

شنقیطی نے اسلامی فقہ میں جمود کو بھی ایک بڑی رکاوٹ قرار دیا ہے، جس کی وجہ سے مسلم دنیا جدید دور کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہی۔ ان کے مطابق، اجتہاد کی کمی نے مسلمانوں کو روایتی فقہ کی زنجیروں میں باندھ کر رکھا، جس سے معاشرتی اور سیاسی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی فقہ کی تشکیل جدید کی ضرورت تھی، لیکن اکثر علماء نے روایتی تشریحات پر اصرار کیا جس سے مسلمانوں کی فکری آزادی محدود ہو گئی۔

(۴)آئینی و قانونی کمزوریاں

مصنف نے مسلم دنیا کے آئینی ڈھانچے میں در آنے والی ان کمزوریوں کا بھی ذکر کیا جو مقامی اشرافیہ کے ذاتی کردار سے ظہور پذیر ہوئیں۔ان کی وجہ سے حکومتی اداروں میں شفافیت، جواب دہی اور عوامی شراکت کی کمی آئی۔

(۵)فرقہ واریت اور داخلی تقسیم

داخلی فرقہ واریت اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی و مذہبی اختلافات بھی ایک اہم تاریخی رکاوٹ رہے۔ شنقیطی کے مطابق، مسلمان حکمرانوں اور مذہبی رہنماؤں کے درمیان اختلافات نے ایک غیر متنازعہ آئینی نظام کے قیام کو مشکل بنادیا۔فرقہ واریت اور عدم اتفاق نے اسلامی سیاست کو کمزور کردیا، جس کا اثر آئینی بہتری اور اجتماعی حکومتی اقدار پر پڑا۔

مختار شنقیطی کے مطابق، ان تمام تاریخی رکاوٹوں کے سبب مسلم دنیا ایک متوازن اور اسلامی آئینی ڈھانچے کے قیام سے دور رہی، اور ان کا اثر آج بھی مسلم دنیا کے آئینی بحران میں نظر آتا ہے۔

خلافت سے قومی ریاست تک کا سفر

مختار الشنقیطی نے کتاب میں مسلم دنیا کے دستوری مسائل کے تجزیے میں زیادہ تر توجہ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ پر صرف کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ،اسلامی تہذیب میں خلافت کا تصور ایک جامع اور عالمی نوعیت کا رہا ہے، جسے محض حکمرانی کے نظام کے طور پر نہیں بلکہ ایک روحانی اور نظریاتی ذمہ داری کے طور پر بھی دیکھا جاتا تھا۔ خلافت کے تحت اسلامی سلطنت کی جغرافیائی سرحدوں کی کوئی قید نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد مسلم اُمہ کو ایک وحدت میں جوڑ کر اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا ماحول فراہم کرنا تھا۔ خلافت کا تصور صرف حکومت چلانے یا قانون نافذ کرنے تک محدود نہیں تھا، بلکہ یہ ایک ایسے نظام کی نمائندگی کرتا تھا جس میں حکمران اپنی اتھارٹی کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع سمجھتا تھا اور اس کا فرض تھا کہ وہ اسلامی تعلیمات کو اپنی حکمرانی کا محور بنائے۔

مگر پچھلی صدی کے شروعات میں خلافت کا اختتام، اور جدید قومی ریاستوں کی تشکیل، اسلامی تہذیب

میں ایک بڑی تبدیلی لے کر آئی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مسلم دنیا مختلف قومی ریاستوں میں بٹ گئی، جن کے سیاسی اور قانونی نظاموں میں مغربی اثرات غالب آ گئے۔ ہر ریاست نے اپنی جداگانہ شناخت قائم کی اور اپنی خود مختاری کا دعویٰ کیا، جس کے نتیجے میں خلافت کے عالمی اور وحدانی تصور کی جگہ مختلف قومی آئینی ڈھانچوں نے لے لی۔

یہ قومی ریاستیں اکثر مغربی اصولوں اور نظریات کی بنیاد پر تشکیل دی گئی تھیں، اور یوں ان ریاستوں کے آئینی ڈھانچے میں اسلامی فکریات اور جدید مغربی تصورات کے درمیان ایک نمایاں فرق موجود ہے۔ ماضی کے اسلامی اصولوں کے مطابق حکمرانی کا نظام ایک خلیفہ کے تحت چلایا جاتا تھا، جسے عوام کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے حکمرانی کا اختیار حاصل تھا، جب کہ قومی ریاستوں کے آئینی ڈھانچوں میں جمہوریت اور عوامی حاکمیت کو بنیادی حیثیت دی گئی۔

اس تبدیلی کے ساتھ مسلم دنیا کو کئی نئے دستوری مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بنیادی تضاد یہ تھا کہ خلافت کا نظام اللہ کی حاکمیت کے اصول پر مبنی تھا، جبکہ قومی ریاستوں کے آئین میں عوامی اقتدار اور خود مختاری کے نظریے کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کشمکش سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا جدید قومی ریاست کا نظام اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے؟ کیا ایک اسلامی ریاست کو اللہ کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے جمہوری اصولوں کو اپنانا ممکن ہے؟

مختار شنقیطی اس تبدیلی کو اسلامی دنیا میں آئینی بحران کا باعث سمجھتے ہیں۔ خلافت سے قومی ریاست تک کا سفر اسلامی نظریات کے اندر ایک گہری بحث کو جنم دیتا ہے، جس میں یہ سوالات اٹھتے ہیں کہ اسلامی معاشروں کو اپنی روحانی اور نظریاتی شناخت برقرار رکھتے ہوئے کیسے جدید سیاسی ڈھانچوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ خلافت کا نظریہ وحدانی اور عالمی تھا، جبکہ قومی ریاستوں کا ڈھانچہ تقسیم کا اور خود مختارانہ ہے۔

یہ تضاد اسلامی دستوری بحث میں اہم حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ مسلم ریاستوں کی آئینی تشکیل کے وقت یہ فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آتی ہے کہ کیسے اسلامی قوانین اور اقدار کو ایک قومی آئین کے ساتھ ضم کیا جا سکتا ہے۔ خلافت سے قومی ریاست تک کا یہ سفر اسلامی تہذیب کے آئینی ڈھانچے میں

ایک بڑا خلا پیدا کرتا ہے، جسے پر کرنا آج کے مسلم معاشروں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

شریعت اور جدید دستوری اُصولوں کے مابین کشمکش

مصنف کے مطابق، مسلم معاشروں میں شریعت کو ہمیشہ ایک مکمل قانونی اور اخلاقی نظام سمجھا گیا ہے، جو نہ صرف قانونی معاملات کو حل کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے بلکہ مسلمانوں کی زندگیوں میں اخلاقی اصولوں اور روزمرہ کے معمولات کو بھی ترتیب دیتی ہے۔ شریعت، اسلامی اصولوں کی بنیاد پر وضع کردہ قوانین کا ایسا مجموعہ ہے جو مسلمانوں کو انصاف، مساوات اور دیانت داری کے دائرے میں رہتے ہوئے زندگی گزارنے کی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ خلافت کے ادوار میں شریعت کو نافذ کرنا حکومتی ذمہ داریوں کا ایک لازمی حصہ تھا، اور یہی نظام اسلامی سلطنتوں کے عدالتی ڈھانچوں کا مرکز رہا۔

تاہم، جدید قومی ریاستوں کے قیام کے بعد، ان ریاستوں میں شریعت کے بجائے ایسے آئین اور قوانین متعارف کرائے گئے جو مغربی تصورات اور اصولوں پر مبنی تھے۔ ان جدید آئینی ڈھانچوں میں عموماً جمہوریت، انسانی حقوق، اور سیکولرزم جیسے اصول شامل ہیں جو اکثر اسلامی قوانین سے مختلف یا متضاد ہوتے ہیں۔ مغربی اصولوں کی روشنی میں بنائے گئے دساتیر معاشرتی مساوات، انفرادی حقوق، اور اجتماعی عدل کے تصورات کو پروان چڑھاتے ہیں، جب کہ شریعت میں ان تصورات کو اسلامی اصولوں کے تحت تشکیل دیا گیا ہے، اور ان کی تفصیل اور تشریح اسلامی تاریخ اور فقہ کے مطابق ہوتی ہے۔

نظریاتی ورثہ اور جدید قومی ریاست کا سوال

مختار الشنقیطی نے اس کتاب میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا شریعت کو جدید آئینی ڈھانچے میں ضم کیا جا سکتا ہے یا پھر ان دونوں کے درمیان تضاد کا تعلق ہے؟ ایک طرف، مسلم معاشروں کے بہت سے لوگ شریعت کے نفاذ کو اپنی دینی اور ثقافتی شناخت کا حصہ سمجھتے ہیں، اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ ریاست اسلامی اصولوں کے مطابق چلائی جائے۔ دوسری طرف، جدید قومی ریاستیں جنہوں نے اپنے آئین میں مغربی قوانین اور جمہوریت کے اصول اپنائے ہیں، ان کے لیے شریعت کا نفاذ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔

یہ کشمکش مسلم دنیا میں آئینی بحران کو مزید گہرا کرتی ہے، کیونکہ ایک طرف مسلم معاشرے اپنے نظریاتی ورثے کو برقرار رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں، تو دوسری طرف ان پر جدید قانونی اور آئینی تقاضے بھی اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اسلامی فقہ میں عدالت اور حکمرانی کے اصول قرآن اور حدیث کی بنیاد پر طے کیے گئے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کو کائنات کا حاکم اعلیٰ تسلیم کیا گیا ہے اور یہ عقیدہ ہے کہ قانون سازی اللہ کی طرف سے آتی ہے۔

بعض جدید دستوری ریاستوں میں شریعت کے کچھ اصولوں کو عدالتی نظام میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر شریعت کے کچھ اصول آئین میں شامل کیے جاتے ہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سی تشریح اپنائی جائے؟ اسلامی فقہ کے مختلف مکاتبِ فکر میں شریعت کے اصولوں کی تشریح میں فرق پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے آئینی سطح پر ان کو نافذ کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ مزید برآں، بعض اسلامی اصول جدید معاشرتی تقاضوں کے ساتھ میل نہیں کھاتے، جیسے کہ جنس، آزادی، اور مساوات کے معاملات پر اسلامی قوانین اور مغربی قوانین میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔

شنقیطی کے نزدیک، یہ سوال صرف اصولی یا نظریاتی نہیں بلکہ عملی بھی ہے کہ مسلم ریاستیں کیسے ایک ایسا نظام بنا سکتی ہیں جس میں شریعت اور جدید آئینی اصولوں کے درمیان توازن برقرار رہے۔ کیا کوئی ایسا قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جو شریعت کی روح کو بھی برقرار رکھے اور جدید جمہوری اصولوں کو بھی قبول کرے؟

یہ مسئلہ صرف اسلامی اصولوں کے نفاذ یا جدید آئینی ڈھانچوں کو اپنانے تک محدود نہیں، بلکہ اس میں یہ سوال بھی شامل ہے کہ اسلامی معاشروں میں حکومتی خود مختاری، عوامی حاکمیت، اور اللہ کی حاکمیت کے درمیان توازن کیسے برقرار رکھا جائے۔

الشنقیطی کی نظر میں یہ چیلنج آئینی ڈھانچے کو جدید دور میں ایک فعال اور معتبر نظام بنانے کے لیے لازمی طور پر حل کرنا ہوگا۔

اقتدار کی تقسیم اور خود مختاری کا مسئلہ

اسلامی اصولوں میں عوام کی رائے کو تو اہمیت دی جاتی ہے، لیکن اسے مکمل خود مختاری کے ساتھ نافذ کرنے کے بجائے شریعت کے مطابق محدود کیا جاتا ہے۔ جبکہ جدید جمہوری نظام میں عوام کو اقتدار کا بنیادی سرچشمہ تسلیم کیا جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آئین اور قانون سازی میں عوامی نمائندوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ قوانین اور پالیسیوں کو عوامی خواہشات کے مطابق تشکیل دیں۔ یہ عوامی اقتدار اور مقننہ کی خود مختاری کا تصور مغربی جمہوریتوں کا اہم حصہ ہے اور اکثر اسلامی اصولوں سے اختلاف کا باعث بنتا ہے۔ مسلم معاشرتی نظام میں جہاں اللہ کی حاکمیت اور شریعت کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے، وہیں جدید آئینی نظام میں انسانی حقوق، مساوات، اور جمہوری اصولوں کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

شنقیطی کے تجزیے میں یہ بات واضح ہے کہ اسلامی تہذیب میں آئینی بحران اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اقتدار اور خود مختاری کے معاملے میں ایک واضح اور منصفانہ نظام تشکیل نہیں دیا جاتا۔ اسلامی اصولوں کے مطابق اقتدار اور اتھارٹی کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا اسلامی حکومتوں کا بنیادی نظریہ رہا ہے، لیکن جدید دور میں اس کو عملی طور پر نافذ کرنا، جہاں عوام کی خواہشات کو بھی مد نظر رکھا جائے، ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔

عوامی شراکت اور نمائندگی

اسلامی تہذیب میں عوامی مشاورت اور حکومتی فیصلوں میں عوام کی رائے کو بالکل اہمیت دی گئی ہے، جسے اسلامی اصطلاح میں "شوریٰ" کہا جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں شوریٰ کا تصور حکومتی امور میں رہنمائی اور عوامی حمایت کو یقینی بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اور یہ حکمرانی کے اہم اصولوں میں سے ایک رہا ہے۔ روایتی اسلامی طرزِ حکومت میں حکمران یا خلیفہ کی اتھارٹی شریعت کے دائرے میں محدود تھی، اور وہ بڑے فیصلے کرنے سے پہلے علماء، مشیران، اور اہم شخصیات کے مشورے کو اہمیت دیتا تھا۔ اس طریقے سے حکومتی فیصلوں میں عوامی جذبات اور رائے کو شامل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

تاہم، جدید جمہوری نظام میں عوامی نمائندگی ایک مرکزی اصول بن چکا ہے، جس میں ہر شہری کو برابر کا حق دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے حکومتی نمائندوں کا انتخاب کرے اور اس طرح حکومتی امور میں براہ راست حصہ لے سکے۔ جمہوریت میں یہ تصور ہے کہ حکومت کی طاقت عوام سے ہی اخذ ہوتی ہے، اور اس لیے عوامی نمائندگی اور پارلیمنٹ جیسے ادارے فیصلہ سازی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

شنقیطی کے مطابق، اسلامی تہذیب میں عوامی شراکت اور نمائندگی کی اپنی روایات موجود ہیں، جنہیں جدید جمہوری اصولوں سے مختلف کہا جاسکتا ہے لیکن مکمل طور پر متضاد نہیں سمجھا جانا چاہیے۔

اسلامی تاریخ میں خلفائے راشدین کے دور کو ایک مثالی طرزِ حکومت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جس میں عوامی مشاورت اور ان کی حمایت کو یقینی بنایا گیا۔ شنقیطی کا مؤقف ہے کہ اسلامی آئین میں شوریٰ اور نمائندگی کے اصولوں کو جدید جمہوری طرز پر ڈھالنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی دنیا کی سیاسی قیادت اس بات کو سمجھے کہ عوامی شراکت اور نمائندگی کا اسلامی تصور جمہوری نظام سے کچھ مختلف ہے، لیکن بنیادی مقاصد میں کچھ حد تک ہم آہنگی ممکن ہے۔ اسلامی فکریات میں عوامی مشاورت اور نمائندگی کو دینی رہنمائی کے تحت تشکیل دینا ممکن ہے، جو کہ جدید جمہوری طرز کی جڑوں کو اسلامی تہذیب میں پیوست کرنے کی عمدہ کوشش ہوگی۔

جدید سیاسی ڈھانچوں میں اسلامی شناخت کا تحفظ

شنقیطی کے مطابق، اسلامی شناخت کا تحفظ محض مذہبی قوانین اور اصولوں کی پاسداری میں نہیں بلکہ اس بات میں مضمر ہے کہ کس طرح سیاسی، سماجی، اور ثقافتی معاملات میں اسلامی تہذیب کے بنیادی اصولوں کو نافذ کیا جائے۔ اسلامی تہذیب کی شناخت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصول اور نظریات، جو قرآنی تعلیمات اور سنتِ رسول سے اخذ کیے گئے ہیں، حکومتی امور اور آئین کے ساتھ جڑے ہوں اور لوگوں کی زندگیوں میں بھی عملی طور پر نافذ ہوں۔ شنقیطی کا کہنا ہے کہ اگر اسلامی دنیا اپنی مخصوص شناخت کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے تو اسے سیکولرزم کے ان پہلوؤں کو رد کرنا ہوگا جو دینی اصولوں اور اسلامی معاشرت کے خلاف ہوں۔

مصنف کے نزدیک، اسلامی تہذیب میں شناخت کا تحفظ ریاست کے قانون سازی کے عمل، عدلیہ،

اور عوامی معاملات میں اسلامی اصولوں کی پیروی سے مشروط ہے۔ مثلاً، عدلیہ میں اسلامی قوانین کا نفاذ، شرعی عدالتوں کا قیام، اور قوانین میں اسلامی اصولوں کی ترجیح دینا اسلامی شناخت کی بقا کے اہم اجزاء ہیں۔ اسی طرح تعلیمی نظام اور سماجی اداروں میں اسلامی تعلیمات اور اقدار کو فروغ دیا جائے، تاکہ لوگوں کی زندگی میں اسلامی اصولوں کی جڑیں مزید مضبوط ہو سکیں۔

اسلامی شناخت کی بقا کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جدید آئینی نظام میں اسلامی معاشرت اور خاندانی نظام کی حفاظت کی جائے۔ اسلامی دنیا کے بہت سے ممالک میں خاندانی نظام اسلامی اصولوں پر مبنی ہے، جو کہ مغربی معاشرتی ڈھانچے سے مختلف ہے۔ لہٰذا، اسلامی آئینی نظام میں اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ جدید قوانین خاندانی نظام اور معاشرتی ڈھانچے پر منفی اثرات مرتب نہ کریں۔ اسلامی معاشرت میں خاندان کو بنیادی اکائی سمجھا جاتا ہے، اور اس کے مضبوط ہونے سے معاشرہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ اگر جدید قوانین اور مغربی اثرات اسلامی خاندانی نظام کو کمزور کرتے ہیں تو اسلامی تہذیب کی بنیادی شناخت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

ایسے ہی ریاست کے اندر اسلامی شناخت کی حفاظت کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلامی ممالک کے آئینی ڈھانچے میں حکمرانوں کو شریعت کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کا پابند کیا جائے اور انہیں محض ریاستی سربراہ نہ سمجھا جائے بلکہ دینی ذمہ داریوں کے تحت کام کرنے والا ایک نمائندہ تسلیم کیا جائے۔

آخر میں، شنقیطی اس بات کی جانب بھی توجہ دلاتے ہیں کہ اسلامی دنیا کو عالمی سطح پر اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے سفارتی اور سیاسی سطح پر بھی اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اسلامی ممالک کو عالمی اداروں اور تنظیموں میں اپنی اسلامی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے شمولیت اختیار کرنی چاہیے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو بین الاقوامی سطح پر ایک مؤثر اور مضبوط طریقے سے پیش کرنا چاہیے۔ اسلامی ممالک کو ایک مضبوط سفارتی اور سیاسی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے تاکہ وہ مغربی ممالک کے ساتھ تعلقات کو بھی برقرار رکھ سکیں اور اپنے اسلامی اصولوں اور تہذیب کو بھی محفوظ رکھ سکیں۔

دستور سازی میں علماء کا کردار

مختار شنقیطی کی کتاب 'الأزمة الدستورية في الحضارة الإسلامية' میں علماء کے آئینی کردار کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جیسے جیسے جدید ریاستوں نے مذہبی تشریحات پر کنٹرول حاصل کیا، علماء کے کردار میں بھی کافی تبدیلی آئی۔ ابتدائی اسلامی دور میں، علماء نے قانونی اور اخلاقی اصولوں کے وضع کرنے میں بنیادی خدمات سرانجام دیں۔ ان کا کام محض مذہبی تعلیمات دینا ہی نہیں بلکہ عدالتی فیصلے کرنا اور سیاسی مشاورت بھی تھا۔ مختلف اسلامی ادوار میں علماء کا کردار اسلامی ریاست کی آئینی ترقی میں نمایاں رہا ہے۔

آج کے دور میں، علماء کی حیثیت مختلف مسلم ممالک میں مختلف ہے۔ ایران میں، علماء کو آئین میں بہت بلند مقام دیا گیا ہے۔ ایرانی دستور کے مطابق، ولی فقیہ کا ادارہ اسلامی نظام حکومت کے نظریے پر مبنی ہے اور اس کے تحت علماء کو اہم آئینی اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، ترکی جیسے ممالک میں، سیکولر آئین کی پیروی کی جاتی ہے اور علماء کو ریاست کے معاملات میں محدود کردار دیا گیا ہے۔ یہاں ریاست مذہبی تشریحات پر براہ راست اختیار رکھتی ہے اور علماء کا کردار عموماً رسمی مذہبی سرگرمیوں تک محدود ہے۔ کئی مسلم ملکوں میں ان کا کردار معتدل بھی ہے کہ ریاست ان کی رائے کا احترام کرتی ہے، اگرچہ وہ براہ راست حکومت میں نہیں بھی ہوتے۔ علما کے کردار اور ان کی اہمیت میں اس فرق کی وجہ سے ریاستوں کے آئینی ڈھانچوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مصنف کے مطابق، علماء کے کردار کو آئینی سطح پر تسلیم کر کے اور انہیں جدید فکری اجتہاد کی اجازت دے کر اسلامی ممالک اپنے آئینی نظام کو مستحکم بنا سکتے ہیں۔ علماء اور جدید آئینی اداروں کے درمیان تعاون اسلامی ریاستوں کو ایک مضبوط دستوری نظام کی جانب لے جا سکتا ہے۔

اسلامی تصورِ عمرانی معاہدہ

مختار شنقیطی کی کتاب الأزمة الدستورية في الحضارة الإسلامية میں عمرانی معاہدے کے اسلامی تصور پر تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق، "بیعت" کا تصور ابتدائی اسلامی طرز حکومت میں عمرانی معاہدے کا ایک عملی نمونہ تھا، جہاں حکمران کو اپنی رعایا کے سامنے جوابدہ ہونا ہوتا تھا۔ بیعت کا تصور

مسلمانوں کے حکومتی اصولوں میں ایک ایسا عنصر تھا جس سے معاشرتی جوابدہی اور شفافیت کو فروغ ملتا تھا۔ الشنقیطی بیعت کو ایک ایسا آئینی اصول قرار دیتے ہیں جو اسلامی طرز حکمرانی کے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کرتا ہے۔

اسلام میں بیعت کا مطلب ہے کہ حکمران اور عوام کے درمیان وفاداری اور اطاعت کا ایک عہد طے پاجاتا ہے۔ یہ صرف حکمران کی طرف سے حکمرانی کا حق نہیں بلکہ ایک ذمہ داری بھی ہے جس کے تحت حکمران کو عوام کے حقوق اور فلاح و بہبود کو اولین ترجیح دینی ہوتی ہے۔ ابتدائی خلفائے راشدین نے اپنے اقدامات کی وضاحت اور جوابدہی کے لیے خود کو رعایا کے سامنے پیش کیا۔ مثال کے طور پر، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی حکومت میں عدل اور شفافیت کو برقرار رکھنے کے لیے عوام سے بیعت حاصل کی اور ان کی رائے کو اہمیت دی۔ یہ ایک ایسا عمرانی معاہدہ تھا جس سے حکمرانوں پر احتساب اور خدمت خلق کا فریضہ عائد ہوتا تھا۔

اسلامی تاریخ میں موروثی حکومتوں اور نوآبادیاتی ادوار نے بیعت اور عوامی رائے کی اس اہمیت کو کمزور کر دیا۔ ان ادوار میں حکمرانی موروثی بن گئی اور حکمران اپنی رعایا کے سامنے جوابدہ نہیں رہے۔ اس کے نتیجے میں عمرانی معاہدے کی اسلامی روح ماند پڑ گئی، اور حکومتی نظام میں شفافیت اور عوامی فلاح و بہبود کے اصول کمزور ہو گئے۔ اس سے حکمرانی کا ایک ایسا ماڈل سامنے آیا جس میں بیعت اور جوابدہی کی بجائے فرد واحد کی طاقت کو فوقیت حاصل ہو گئی۔

آج کے دور میں مسلم ریاستوں کے آئین میں بیعت یا عوام کی مرضی کی روح کی کمی ہے، جو کہ عمرانی معاہدے کے تصور کو کمزور بناتی ہے۔ بیشتر مسلم ممالک کے آئینی ڈھانچوں میں حکومت اور عوام کے درمیان جوابدہی کا ایسا نظام موجود نہیں ہے جو بیعت کے اصول کو بروئے کار لاتا ہو۔ الشنقیطی کے مطابق، اس کی وجہ سے مسلم ممالک میں زیادہ تر حکومتی نظام آمرانہ نوعیت کے ہیں، جو اسلامی اصولوں کے خلاف ہیں۔ الشنقیطی اس عدم جوابدہی اور آمرانہ حکومتی ڈھانچے کو اسلامی طرز حکومت کے بنیادی اصولوں کے خلاف قرار دیتے ہیں اور اس بات کی ضرورت پر زور دیتے ہیں کہ مسلم ممالک کو اپنے آئین میں اسلامی عمرانی معاہدے کے اصولوں کو شامل کرنا چاہیے۔ ان کے مطابق، اگر مسلم

ممالک بیعت اور جوابدہی کے اس نظام کو آئینی سطح پر دوبارہ نافذ کریں تو یہ نہ صرف عوامی فلاح و بہبود کے اصول کو فروغ دے گا بلکہ ایک ایسے آئینی نظام کو بھی جنم دے گا جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو۔

جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے آئینی اصلاحات

ابتدائی اسلامی دور میں حکمرانی کے نظام میں حالات اور سماجی تبدیلیوں کے مطابق اصلاحات متعارف کروائی جاتی تھیں، اور اس روایت کو برقرار رکھ کر آج کے مسلم ممالک بھی اپنے آئینی ڈھانچوں کو اسلامی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ بنا سکتے ہیں، جو کہ عصری چیلنجز کا سامنا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

مصنف کہتے ہیں کہ اسلامی فقہ کے اصول میں بنیادی طور پر ایک لچک موجود ہے جو اسے وقتی ضروریات کے مطابق ڈھالنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اس اصول کو دستور سازی میں بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔

وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آئینی اصلاحات کو روایتی اسلامی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنا آسان نہیں ہے۔ اکثر مسلم ممالک میں موجود قوانین سخت اور غیر لچکدار تشریحات پر مبنی ہیں، جس سے اصلاحات کا عمل پیچیدہ بن جاتا ہے۔ یہ پیچیدگیاں خاص طور پر صنفی مساوات، آزادی اظہار اور دیگر بنیادی حقوق کے حوالے سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں، اور ان کے لئے اجتہاد کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔

عرب بہار ایک اہم موڑ

کتاب میں مختار شنقیطی عرب بہار کے حوالے سے ایک جامع تجزیہ پیش کرتے ہیں، اس مرحلے کو وہ عرب دنیا کی سیاسی اور آئینی فکر کے لیے ایک اہم مرحلہ قرار دیتے ہیں۔ شنقیطی کے مطابق، عرب بہار نے سیاسی اصلاحات کی ضرورت کو اجاگر کیا اور طویل عرصے سے قائم ان آمرانہ نظاموں کو چیلنج کیا جو عوام کی خواہشات اور حقوق کو نظر انداز کرتے چلے آ رہے تھے۔ یہ تحریکیں دراصل انصاف،

آزادی، اور عوامی احتساب جیسے اسلامی اصولوں کے احیاء کے لیے اٹھائی گئیں اور ان سے مسلم معاشروں میں ایک طرح سے حقوق کے لیے جدوجہد کو تازگی اور نمو میسر آئی۔

الشنقیطی عرب بہار کو ایک ایسے مرحلے کے طور پر دیکھتے ہیں جس نے مسلم معاشروں کو ان کے اصل اسلامی اصولوں کی طرف پلٹنے کا شعور دیا، جیسے کہ شوریٰ (مشاورت) اور بیعت (عوامی وفاداری)۔ ان کے مطابق، عرب بہار نے روایتی حکومتی نظام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ ان نظاموں میں عوامی شمولیت اور احتساب کی کمی تھی۔ ان کی رائے میں یہ تحریک اور مظاہرے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مسلم معاشرے آمرانہ نظام نہیں چاہتے بلکہ ایسی حکومت کے خواہاں ہیں جو ان کی امنگوں کی عکاسی کرے اور ان کے حقوق کا احترام کرے۔

مصنف کے مطابق، اس تبدیلی نے آئینی ڈھانچوں میں اصلاحات پر بھی بحث کو جنم دیا۔ ان کے خیال میں، عرب بہار جیسی تحریکیں آئینی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں لانے کی ضرورت پر زور دیتی ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں اور عوامی شمولیت دونوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا کہ ان تحریکوں کے دوران اور بعد میں کئی ممالک کے اندر اسلامی اصولوں اور جمہوری اقدار کے امتزاج پر بحث و مباحثے شروع ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ، عرب بہار نے اسلامی دنیا کے آئینی نظام کو ایک نئی جہت دی ہے جس میں لوگوں کی خواہشات کو آئینی سطح پر اہمیت دی جا رہی ہے اور اس کے ذریعے حکومتی نظاموں کو عوامی توقعات کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔

شنقیطی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلم ممالک کو عرب بہار کے تجربات سے سیکھ کر ایسی اصلاحات کی طرف بڑھنا چاہیے جو عوام کی رائے کو آئینی ڈھانچے میں جگہ دیں اور ایک ایسا حکومتی نظام قائم کریں جو نہ صرف اسلامی اقدار کا عکاس ہو بلکہ جدید جمہوری اصولوں کے مطابق بھی ہو۔

سیکولرازم کا مسئلہ

وہ کتاب میں سیکولرازم اور اس کے مسلم دنیا کے آئینی ڈھانچے پر اثرات کا بھی تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے مطابق، سیکولرازم کی جڑیں بنیادی طور پر مغربی فکر میں پیوست ہیں، جہاں ریاست اور مذہب کو علیحدہ رکھنے کے اصول کو فروغ دیا گیا۔ جب یہ نظریہ مسلم ممالک میں نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی

ہے تو یہ اسلامی تہذیبی اصولوں اور روایتی اقدار کے ساتھ ٹکراؤ کا باعث بنتا ہے۔

مسلم دنیا میں سیکولر اقدار کا نفاذ وہاں کے معاشرتی اور آئینی ڈھانچے کو کمزور کرتا ہے، کیونکہ یہ اسلامی معاشروں کی وہ شناخت چھین لیتا ہے جو ان کی تہذیبی اور مذہبی بنیادوں پر صدیوں سے قائم ہے۔ ان کے خیال میں، سیکولرازم کا یہ تصور کہ ریاست کو مکمل طور پر مذہبی اثرات سے پاک ہونا چاہیے، اسلامی حکومت کے اس تصور سے ہم آہنگ نہیں جو دینی اصولوں کے ساتھ ساتھ معاشرتی انصاف، مساوات، اور عوامی فلاح کو بنیادی حیثیت دیتا ہے۔

شنقیطی کا استدلال ہے کہ مسلم دنیا میں سیکولرازم کا نفاذ نہ صرف آئینی ڈھانچے کو مذہب سے جدا کر دیتا ہے بلکہ اسلامی اقدار کے عمومی دائرے کو بھی تنگ کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، ترکی جیسے ممالک میں، جہاں سیکولر نظریات نے مذہب کو ریاستی امور سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے، وہاں عام اسلامی شعائر اور اصولوں کی پیروی میں بھی کمی دیکھنے کو ملی، جس سے عوامی بے چینی اور مذہبی شناخت کا بحران پیدا ہوا۔

وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مسلم دنیا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آئینی ڈھانچے میں اسلامی اقدار کو مدنظر رکھے، بجائے اس کے کہ وہ مکمل طور پر سیکولر نظام کی پیروی کرے۔ ان کے مطابق، ایک متوازن نظام ضروری ہے جو اسلام کی روح اور تعلیمات کے ساتھ ساتھ جدید آئینی تقاضوں کو پورا کر سکے، تاکہ مسلمان معاشرے اپنی تہذیبی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

عصر حاضر میں آئین سازی کے اختیارات اور اسلامی نقطہ نظر

قانون سازی کی حدود

اسلامی شریعت نے مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنے کے بارے میں ایک ضابطہ حیات قرآن وسنت کی صورت میں پیش کر دیا ہے جس میں کچھ چیزوں کے بارے میں بنیادی اصول فراہم کیے گیے ہیں، تاکہ مختلف بدلتے ہوئے اوقات و حالات کے مطابق ان میں ترمیم و اضافہ کیا جاسکے۔ جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو اس میں ظاہر ہے کہ قانون سازی کی قطعاً گنجائش نہیں لیکن معاملات کے ان دائروں میں قانون سازی کی جاسکتی ہے جس میں کتاب وسنت خاموش ہوں۔

اسلام میں قانون سازی کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ عبادات میں صرف وہی عمل کیا جائے جو بتایا گیا ہے اور معاملات میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس سے رک جانا چاہیے اور جس چیز کے بارے میں شریعت نے سکوت اختیار کیا ہے اس میں اپنی صوابدید، وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی کی جاسکتی ہے۔

امام شاطبیؒ نے اپنی کتاب میں اس اصول کو یوں بیان کیا ہے:

> ''عبادات کا حکم عادات کے حکم سے مختلف ہے، عادات میں قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے، اس میں گویا اپنی صوابدید پر کام کرنے کا اِذن دے دیا گیا ہے اس کے برعکس عبادات میں کوئی ایسی بات استنباط سے نہیں نکالی جاسکتی جس کی اصل شرع میں موجود نہ ہو''۔[1]

یہ بات طے شدہ ہے کہ جن معاملات میں اللہ تعالیٰ نے خصوصی احکام نہیں دیئے ان میں معاشرہ قانون سازی کر سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں ہجرت کے بعد آنحضور ﷺ نے باہمی مشاورت کے

---

[1] امام شاطبیؒ، الاعتصام، 115

ساتھ پہلا تحریری آئین مرتب کر کے معاشرے کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ معاملات کی حد تک قانون سازی کی جاسکتی ہے۔

میثاق مدینہ کی تدوین کے محرک خود آنحضور ﷺ تھے اور انہوں نے یہ اصول دیا کہ صاحب وحی کی زندگی میں جبکہ سلسلہ وحی جاری تھا اور کتاب و سنت موجود تھے اس کے باوجود ریاستی امور اور شہریوں کے حقوق و فرائض پر قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ قرآن نے بھی اسلام میں قانون سازی کا بنیادی اصول قیامت تک کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔

''مسلمانوں کے معاملات آپس میں مشورہ سے طے پاتے ہیں''۔[2]

اس آیت میں ذات باری تعالی نے واضح کر دیا کہ قرآن و سنت کے ہوتے ہوئے بھی انسان کو قانون سازی یا ضابطہ گری کی ضرورت پڑے گی۔ لہذا بجائے اس کے کہ کوئی ڈکٹیٹر، بادشاہ یا نام نہاد حاکم اپنے مفادات و مقاصد کے لیے یہ اختیار استعمال کرے انسان کی بہتری اسی میں ہے کہ معاملات باہمی مشاورت ہی کے ذریعے طے ہو جائیں اور اس اصول کو مزید تقویت سورۃ النساء کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے۔

> ''اور جو شخص ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے سرکشی کرے اور مومنین کے طریقہ کار کے علاوہ کسی اور راستے کو اختیار کرے تو پھر جس طرف مڑ گیا ہم بھی اسے اسی طرف موڑ دیں گے اور وہ جہنم جیسے برے ٹھکانے میں جھونک دیا جائے گا''۔[3]

شریعت نے بنیادی قوانین فراہم کر دیے ہیں جبکہ فروعات میں جانے سے پرہیز کیا ہے اس بدلتے ہوئے انسانی حالات اور وقت کے تقاضوں سے قوانین کو ہم آہنگ رکھنے کے لیے اللہ تعالی نے بے شمار انسانی معاملات اجتماعی قانون سازی کے لیے چھوڑ دیئے ہیں۔ تاکہ لوگ اپنے مخصوص حالات اور

---

[2] الشوری:38

[3] البقرہ:130

تقاضوں کے مطابق بنیادی شرعی زقوانین کی روشنی میں خدا کی ودیعت کی ہوئی عقل و دانش کے مطابق قواعد وضوابط بنالیا کریں۔ اسلامی شریعت کا یہ اصول اس کی جمہوری روح کی غمازی کرتا ہے۔

ابن قیم کے کے مطابق:

''شریعت کی بنیاد حکومتوں اور لوگوں کی دنیاوی و اخروی فلاح و بہبود پر ہے اور شریعت مکمل طور پہ انصاف ہے۔ سراسر رحمت و حکمت ہے۔ پس جس مسئلے میں انصاف کی بجائے ظلم ہو، رحمت کی بجائے زحمت ہو، فائدے کی بجائے نقصان ہو اور عقل کی بجائے بے عقلی ہو وہ شریعت کا مسئلہ نہیں۔ اگرچہ اسے بذریعہ تاویل شرع میں داخل کرلیا گیا ہو، پس شریعت خدا کے بندوں میں اس کا انصاف ہے اور اس کی مخلوق میں اس کی رحمت ہے، اس سے زندگی ہے، غذا ہے اور دوا ہے، نور ہے، شفا ہے اور حفاظت ہے۔ زندگی کی ہر بھلائی شریعت سے وابستہ ہے اور زندگی کے ہر نقصان کا سبب ترک شریعت ہے۔ چنانچہ جو شریعت خداوند تعالی نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمائی ہے وہ عالم کا ستون ہے اور دنیا و آخرت کے تمام حلقہ ہائے فلاح و بہبود کا مرکز ہے''[4]۔

قانون سازی کے اصول کے بارے میں ابن خلدون کہتے ہیں:

''دنیا کے حالات اور اقوام عالم کی عادات ہمیشہ ایک حالت پر باقی نہیں رہتیں، دنیا تغیرات زمانہ اور انقلابات احوال کا نام ہے اور جس طرح یہ تبدیلیاں افراد، ساعات اور شہروں میں ہوتی ہیں اسی طرح دنیا کے تمام گوشوں، تمام زمانوں اور تمام حکومتوں میں واقع ہوتی ہیں، خدا کا یہی طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ سے جاری ہے''[5]

---

[4] ابن قیم، اعلام الموقعین، 4/1

[5] مقدمہ ابن خلدون، 24

عصر حاضر کے مشہور سکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس سلسلہ میں ایک اصول یہ بھی بیان کیا ہے:

''قانون کو یا تو خود قانون ساز بدل سکتا ہے یا اس سے بالاتر شخصیت، اس سے کم تر شخصیت کو قانون بدلنے کی اجازت نہیں۔ اگر اللہ تعالی نے کوئی حکم دیا ہے تو اللہ تعالی ہی اسے بدل سکتا ہے۔ اسی طرح نبی ﷺ کے حکم کو یا تو خود وہی نبی بدلے گا یا اللہ تعالی یا اللہ کا بھیجا ہوا کوئی دوسرا نبی۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون کے جو احکام قرآن میں ہیں انہیں کوئی اور شخص نہیں بدل سکتا، لیکن ایک فقہی کی رائے دوسرا فقیہ رد کر سکتا ہے اور اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔ آج اگر کوئی فقیہ مضبوط دلائل کے ساتھ پرانے اجماع کے خلاف اپنی رائے پیش کرے اور اس نئی رائے کو دوسرے فقہا بھی قبول کر لیں تو یہ ایک نیا اجماع ہوگا اور یہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے''[6]۔

شیخ محمد عبدہ کے نزدیک شریعت کی اساس مصلحت عامہ پر ہے اور چونکہ مصلحتیں بدلتی رہتی ہیں اس لیے ان میں تغییر و تبدل کی ضرورت ہے، صحابہ کرام ہمیشہ مصلحت عامہ کے مطابق فیصلے صادر فرماتے تھے۔ قوانین انسانی مصلحت کے لیے بنائے جاتے ہیں اور مصلحت زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

غرض یہ کہ شریعت نے زندگی کے لیے وہ دائرہ کھینچ دیا ہے جس میں رہتے ہوئے نشو و نما اور ارتقاء کی اجازت ہے۔ سرچشمہ قانون نے اس سلسلے میں ہمیں ایک کھلا راستہ (منہاج) دے دیا ہے۔ تاکہ دنیوی زندگی کے لیے قانون سازی جاری رہے جو ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جنہیں نصوص یعنی قرآن و سنت نے دانستہ چھوڑ دیا ہے۔

آئین سازی کے لیے ادارہ جاتی تشکیل

اگرچہ شریعت خود قانون الٰہی ہے پھر بھی اسلامی حکومتوں کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ رفاہ عامہ

---

[6] خطبات بہاول پور، ص:136

کے پیش نظر خلفاء یا مسلمان بادشاہوں نے براہ راست قانون سازی یا بذریعہ اجتہاد قانون سازی میں کبھی تامل نہیں کیا7۔

عصر حاضر میں حکمرانوں کا حق قانون سازی مجالس قانون ساز کو تفویض کر دیا گیا ہے اور حکمرانِ وقت ذاتی طور پر قانون سازی کا مجاز نہیں ہے۔ شریعت نے حکمرانوں کو قانون سازی کے جو اختیارات تفویض کیے تھے وہی اب مجالس قانون ساز کو حاصل ہیں۔

پارلیمنٹ ایک ایسا ادارہ ہے جو شوری کے اصول کی پابندی کرتا ہے۔ اس ادارے میں تمام معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں یہ ادارہ اسلامی اقدار کے مطابق ہے۔

انتظامی امور اور عمومی نظم ونسق کے لیے مختلف محکمہ جات کا قیام، ان کے لئے رجال کار کا تقرر اور ان کے اختیارات، فرائض اور حقوق کا تعین، محصولات کا تعین اور ان کی وصولی کا طریق کار وضع کرنا، جیل خانہ خات کی تنظیم اور انتظامی سہولت کے لئے علاقہ جات کی تقسیم اور اس کے لئے عملے کا تقرر وغیرہ۔ اس سب میں ''سیاست شرعیہ'' (قانون تعزیرات) بھی شامل ہے۔ اس کے لئے محتسب اور اس کے عملے کا تقرر اور ان کے فرائض اور دائرہ کار کا تعین بھی شامل ہیں۔ ان سب قوانین کا مقصد ملک میں امن وامان کا قیام اور عوام الناس کے معاملات کی تنظیم وتدبیر ہے۔ یہ تمام امور مجلس قانون ساز کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ مجلس بحث و تمحیص کے بعد جو فیصلہ صادر کرے ایسے فیصلے کی پابندی لازمی ہوگی۔ یہ قرآن و حدیث میں تعین نہیں کیا گیا کہ انہیں کون بنائے گا۔ اکیلی وزارت قانون خود اتنے قانون نہیں بنا سکتی جن کا تعلق معاشرے کے سینکڑوں شعبوں سے ہو۔ اسی طرح ایک رئیس مملکت بھی چاہے کتنا ہی سمجھدار ہو معاشرے کے تمام پہلوؤں پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ اس کے لیے ایسے ادارے کی ضرورت ہے جس کے افراد روز مرہ کی زندگی سے متعلق ہوں اور جس ادارے میں مکمل بحث کرکے قوانین بنانے کا طریقہ رائج ہو۔ یہ ادارہ مجلس قانون ساز (پارلیمنٹ) ہے۔ اس قسم کی قانون سازی کا جواز قرآن و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ ارشاد

---

7 ڈاکٹر صبحی محمصانی، فلسفہ التشریع الاسلامی، 287

باری تعالی ہے:

''اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور تم میں سے جو حکمران ہیں ان ہی''۔[8]

نظم ونسق کے لئے قانون سازی کے جواز کی دوسری دلیل حدیث رسول ﷺ میں ہے:

''من اطاع محمد صلی اللہ علیہ وسلم فقد اطاع اللہ ومن عصی محمد صلی اللہ علیہ وسلم فقد عصی اللہ''۔[9]

(جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی پس اس نے اللہ کی نافرمانی کی)

لہذا حاکم وقت کی براہ راست قانون سازی بالاجماع جائز ہے کیوں کہ مسلمان خلفاء نے ایسے بہت سے مسائل میں اجتہاد کیا جو انہیں انہیں وقتی ضروریات کے لحاظ سے پیش آئے اور چونکہ ان کا اجتہاد اجماع کے ذریعے قبول کر لیا گیا اس لیے وہ شرع اسلامی کا جزو بن گیا[10]۔

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

> ''اسلام نے انتظامی اور رفاہ عامہ کے امور میں بنیادی احکام کی تعیین کر کے ان کی جزئیات اور تفصیلات طے کرنے کا کام از خود حکمرانوں کی ذمہ داری قرار دیا ہے تاکہ وہ موقع و محل اور رفتار زمانہ دیکھ کر جو فیصلہ بھی مناسب سمجھیں صادر کریں اور رعایا کو جس جس طرح سہولت اور فائدہ پہنچا سکتے ہیں پہنچائیں''[11]

اس اجازت کے تحت نظم ونسق کے لئے قانون سازی ہر حکمران نے کی اور اسے نافذ بھی کیا۔ اسلام میں عوام کی فلاح و بہبود سیاست کی بنیاد ہے۔ اس لئے مسلم حکمران رفاہ عامہ کے امور میں قانون سازی کرتے رہتے ہیں اور اس کی انہیں اجازت بھی ہے۔

---

[8] النساء:59

[9] البخاری، کتاب الاعتصام، حدیث 2125

[10] فلسفۃ التشریع الاسلامی، 289

[11] مقدمہ ابن خلدون، 196

اسی اجازت کے تحت عثمانی خلفاء نے اپنی نگرانی میں ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' مرتب کرایا۔ اس مجلہ میں قانون سزا و جزاء، قانون تجارت اور عدالتوں کے اساسی قوانین یورپ کے قوانین سے ماخوذ ہیں[12]۔

عمومی نظم و نسق کی قانون سازی کے لئے بھی ماہرین اور اہل بصیرت کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ مشاورت میں ممد و معاون رہیں۔

''دینی امور میں حکمران پر اہل علم سے مشورہ لینا واجب ہے۔ جنگی امور میں ماہرین جنگ سے مشورہ لینا چاہیے۔ عوام کی بہبود کے کاموں میں عوامی نمائندوں (وجوہ الناس) سے مشورہ لینا چاہیے اور ملکی مصالح یعنی ترقیاتی اور تعمیراتی امور میں سیکریٹریوں، وزیروں اور ماتحت حکام سے مشورہ لینا چاہیے''[13]۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تعمیر و ترقی اور بہبود کے کاموں میں جدید مجالس قانون ساز کو قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ فلاح و بہبود کے کاموں میں بندوں کے مصالح کا اعتبار کیا جاتا ہے لیکن یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ مصالح کا اعتبار اسی بات پر چاہیے جس پر شارع نے اعتبار کیا ہے۔ امام شاطبیؒ لکھتے ہیں:

''ان الشریعۃ مبینۃ علی اعتبار المصالح وان المصالح انما اعتبرت من حیث وضعھا الشارع کذلک لا من حیث درک المکلف''[14]۔

(شریعت کا دار و مدار بندے کے مصالح پر ہے لیکن مصالح کا اعتبار اس نہج پر ہو جس کا شارع نے اعتبار کیا ہے بندوں کی خود ساختہ مصالح کا اعتبار نہ ہوگا)

مجالس قانون ساز کو امن و امان کے قیام، نظم و نسق اور محصولات کی تعین و تنفیذ کے لیے وسیع اختیارات حاصل ہیں ان امور میں وہ قانون سازی کر سکتی ہیں۔ امام شاطبیؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان امور میں بھی مجالس کی معاونت اور مشورہ کے لیے علماء کرام اور ماہرین

---

12 فلسفۃ التشریع الاسلامی، 291

13 قرطبی، 250/4

14 الموافقات، 106/3

قانون کی ضرورت ہے جو پر آن وسنت کی روشنی میں مجالس قانون ساز کے کام کو آسان بنائیں۔

''سلطان وقت کے شرعی حالات کے مقرر کردہ حدود اور شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ انتظامی اور میں اہل بصیرت سے مشورہ لے۔:

''یعنی اے رسول معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ عزم بالجزم کر لیں تو اللہ پر بھروسا رکھیں''[15]

حضرت امام بخاری نے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ بعض معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے بعد آئمہ مجتہدین ایسے جائز معاملات میں جن کے لیے قرآن و حدیث میں کوئی حکم نہ ملتا جسے اساس قرار دے سکیں تو وہ دیانت دار اہل علم سے مشورہ لیتے تھے[16]۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں خاص طور پر مذکور ہے کہ وہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور تھے جو احکام واجتہاد میں دوسروں سے استصواب رائے کرتے تھے[17]۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عموم نظم ونسق کے لیے قانون سازی کرتے وقت اسلامی قانون کے ماہرین کو بھی مشاورت میں شامل کر لیا جائے تاکہ قرآن وسنت کی روشنی میں ان امور کی حدود کا تعین ہو سکے۔

---

[15] الشوری:38

[16] بخاری کتاب الاعتصام

[17] اعلام الموقعین، 70/1

اسلامی فقہی نقطہ نظر اور جدید آئینی تصورات: تطبیقی مسائل

سماجیات کا فقہی تناظر

اسلامی فقہ اور جدید آئینی تصورات کی بنیادی نظریاتی اساسات اور مقاصد میں بہ ظاہر وسیع فرق پایا جاتا ہے۔ اسلامی فقہ کی بنیاد قرآن، سنت، اجماع، اور قیاس جیسے اصولوں پر قائم ہے، اور اس کا مقصد دین کے احکام کو معاشرتی زندگی میں نافذ کرنا ہے۔ فقہ کے مطابق قانون کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اللہ کی مرضی کے مطابق انسانی زندگی کو ڈھالا جائے۔ فقہ میں حلال اور حرام، حقوق و فرائض، عبادات اور معاملات کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی جاتی ہے، اور اس میں انفرادی، خاندانی، اور اجتماعی سطح پر قوانین بنائے جاتے ہیں۔

جدید آئینی معیارات

دوسری جانب، جدید آئینی تصورات کی بنیاد انسانی حقوق، مساوات، انصاف، اور جمہوری اصولوں پر قائم ہے۔ ان قوانین میں ریاست اور فرد کے تعلقات، شہری حقوق، اور حکومتی ڈھانچے کا تعین کیا جاتا ہے۔ آئینی معیارات کا مقصد عام طور پر ایک ایسے معاشرے کو تشکیل دینا ہوتا ہے جہاں انفرادی حقوق اور اجتماعی مفادات میں توازن برقرار رہے۔ اکثر مغربی ممالک میں آئینی اصول سیکولرازم اور انسانی آزادی کے تصورات پر مبنی ہیں، جس میں مذہب کو ریاستی معاملات سے الگ ہی رکھا جاتا ہے۔

جدید آئینی معیارات کا آغاز یورپ میں سول قانون اور کامن لا کے تصورات سے ہوا، جو بعد میں دنیا کے دیگر خطوں تک پھیل گئے۔ مغربی آئینی قوانین نے انسان کے بنیادی حقوق، عدلیہ کی آزادی، اور حکومتی اداروں کے اختیارات کو محدود کرنے جیسے اصولوں کو فروغ دیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کئی اسلامی ممالک نے مغربی قوانین کے اثر کو اپنے قانونی نظام میں شامل کیا اور آئینی اصلاحات کے ذریعے اسلامی اور جدید قوانین کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مسلم ممالک کا تعامل

عصر حاضر کے مسلم ممالک میں آئینی ڈھانچہ ترتیب دیتے وقت یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کس طرح اسلامی فقہ کے اصولوں کو جدید آئینی تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ کچھ ممالک، جیسے متحدہ عرب امارات، میں اسلامی اصولوں کو جزوی طور پر آئین میں شامل کیا گیا ہے اور وہاں کی عدالتیں بھی بعض مخصوص معاملات میں شریعت کے مطابق فیصلے کرتی ہیں، مگر عمومی طور پر آزاد عدلیہ کا نظام بھی کام کرتا نظر آتا ہے۔ اس طرح کے دستوری ڈھانچے کو نہ تو اسلامی کہنا ضروری ہے اور نہ اس پر غیر اسلامی ہونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔ یہ بس ایک سماجی بندوبست ہے جس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی صریح خلاف ورزی سے بچا جا سکے۔ بہت سے مسلم ممالک میں صاف صاف اور زیادہ واضح انداز میں شریعت اور اسلامی مفاہیم و قوانین کو آئین میں مقدم رکھا گیا ہے اور کئی جدید سماجی و سیاسی مسائل میں شرعی جزئیات کو آئین کا کھلا حصہ بنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پہ، سعودی عرب اور ایران میں آئینی حیثیت رکھنے والے قوانین قرآن و سنت کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں، اور شریعت ہی ریاست کا بنیادی اصول قرار دی گئی ہے۔ اسلامی فقہ کے تحت، یہاں سود، جوا، اور غیر اسلامی سرگرمیوں پر پابندی عائد ہے، اور عدالتیں شریعت کے اصولوں کے مطابق فیصلے کرتی ہیں۔ ایران میں، مذہبی نقطہ نظر سے اجتہاد کا آئینی کردار بھی نمایاں ہے۔ آئین میں شامل "ولایت فقیہ" کے اصول کے تحت فقہاء کو قانونی تشریح میں مرکزی کردار حاصل ہے۔ اس کے برعکس، مصر اور پاکستان جیسے مسلمان ممالک میں آئین میں اسلامی اقدار کی رعایت کے اظہار کے باوجود، ان ممالک نے ایک مخلوط نظام اپنایا ہے، جسے غیر اسلامی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً پاکستان کے آئین کے مطابق، تمام قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ہونا ضروری ہے، مگر اس میں جمہوری اصولوں اور جدید شہری حقوق کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ آئین میں "اسلام کو ریاست کا مذہب" قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق اور آزاد عدلیہ جیسے جدید آئینی اصولوں کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ پاکستان میں آئینی حقوق اور اسلامی احکامات کو زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی لیے اسلامی نظریاتی کونسل کو آئینی حیثیت دی گئی ہے۔ پاکستان میں آئین کے تحت اسلامی

نظریاتی کونسل قانون سازی کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنانے میں کردار ادا کرتی ہے۔ مصر میں اسلامی اصولوں کو آئینی تشریح کے ایک معیار کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور یہاں کی عدالتیں اجتہاد کے ذریعے اسلامی قوانین کو جدید قانونی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دوسری جانب ترکی جیسے ممالک بھی ہیں جہاں آئین مکمل طور پر سیکولر ہے اور وہاں اجتہاد یا اسلامی اصولوں کا قانون سازی میں کوئی کردار تسلیم نہیں کیا جاتا۔ وہاں عدالتیں آئین کے اصولوں کو سادہ الفاظ اور عدالتی نظائر کی روشنی میں تشریح کرتی ہیں اور قانون سازی میں کسی بھی مذہبی اصول کو شامل نہیں کیا جاتا۔

مسلم ممالک میں آئین سازی میں سماجی وتاریخی عوامل کا کردار

مسلم ممالک میں آئینی اور قانونی نظام کو سماجی وتاریخی تناظر میں تشکیل دیا گیا ہے۔ سعودی عرب میں تاریخی پس منظر کے طور پر اسلامی خلافت کی تعلیمات اور وہابی تحریک کے اثرات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں کا آئین قرآن وسنت کو قانونی ماخذ قرار دیتا ہے اور جدید آئینی اصولوں کو محدود پیمانے پر قبول کیا گیا ہے۔ سعودی عرب میں قانون سازی کا عمل مکمل طور پر اسلامی فقہ پر مبنی ہے۔ پاکستان میں اسلامی اصولوں اور جدید آئینی قوانین کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخی پس منظر میں برطانوی قوانین کا اثر نمایاں ہے، تاہم، قیام پاکستان کے بعد اسلامی فقہ کے اصولوں کو آئین میں شامل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ترکی نے خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد سے جدید سیکولر ریاست کی جانب تبدیلی کا سفر اختیار کیا۔ کمال اتاترک کی قیادت میں ترکی نے اسلامی فقہ کو ریاستی امور سے الگ کر کے مکمل طور پر سیکولر آئین نافذ کیا۔ اس لیے وہاں کے آئین میں شریعت کے اصولوں کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ مغربی طرز کے اصولوں کو اپنایا گیا ہے جو شخصی حقوق، جمہوریت، اور عدلیہ کی آزادی پر زور دیتے ہیں۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد آئین میں اسلامی فقہ کو بنیادی اصول کے طور پر شامل کیا گیا۔ تاریخی پس منظر میں شیعہ فقہ کا اثر ایران کے آئینی ڈھانچے پر نمایاں ہے۔ آئین میں ولایت فقیہ کے تصور کے تحت حکومت کا نظام قائم کیا گیا ہے۔

شخصی حقوق اور شہری آزادیاں

شخصی حقوق اور شہری آزادیوں کا تحفظ ہر آئین کا بنیادی مقصد ہے۔ اسلامی فقہ اور جدید آئینی تصورات، دونوں اپنے اپنے مخصوص اصولوں اور دائرہ کار میں ان حقوق کو مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔ اسلامی فقہ میں حقوق اور ذمہ داریوں کا تصور "حقوق اللہ" اور "حقوق العباد" کے درمیان تقسیم ہے، جس کے تحت افراد کو حقوق ملتے ہیں مگر ان پر اسلامی احکام کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف، جدید آئینی معیارات شخصی حقوق کو ایک غیر مذہبی امیں بھی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کا مقصد شہری آزادیوں کو زیادہ سے زیادہ ممکن بنانا ہوتا ہے۔

فقہ میں، شخصی حقوق کی بنیادی تقسیم میں زندگی، جان، مال، اور عزت و آبرو کے حقوق شامل ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، ہر فرد کا حق ہے کہ اس کی زندگی اور جان کی حفاظت کی جائے، اور اس کے مال اور عزت کا تحفظ کیا جائے۔ قرآن اور حدیث میں اس حوالے سے واضح احکامات موجود ہیں۔ مثلاً، قرآن کی سورہ المائدہ[1] میں ایک انسانی جان کی حفاظت کو پوری انسانیت کی حفاظت کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی فقہ میں شخصی حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کی محدودیت کا بھی تذکرہ ہے، کہ بعض مخصوص حالات میں ان حقوق کو محدود یا مشروط کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر، شراب نوشی اور سود پر پابندی اسلامی معاشرت میں فرد کی آزادی کو محدود کرتی ہے۔

اس مسئلے میں عصر حاضر کے مسلم ممالک کے دساتیر کو دیکھا جائے تو زیادہ تر ممالک کے دساتیر میں شخصی حقوق کو اہمیت دی گئی ہے، مگر ان کے نفاذ میں مختلف روایات اور ثقافتی عوامل بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر، پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے شہریوں کو بنیادی حقوق دیتا ہے اور ان کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ آئین پاکستان کی دفعہ 8-28 میں شخصی حقوق جیسے آزادی، مساوات، تعلیم، اور اظہار رائے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے، مگر یہ حقوق اسلامی اصولوں کے تحت محدود بھی ہیں۔ کچھ مسلم ممالک میں شخصی حقوق کا تحفظ سیکولر انداز میں کیا گیا ہے، جیسے ترکی میں شہری حقوق کو مکمل سیکولر اصولوں پر تحفظ دیا جاتا ہے اور آئین میں مذہبی بنیادوں پر کسی خاص قانون

---

[1] 5:32

کو شامل کرنے کی گنجائش نہیں دی گئی۔ اُردن نے آئینی اصلاحات کے ذریعے شہری حقوق کے دائرہ کار کو وسعت دی ہے، جس میں خواتین کے حقوق، تعلیم اور صحت کے حقوق کا الگ سے ذکر ہے، اور انہیں آئین میں شامل کیا گیا ہے۔

مساوات اور عدل

مساوات اور عدل کی اصطلاحات جدید قومی ریاستی اور انسانی حقوق کے چارٹر کا بنیادی حصہ ہیں۔ اسلامی فقہ اور جدید آئینی نظام، دونوں میں مساوات اور عدل کو اہم اصولوں کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلامی قانون میں مساوات اور عدل کے اصول قرآن اور سنت کی بنیاد پر قائم ہیں۔ شریعت کے تحت ہر فرد کو خدا کی نظر میں برابر سمجھا جاتا ہے، اور انصاف کا تقاضا ہے کہ ہر انسان کو اس کا حق دیا جائے، قطع نظر اس کی جنس، قومیت، یا سماجی حیثیت کے۔ تاہم، اسلامی فقہ میں مخصوص معاملات جیسے مرد و خواتین کے حقوق میں اختلافات بھی ملتے ہیں۔ دوسری طرف، جدید آئینی نظام میں مساوات اور عدل کو بنیادی انسانی حقوق اور سماجی انصاف کے اصولوں کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ کئی مسلم ممالک نے اپنے آئین میں ان اصولوں کو بہ طور خاص شامل کر کے اسلامی قانون اور جدید آئینی نظام کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسلم ممالک کے آئینی ڈھانچوں میں مساوات اور عدل کے اصولوں کو اسلامی قانون کے مطابق مختلف انداز میں شامل کیا گیا ہے۔ پاکستان کا آئین مساوات اور عدل کے اصولوں کو تسلیم کرتا ہے۔ آئین کے آرٹیکل 25 میں شہریوں کی برابری کو یقینی بنانے کی بات کی گئی ہے، جس کے تحت کسی شہری کے ساتھ مذہب، جنس، یا قومیت کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ ایران میں آئین کے آرٹیکل 20 کے تحت تمام شہریوں کو مساوی حقوق فراہم کیے گئے ہیں، البتہ بعض مخصوص حقوق میں مذہبی بنیادوں پر فرق رکھا گیا ہے، جس کی وضاحت اسلامی فقہ کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ ترکی میں آئین کے آرٹیکل 10 کے تحت ہر شہری کو بلا امتیاز مساوی حقوق فراہم کیے گئے ہیں۔ ترکی کے آئین میں عدلیہ کی خود مختاری کو یقینی بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے ہیں تاکہ معاشرتی انصاف برقرار رہے۔ تونس نے 2014 میں ایک نیا آئین متعارف کروایا جس میں واضح طور پہ خواتین کے

حقوق اور مساوات کے اصول کو ساتھ ذکر کیا گیا۔ پاکستان نے حالیہ برسوں میں کچھ آئینی اور قانونی اصلاحات متعارف کرائی ہیں جن میں خواتین اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کو بہتر بنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، خواتین کے لیے تعلیم اور کام کرنے کے حقوق میں بہتری کے لیے مختلف قانونی اقدامات کیے گئے ہیں۔

سزائیں اور احتساب

اسلامی فقہ اور جدید آئینی تصورات کے تحت جرائم اور سزاؤں کا معاملہ مختلف اصولوں اور معیارات کی بنیاد پر چلتا ہے۔ اسلامی فقہ میں سزاؤں کا نظام مخصوص شرعی اصولوں پر مبنی ہے، جس میں حدود، قصاص، اور تعزیرات بھی شامل ہیں۔ اسلامی شریعت میں سزاؤں کو تین اہم اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے:

حدود : یہ وہ سزائیں ہیں جن کا تعین شریعت میں واضح طور پر کیا گیا ہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ حدود میں زنا، چوری، قذف، اور شراب نوشی جیسے جرائم شامل ہیں جن پر مخصوص سزائیں مقرر ہیں۔

قصاص : قصاص کا تصور قتل اور جسمانی نقصانات کی صورت میں انصاف کو یقینی بنانے کے لیے ہے۔ مقتول کے خاندان کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ معاف کر سکتے ہیں یا قصاص کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

تعزیرات : یہ وہ سزائیں ہیں جنہیں مسلم حکام اپنے صوابدیدی اختیارات کے تحت مقرر کرتے ہیں۔ تعزیرات کی نوعیت اور مقدار ریاستی قوانین کے تحت مختلف ہو سکتی ہے اور اس میں حکمران کے اجتہاد کا کردار بھی شامل ہوتا ہے۔

جدید آئینی اور قانونی معیارات میں سزاؤں کا تصور جدید معاشرتی اصولوں پر مبنی ہے۔ جدید دساتیر میں سزاؤں کو انسانی حقوق، منصفانہ سماعت، اور قانونی عمل کے تقاضوں کے تحت لاگو کیا جاتا ہے جس کا اپنا ایک پراسس ہوتا ہے، اور ان میں اکثر قید، جرمانہ، یا اصلاحی اقدامات شامل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آئینی تصورات میں ان سزاؤں کا مقصد مجرم کی اصلاح اور معاشرے کی بہتری کے لیے اقدامات کرنا ہوتا ہے۔ گویا جدید آئینی نظام میں جرائم اور سزاؤں کا تصور معاشرتی انصاف، انسانی

حقوق،اور قانون کی بالادستی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔

عصر حاضر میں زیادہ تر مسلم ممالک نے اپنے آئینی نظام میں شریعت کے اصولوں کو کسی نہ کسی حد تک شامل کیا ہے، تاہم، سزاؤں کے حوالے سے ان ممالک کے آئینی ڈھانچے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پہ، سعودی عرب اور ایران میں اسلامی قانون کو مکمل طور پر نافذ کیا گیا ہے اور حدود اور قصاص کے اصولوں کے مطابق سزاؤں کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ وہاں کا احتساب کا نظام شریعت پر مبنی ہے اور حدود کی سزائیں جیسے کہ زنا، چوری، اور قتل کے مقدمات میں قصاص کی سزائیں اسلامی اصولوں کے مطابق دی جاتی ہیں۔ سعودی عرب میں تعزیرات کا تصور بھی موجود ہے اور حکمران کے اجتہاد کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ پاکستان کے آئین میں اسلامی اصولوں بھی کو شامل کیا گیا ہے، اور شریعت کی روشنی میں حدود آرڈیننس کے تحت مخصوص جرائم میں حدود کی سزائیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ تاہم، پاکستان میں آئین کے مطابق انسانی حقوق کے جدید تصور پر بھی زور دیا گیا ہے اور عملی طور پہ زیادہ تر جرائم پر تعزیرات کا اطلاق ہوتا ہے، جس میں جدید قانونی اصولوں کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ تیونس میں شریعت کے اصولوں کو آئینی ڈھانچے میں محدود طور پر شامل کیا گیا ہے۔ وہاں کی قانونی سزاؤں میں حدود کا اطلاق بالکل نہیں ہوتا بلکہ تعزیرات کا نظام موجود ہے۔ مصر میں تعزیرات کا نظام اسلامی اصولوں پر مبنی ہے مگر وہاں حدود کی سزائیں نافذ نہیں کی جاتیں۔

مسلم ممالک میں دساتیر:
مذہبی نقطہ نظر اور عملی کاوشیں

اسلامی دستور میں حقوقِ انسانی کی مرکزیت

بیرسٹر ظفراللہ خان*

آئین دورِ جدید کے بنیادی اجزائے ترکیبی میں سے ہے کیونکہ یہ کسی بھی ریاست کی ساخت، نظم اور قانونی ڈھانچے کی اساس فراہم کرتا ہے۔ یہ نہ صرف ریاست کے مختلف اداروں کے اختیارات اور فرائض کو متعین کرتا ہے بلکہ شہریوں کے بنیادی حقوق، آزادیوں، اور ریاست کے ساتھ ان کے تعلق کو بھی واضح کرتا ہے۔ جدید دور میں آئین کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ یہ سیاسی، سماجی، اور معاشی استحکام کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور طاقت کے ناجائز استعمال کو روکنے کے لیے ایک موثر نظام وضع کرتا ہے۔ آئین کا وجود جمہوریت کے تسلسل اور قانون کی حکمرانی کے لیے ناگزیر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آج ہر خود مختار ریاست کے لیے ایک جامع آئینی ڈھانچہ وقت کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔

سماجیات کی تنظیم کی کے لیے قدیم تاریخ میں بہت سے قوانین وضع کیے جاتے رہے ہیں، لیکن انہیں آئین نہیں کہا جاسکتا۔ تقریباً 1754 قبل مسیح میں بابل کی تہذیب کے حکمران حمورابی نے ایک قانون ترتیب دیا تھا۔ یہ قانون نہ صرف اُس وقت کی سماجی زندگی کا عکس پیش کرتا ہے بلکہ قانون سازی کی ابتدائی کوششوں کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔ حمورابی کے قوانین پتھر پر کندہ تھے اور عوامی مقامات پر نصب کیے گئے تاکہ ہر فرد ان سے واقف ہو سکے۔ ان قوانین کا مقصد انصاف کی فراہمی، سماجی نظم و ضبط کو برقرار رکھنا، اور کمزور طبقے کو طاقتور کے ظلم سے بچانا تھا۔ حمورابی کے قوانین ایک تحریری ضابطہ تھے، جو مخصوص اصولوں اور قواعد و ضوابط پر مبنی تھے، لیکن یہ جدید معنوں میں "دستور"

---

*سابق وزیر قانون پاکستان

نہیں تھے کیونکہ ان میں وہ جامع سیاسی، قانونی، اور سماجی ڈھانچے شامل نہیں تھے جو ایک جدید آئین یا دستور کا حصہ ہوتے ہیں۔ حمورابی کے بعد جو بہتر شکل میں قانون کی شکل سامنے آئی تھی وہ رومیوں نے متعارف کرائی تھی۔ بہر حال یہ دستور نہیں تھے۔

دستور کی شکل میں دنیا کا پہلا تحریری مسودہ میثاق مدینہ تھا۔ کئی مغربی مفکرین کا بھی یہی دعوی ہے۔ جب نبی پاک ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو آپ نے مختلف قبائل سے مذاکرات کیے۔ ڈیڑھ سے دو سال مذاکرات کر کے مختلف قبائل سے معاہدے کرنے کے بعد چارٹر آف مدینہ تحریر کیا گیا، جس کی 52 دفعات ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کی مسلم سلطنتوں میں یہ تصور راسخ رہا کہ مسلمانوں کا دستورِ حیات قرآن و سنت سے متعین ہوتا ہے اور اس پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے فقہی شکل میں بہت سی کتب تصنیف کی جاتی رہیں، جو بنیادی طور پہ قانون ہی تھیں۔ اگرچہ بعد میں عثمانیوں نے 'مجلہ الاحکام العدلیہ' شائع کیا، اور مغلیہ سلطنت میں فتاوی عالمگیری بھی اسی طرح کی قانونی کوششیں تھی۔

جدید دور میں دستور کی تاریخ کا آغاز عام طور پر 17ویں اور 18ویں صدی کے یورپ سے کیا جاتا ہے، جب قومی ریاستوں کے سیاسی نظاموں میں عوامی حقوق اور حکومتی ڈھانچے کو منظم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس کا پہلا نمایاں مظہر 1215ء میں میگنا کارٹا تھا، جو انگلینڈ میں بادشاہ کے اختیارات کو محدود کرنے اور عوام کے حقوق کو تسلیم کرنے کی ایک ابتدائی کوشش تھی۔ تاہم، جدید دستور سازی کی بنیاد 18ویں صدی میں امریکی آئین (1787ء) اور فرانسیسی انقلاب (1789ء) کے دوران رکھے گئے اصولوں پر استوار ہوئی۔ ان دستاویزات نے عوامی حاکمیت، بنیادی حقوق، اور قانون کی حکمرانی کے تصورات کو آئینی حیثیت دی۔ 19ویں اور 20ویں صدی میں یہ روایت دنیا بھر میں پھیل گئی، اور مختلف ممالک نے اپنے تاریخی، سماجی، اور سیاسی سیاق و سباق کے مطابق آئین تشکیل دیے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا. (سورۃ الاسراء، آیت: ۷۰)

(اور بلاشبہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔ انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا۔ انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ ہم نے جو مخلوق پیدا کی ان میں بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا کی)

انسانی حقوق کی تحریک جنگ عظیم دوم (WW-II) کے بعد جلد ہی طاقت پکڑنے لگی۔ اقوام متحدہ (UNO) نے 1948ء میں عالمگیر اعلان انسانی حقوق (Universal Declaration of Human Rights) کی دستاویز تیار کر لی۔ 1966ء میں اقوام متحدہ نے بین الاقوامی معاہدہ برائے شہری و سیاسی حقوق (International Covenant on Civil and Political Rights) اور بین الاقوامی معاہدہ برائے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق (International Covenant on Economic, Social and Cultural Rights) تیار کر لیے۔ خواتین سے امتیازی سلوک برتنے کی ممانعت کا کنونشن (The Convention on Elimination of all forms of Discrimination Against Women) 1981ء میں نافذ ہوا اور کنونشن برائے حقوق بچگان (Convention on the Rights of the Child) 1990ء میں نافذ ہوا۔ اس کے علاوہ عالمی برادری نے انسانی حقوق کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں سینکڑوں اعلانات، معاہدات اور دستاویزات تیار کیں اور متفقہ قرار دادیں منظور کر لیں۔ حقوق انسانی کی اس ساری تحریک کو ہم اہل اسلام مغرب کی سازش اور ہتھکنڈہ سمجھتے ہیں۔ اس کے سبب ہم نے ان تحاریک کے خلاف ایک منفی اپروچ اختیار کر لی ہے جو سخت نقصان دہ ہے۔

مذہب انسانی احترام سکھاتا ہے۔ اسلام نے روز اول سے انسان کو اپنی تعلیمات کا مرکز بنایا ہے۔ حضرت آدمؑ و ابلیس کی کہانی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انسان صاحب شرف ہے۔ مسجود ملائکہ ہے۔ توریت، زبور، انجیل اور قرآن پاک کا مقصد انسانیت کی فلاح و ترقی ہے۔ دنیا میں انصاف قائم کرنا ہے۔ قانون کی حکمرانی لانا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انسانیت کے شرف کی تکمیل کی۔ عہد نامہ قدیم وجدید (زبور، توراۃ، انجیل) کا نصب العین بھی بنی نوع انسان کی عظمت کی پہچان اور اس کی ترقی و بہبود ہے۔ زبور شریف (Psalm) میں ارشاد ہے:

(۱) انسان ہے کیا کہ تو اس کے بارے میں متفکر ہے۔ وہ اولاد انسان ہے جسے تو ملتار ہتا ہے۔

(۲) کیونکہ تو نے اس کو فرشتوں سے کچھ ہی کم بنایا ہے اور اس کے سر پر عزت و عظمت کا تاج رکھا ہے۔

(۳) تونے اپنے ہاتھوں سے بنائی دنیا پر اس کو غلبہ عطا کیا ہے اور سب چیزوں کو اس کے پاؤں تلے دے دیا ہے۔

(۴) تمام بھیڑیں اور بیل اور کھلے میدانوں میں گھومنے والے جانور۔

(۵) ہوا میں اڑتے پرندے، سمندروں میں تیرتی مچھلیاں اور جو کچھ بھی خشکی کے راستوں اور سمندروں کے درمیان ہے۔

(۶) اے خداوند عالم! تیرا کتنا شاندار نام ہے جو ساری روئے زمین پر گردش کر رہا ہے۔

قرآن مجید (سورۃ الاسراء، آیت: ۷۰) میں اللہ تعالیٰ نے انسانی حقوق پر بہت زور دیا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا.

(اور بلاشبہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔ انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا۔ انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ ہم نے جو مخلوق پیدا کی ان میں بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا کی)

قرآن مجید نے تصور احترام آدمیت کا مختلف طریقوں اور مختلف سیاق و سباق میں اظہار کیا ہے۔ ایک تو وقار انسانی کی براہ راست اور غیر مشروط توثیق ہے جو جملہ عالم انسانیت کے احترام و وقار کی قدر شناسی کے سلسلے میں اظہر من الشمس اور جامع ترین ہے۔ جس میں کسی قسم کے رنگ و نسل عقیدہ یا صنف کی کوئی حد بندیاں یا شرائط نہیں ہیں۔

(۱) اہم ترین انسانی حق اس کا زندہ رہنے کا حق اور انسانی زندگی کا احترام ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا. (سورۃ المائدہ، آیت: ۳۲)

(جو کوئی کسی نفس کو قتل کرے جبکہ یہ قتل نہ کسی اور جان کا بدلہ لینے کے لیے ہو اور نہ کسی کے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے، تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ جو شخص کسی کی جان بچالے تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ.(سورۃ الانعام، آیت: ۱۵۱)

(ناحق کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے)

یہ آیات ہر انسان پر لازم قرار دیتی ہیں کہ وہ کسی بھی حال میں انسانی جان نہ لے۔ اگر کسی نے ایک انسان کو قتل کیا تو ایسا سمجھا جائے گا کہ اس نے ساری انسانی نسل کو قتل کر دیا ہے۔ یہاں ایک انسان کو قتل (homicide) کو انصاف کے تقاضے کے تحت 'انہدامِ زندگی' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی صحیح قانونی عدالت کے فیصلے کی شرط لگائی ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کیا اس شخص نے دیگر انسانوں کے حقِ زیست اور امن سے لاپرواہ ہو کر ایسا اقدام کیا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے حقِ زیست کو ضبط کرا بیٹھا ہے۔ اس طرح جان لینا، اُس جان لینے کے برعکس ہے۔

قرآن مجید بیان کرتا ہے:

وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا.(سورۃ المائدۃ، آیت: ۳۲)

(جو شخص کسی کی جان بچالے تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی)

کسی شخص کو موت سے بچانے کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہے، یا زخمی ہے یا بھوکوں مر رہا ہے اس کا علاج کر دیا گیا یا کھانا وغیرہ کھلا کر زندہ رہنے کے قابل بنا دیا گیا۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسے عارضوں میں مبتلا افراد کی بلا امتیاز رنگ و نسل اور قومیت و مذہب زندگیاں بچائیں۔

وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ خٰلِدًا فِیْھَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا.
(سورۃ النساء، آیت: ۹۳)

(اور جو کوئی مومن کو ارادتاً قتل کر دے، اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس (قاتل) پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔ اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے)

(۲) اسلام معاشی حقوق کو تسلیم کرتا ہے جس کے لیے قرآن مجید (سورۃ الذاریات، آیت: ۱۹) اپنے پیروکاروں کو یوں حکم دیتا ہے:

وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ.

(اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق تھا)

بالفاظ دیگر ایک طرف وہ اپنے رب کا حق پہچانتے ہیں۔ دوسری طرف بندوں کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے کہ وہ اپنے مال میں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، صرف اپنے بال بچوں ہی کا حق نہیں سمجھتے۔ ان کو احساس ہے کہ ہمارے اس مال میں ہر اس بندۂ خدا کا حق ہے جو مدد کا محتاج ہو اور کسی وجہ سے سوال نہ کر سکتا ہو۔

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا (صحیح بخاری، ج: ۱، رقم الحدیث: ۲۱۳۷) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں روزِ قیامت تین افراد کا مخالف ہوں گا:

(ا) وہ شخص جو میرے نام کی قسم کھاتا ہے مگر دغابازی کرتا ہے؛

(ب) وہ شخص جو کسی آزاد فرد کو غلام ظاہر کر کے فروخت کر دیتا ہے اور اس قیمت کو کھا جاتا ہے؛

(ج) جو شخص کسی سے مزدوری کراتا ہے اور اس سے پورا کام لیتا ہے مگر اس کی اجرت ادا نہیں کرتا۔

(۳) اسلام انصاف پر بہت زور دیتا ہے۔ اس بات کو قرآن مجید میں یوں واضح کیا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. (سورۃ الحدید، آیت: ۲۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں)

وہ مقصد وحید جس کے لیے حضرت آدمؑ سے لے کر حضور نبی اکرم ﷺ تک، سارے انبیاءؑ بھیجے گئے وہ تین چیزوں (واضح نشانیوں، کتابوں اور میزان) کے ساتھ آئے تاکہ دنیا میں بنی نوع انسان کا طرز عمل اور نظامِ زندگی، انفرادی اور اجتماعی، دونوں انصاف کے ساتھ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کے حقوق، اپنے حقوق اور جن لوگوں کے ساتھ اسے رہنا ہے، ان کے حقوق سے واضح طور پر آگاہ رہے اور اسے سب حقوق پوری ایمانداری سے ادا کرنے ہیں۔ اس طرح اجتماعی زندگی کے نظام (معاشرہ) میں سے ہر طرح کی ناانصافی دور کر دی جائے۔ معاشرتی زندگی کو انتہا پسندی سے تحفظ دیا جائے۔ اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں صحیح توازن اور عدل و احسان قائم کیا جائے تاکہ

معاشرے کے جملہ اجزا (عناصر) انصاف کے ساتھ اپنے اپنے حقوق پائیں اور اپنے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ایمانداری کے ساتھ ادا کریں۔

بہ الفاظ دیگر تمام انبیاءؑ کو بھیجنے کا مقصد انفرادی اور اجتماعی انصاف کا قیام تھا۔ وہ پروردگار کی طرف سے ہدایت کے مطابق ہر فرد کی ذاتی زندگی میں، اس کے ذہن میں، اس کے کردار میں، اس کے طرز عمل اور کاروبار میں ایک توازن، ضبط و اعتدال پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی وہ پورے انسانی معاشرے کو بھی انصاف کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے تھے تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ روحانی، اخلاقی اور مادی طور پر معاون بنیں، نہ کہ ایک دوسرے کے لیے راستے کی رکاوٹ بن جائیں۔ (تفہیم القرآن، ذیل آیت مذکورہ)

اس طرح قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا. (سورۃ المائدہ، آیت: ۲)

(اور دیکھو ایک گروہ نے جو تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو)

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى. (سورۃ المائدہ، آیت: ۸)

(کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا. (سورۃ النساء، آیت: ۱۳۵)

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عدل و انصاف پر مضبوطی کے ساتھ گواہی دینے والے ہو جاؤ۔ چاہے وہ تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ داروں، عزیزوں کے۔ وہ امیر ہو یا غریب اللہ تعالیٰ ان دونوں کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ تم خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑو اور اگر تم نے غلط بیانی یا پہلو تہی کی تو جان لو جو کچھ تم کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے)

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ. (سورۃ النساء، آیت: ۵۸)

(اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو)

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ. (سورۃ الانعام، آیت: ۱۶۴)

(کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے)

(۴) اسلام لوگوں کے درمیان بلا امتیاز رنگ و نسل اور قومیت و مذہب قطعی مساوات پر یقین رکھتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى. (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳)

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا)

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ. (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳)

(اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ. (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۱)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد نافرمانی کرنا بری بات ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا. (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۲)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بدگمانی کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ بہت سی بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔ جاسوسی نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا. (سورۃ النور، آیت: ۲۷)

(اے یمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، جب تک کہ گھر والوں سے اجازت اور انہیں سلام کہہ لو)

(۵) اسلام مذہب اور ضمیر کی آزادی کا تحفظ کرتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ. (سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۵۶)

(دین کے بارے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے)

(۶) حضور نبی کریم ﷺ نے انسانی عزت و تکریم کی تکمیل فرمادی۔ میثاقِ مدینہ اور خطبۂ حجۃ الوداع متذکرہ بالا جملہ تعلیماتِ قرآن مجید کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ خطبہ حجۃ الوداع انسانی حقوق کا پہلا باقاعدہ منشور تھا۔ اس کے نمایاں نقوش میں درج ذیل امور شامل تھے:

(ا) اے لوگو! جس طرح تم اس مہینے، اس دن اور اس شہر کو مقدس سمجھتے ہو اسی طرح تم ہر مسلمان کی زندگی اور اس کی املاک کو ایک مقدس امانت سمجھو۔

(ب) کسی کو گزند نہ پہنچاؤ تاکہ تمہیں بھی کوئی گزند نہ پہنچائے۔

(ج) تم ناانصافی نہ مسلط کروگے اور نہ برداشت کروگے۔

(د) اے لوگو! عورتوں کے تم پر حقوق ہیں اور اسی طرح تمہارے عورتوں پر حقوق ہیں اس لیے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا اور ان پر شفقت کرنا کیونکہ وہ تمہاری شریک کار اور پرخلوص مددگار ہیں۔

(ح) تمام بنی نوع انسان حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ سے ہی پیدا ہوئے۔ ایک عربی کو ایک عجمی پر کوئی فوقیت نہیں اور نہ ایک عجمی کو ایک عرب پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ نیز ایک سفید فام کو کسی سیاہ فام پر اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سفید پر کوئی فوقیت حاصل ہے ماسوائے تقویٰ اور اعمالِ صالحہ کے۔

(و) جان لو کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان اکٹھے ہو کر ایک اخوت بن چکے ہیں۔

کسی مسلمان کے لیے وہ چیز حلال نہیں ہے جو اس کے ساتھی مسلمان کی ہے تاوقتیکہ وہ اپنی آزاد مرضی اور ارادے سے اس کو وہ چیز دے دے۔

(ض) اپنے آپ سے ناانصافی نہ کرنا۔

قرآن مجید انسانی حقوق کے محترم ہونے کی یہ وجہ بتاتا ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (سورۃ الاعراف، آیت: ۵۲)

(اور بلاشبہ ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے علم کے ساتھ خوب کھول کر بیان کیا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے)

انسانوں کے لیے رحم وہ صفت (value) ہے جس کے اندر نرم مزاجی، توجہ، رواداری، محبت اور عفو جیسے جذبات پائے جاتے ہیں۔ جب ان خصوصیات کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ بندوں کے لیے ان کے خالق کی رحمت کا ایک عکس ہوتی ہیں۔ قرآن مجید واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ساری مخلوقات کے لیے رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صرف اپنے خاندان، دوستوں یا عرب قوم یا ساتویں صدی عیسوی کے یا ہمیشہ آنے والے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سارے جہانوں کے لیے رحمت بنایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ (سورۃ الانبیاء، آیت: ۱۰۷) ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ.

(اے نبی ﷺ! ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

حضور نبی اکرم ﷺ رحمتِ مجسم تھے۔ آپ ﷺ اپنے ارد گرد کے تمام لوگوں، خاندانوں، یتیموں، دوست احباب، اجنبیوں حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی شفقت فرماتے تھے۔ آیئے ایک مثال آپ ﷺ کی سوانح حیات سے لیتے ہیں۔ آپ ﷺ مسجد نبوی میں اپنے خادموں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ایک بدو آیا اور اس نے مسجد نبوی کے صحن میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ کرامؓ اٹھ کر بھاگے تاکہ اس کو روکیں۔ آپ ﷺ نے سختی سے فرمایا کہ اسے تنگ نہ کرو۔ پیشاب کرنے دو۔ اس کی مجبوری ہو گی۔ قربان جائوں یہ تھے ہمارے نبی ﷺ۔ ہم حضور نبی کریم ﷺ کے غلام کہلانے کا دعویٰ

کرتے ہیں لیکن دوسرے مسلمان کو اپنی مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دیتے۔ کیا نسبت ہے؟ کیا قربت ہے؟ کیا بعد المشرقین ہے؟ تو کجا و من کجا۔

حضور نبی کریم ﷺ اپنے ماحول اور جانوروں کا بھی خیال رکھتے اور ان کے ساتھ رحم کا سلوک کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے الفاظ واضح کر دیتے ہیں کہ بے چارے جانوروں کو اذیت دینا نہ صرف نا قابل قبول ہے بلکہ ہم ایسی حرکتوں کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ بھی ہیں۔

(۱) حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کھیل تماشے کے لیے ایک چڑیا کو مار دیتا ہے تو وہ چڑیا روزِ قیامت فریاد کرے گی: اے اللہ تعالیٰ! اس شخص نے مجھے خواہ مخواہ قتل کر دیا تھا۔ اس نے یہ کام کسی مفید مقصد کے لیے نہیں کیا تھا۔ (سنن نسائی، ج: ۳، رقم الحدیث: ۴۵۵۷)

(۲) حضور نبی پاک ﷺ اگر کسی جانور پر زیادہ بوجھ لدا ہوا دیکھتے یا لاغر حالت میں پاتے تو اس کے مالک سے ارشاد فرماتے کہ جانوروں سے سلوک کرتے ہوئے خدا سے ڈرا کرو۔ (مسند احمد، ج: ۱، رقم الحدیث: ۱۶۶۲)

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ اپنی کسی حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ ہم نے ایک چھوٹی چڑیا دیکھی اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے اس کے دونوں بچے پکڑ لیے، تو وہ چڑیا آئی اور (انہیں حاصل کرنے کے لیے) تڑپنے لگی۔ اتنے میں آپ ﷺ تشریف لے آئے اور آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کس نے اس کے بچے لے کر اسے تکلیف پہنچائی ہے؟ اس کے بچے اسے واپس لوٹا دو۔ آپ ﷺ نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی جسے ہم نے جلا ڈالا تھا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کس نے جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم نے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آگ کے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کے لیے آگ کی سزا دینا مناسب نہیں ہے۔ (سنن ابوداؤد، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۸۵۶)

(۴) حضور نبی کریم ﷺ ایک راستے پر سے گزر رہے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین

ساتھ تھے۔ راستے میں ایک کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں راستہ چھوڑ دینا چاہیے ورنہ کتیا پریشان ہو گی۔ بچے دودھ نہیں مکمل کر سکیں گے۔

یہ تعلیمات حضور نبی کریم ﷺ کے کردار کی عکاسی کرتی ہیں جن کے اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ﷺ ہونے پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ آج مشرق اور مغرب کے مسلمانوں میں اس اخلاقی کردار کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی۔ ہم وہ لوگ ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ کے سچے پیروکار ہونے کا دعویٰ تو رکھتے ہیں لیکن آپ ﷺ کے پر عظمت کردار کا ہم میں کوئی شائبہ تک پایا جاتا ہے؟

جدید دنیا نے انسانی حقوق پر بہت زور دیا ہوا ہے۔ ہم مسلم معاشرے کے لوگ، بد قسمتی سے اسلام کی واضح تعلیمات کے برعکس انسانی حقوق کی جدید تحریک کو اسلام کے خلاف چال اور سازش قرار دیتے ہیں۔ نتیجتاً ہم نے اس مسئلے کے بارے میں منفی ذہن بنا لیا ہے جو کہ بہت نقصان دہ ہے۔ ہم پر تو اپنی تاریخ کے لحاظ سے بھی ایک ذمہ داری تھی کہ انسانی حقوق کی تحریک کا آغاز ہم خود کرتے اور اس کی رہنمائی کرتے۔ ہم انسانی حقوق کے محافظ ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات اور حضور نبی کریم ﷺ کے آخری خطبے اور دیگر احادیث میں مذکور ہے۔ لیکن الٹا ہم نے رجعت پسندانہ اور منفی طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں یہ رویہ اسلام کے نصب العین سے مطابقت نہیں رکھتا۔

ہم اپنے ورثے سے ہمکنار ہو سکتے ہیں اور آج کی دنیا سے ہم آہنگ اور ہمقدم ہو کر چلنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہم جدید دنیا پر اسلامی اقدار کے اطلاق کے لیے کھلے ذہن سے کوئی بھی قابل عمل طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ہم جدید انسانیت کے ان طور طریقوں سے اختلاف کر سکتے ہیں جو ہمارے نظام عقائد سے متصادم ہو۔ ہم اپنے عقائد سے مطابقت رکھنے والے طریقوں کو مثبت انداز میں قبول کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ صحیح بخاری، امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد دائود راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۲۔ تفہیم القرآن، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ لاہور: الاصلاح کمیونیکیشن نیٹ ورک، ۱۹۹۹ء۔

۳۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ ترجمہ مولانا محمد ظفر اقبال۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ سنن ابو دائود، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

مسلم ممالک کے دساتیر کی جامعیت

ایک تقابلی جائزہ

کسی ملک کا آئینی ڈھانچہ اس کے قانونی اور سیاسی منظر نامے کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسلامی ممالک میں، دساتیر اکثر اسلامی اصولوں اور جدید قومی ریاستی ڈھانچوں کے مشترک آثار کی عکاسی کرتے ہیں۔ ذیل میں مختلف مسلم اکثریتی ممالک کے دساتیر کی جامع درجہ بندی ایک کاوش کی گئی ہے۔ یہ درجہ بندی اسلامی اصولوں کی پیروی، انسانی حقوق کی حفاظت، جمہوریت کے فروغ، اور قانون کی حکمرانی کی بنیاد پر کی گئی ہے۔[1]

دساتیر کے تجزیے کے عمل میں کئی اہم عوامل کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ درجہ بندی کی بنیاد کچھ کیفی اور مقداری جائزوں پر مبنی ہے، جن میں یہ امور اہم ہیں:

- اسلامی اصولوں کی پیروی :آئین میں اسلامی اقدار اور اصولوں کی مؤثر شمولیت۔
- انسانی حقوق کا تحفظ :ان دفعات کا جائزہ جو شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کی ضمانت دیتی ہیں، جیسے مذہبی آزادی، صنفی مساوات، اور اقلیتی حقوق۔
- جمہوری حکمرانی :آئین کا تجزیہ کہ آیا یہ جمہوری اداروں، انتخابی عمل، اور سیاسی تنوع کو فروغ دیتا ہے۔

---

[1] اس درجہ بندی کے لیے ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

Abou El Fadl, Khaled. Islamic Law and Muslim Minorities: The Rights of Non-Muslims in Islamic Law. New York: NYU Press, 2016.

Brown, Nathan J. Constitutions in a Nonconstitutional World: Arab Basic Laws and the Challenge of Democratisation. New York: Cambridge University Press, 2013.

Hossain, Kamrul. "Islamic Law and Human Rights in Bangladesh." Asian Journal of Comparative Law 14, no. 1 (2019): 69-98.

Khamenei, Ali. "Islamic Government: Governance of the Jury.

- قانون کی حکمرانی :آئین میں قانون کی حکمرانی، عدلیہ کی آزادی، اور قانونی جوابدہی کی ضمانت۔
- معاشی حقوق : تعلیم، صحت، اور سماجی بہبود سے متعلق دفعات کا جائزہ، جو ریاست کی معاشی ترقی کے عزم کو ظاہر کرتی ہیں۔

کئی مسلم ممالک ایسے ہیں کہ جن کا دستور متعدد حوالوں سے مؤثر ہے اور وہ ترقی یافتہ معاشرے بھی ہیں، مگر ان میں اسلامی اصولوں کا اتنا لحاظ نہیں کیا گیا، یا انہوں نے اپنے آئین کو سیکولر قرار دیا ہوا، اس لیے وہ اس فہرست میں شامل نہیں ہوں گے۔ جیسے ترکی کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں آئین میں اسلامی اصولوں کا ذکر کم ہے اور اس کا آئینی ڈھانچہ زیادہ تر سیکولر بنیادوں پر قائم ہے۔ ترکی نے 1982 میں آئین میں تبدیلیاں کیں اور اس کے بعد 2002 میں مزید ترامیم کی گئیں، مگر یہ ترامیم اسلامی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نہیں کی گئیں بلکہ یہ زیادہ تر سیکولر نظام کو مضبوط بنانے کے لیے تھیں۔ اس کے آئین میں اسلامیت کا انڈیکس اس وجہ سے صفر یا بہت کم ہے، کیونکہ ترکی نے اپنے آئینی نظام میں اسلامی قوانین کو شامل نہیں کیا اور اسے مکمل طور پر سیکولر رکھا ہے۔ ترکی کے آئین میں اسلام کے تذکرے کو محدود رکھنے کا سبب اس کی سیکولر تاریخ اور مصطفیٰ کمال اتاترک کی اصلاحات ہیں جن میں مذہب کو ریاستی معاملات سے الگ رکھنے پر زور دیا گیا تھا۔

مذکورہ پانچ بالا خصائص کی روشنی میں اگر مسلم دنیا کے دساتیر کا تجزیہ کیا جائے کہ کونسے ممالک کے دساتیر میں ان کا زیادہ لحاظ کیا گیا ہے، تو ان میں سے چند اہم ممالک کی درجہ بندی اس طرح سامنے آتی ہے[2]:

ملائشیا کا دستور (85)

ملائیشیا کا آئین اسلامی اصولوں اور جمہوری حکمرانی کے مؤثر امتزاج کی سب سے بہترین مثال ہے۔ آرٹیکل 3 میں وفاق کا مذہب اسلام بیان کیا گیا ہے، لیکن آئین غیر مسلموں کے لیے مذہبی آزادی کی

[2] ان میں سے ہر کی درجہ بندی نمبرز کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ 100 میں کچھ نمبرز دیے گئے ہیں، تاکہ تفہیم میں آسانی ہو۔

پوری ضمانت بھی دیتا ہے۔ قانونی ڈھانچے میں اسلامی قانون کا اثرات موجود ہیں، خاص طور پر شخصی حیثیت کے معاملات میں۔ جبکہ ملک میں پارلیمانی جمہوریت کو یقینی بنانے کے لیے بہتر اقدامات وضع کیے گئے ہیں۔ ملائیشیا کا آئین انسانی حقوق، بشمول تعلیم اور صحت کے حق کی بھرپور واقعاتی ضمانت دیتا ہے اور عملی سطح پر ان اقدامات کو یقینی بنانے کے لیے آئین میں عمدہ اور شفاف توضیحات دی گئی ہیں۔ اس میں اقلیتی حقوق کے تحفظ کے لیے کئی دفعات موجود ہیں، جو کثیر الثقافتی معاشرے کو فروغ دینے کے لیے ہیں۔

تیونس کا دستور (82)

عرب بہار کے بعد، تیونس نے ایک نیا آئین بنایا جو انسانی حقوق اور جمہوری اصولوں پر زور دیتا ہے جبکہ اسلام کو ریاست کا مذہب تسلیم کرتا ہے۔ یہ آئین مسلم دنیا کا دوسرا بہترین دستور ہے۔ یہ آئین عقیدے اور مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور صنف اور مذہب کی بنیاد پر امتیاز کو مسترد کرتا ہے۔ تیونس کی جمہوری اقدار اور معاشرتی انصاف کے عزم کی عکاسی آئین کی بہت سی دفعات میں ہوتی ہے۔ اسی طرح شہری آزادیوں کے لیے آئین کا مزاج کا ترقی پسندانہ ہے۔ پھر اس میں یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی و شہری حقوق اور طاقت کی تقسیم سے متعلق دفعات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طریق کار بھی واضح ہو۔ اس آئین پر ملک میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

اُردن کا دستور (78)

اُردن کا آئین اعتدال پسند اسلامی اصولوں کو قبول کرتا ہے اور انہیں بادشاہتی نظام حکومت کے خاص دائرے میں فعال کرتا ہے۔ یہ شہری آزادیوں، سیاسی تنوع، اور جمہوریت کے عزم کو یقینی بناتا ہے۔ اردن کے آئین میں بنیادی طور پہ اعتدال کا خیال بہت زیادہ رکھا گیا ہے، اور عوامی بہبود پر بھی زور کافی ہے۔ اس لیے اسے عوام پسند دستور کہا جاتا ہے۔

مراکش کا دستور (75)

مراکش کا آئین 2011 میں ترمیم کے بعد جمہوری اصلاحات کو قبول کرتا ہے اور انسانی حقوق کی مکمل

ضمانت دیتا ہے۔ یہ اسلام کو ریاست کا مذہب تسلیم کرتا ہے، مگر نظامِ سیاست میں بادشاہت کی طاقت کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ مراکش کے آئین میں صنفی مساوات اور اقلیتوں کے ثقافتی حقوق کے تحفظ کے لیے تفصیلی نکات اور دفعات موجود ہیں جن پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مراکش میں اقلیتیں خود کو سو فیصد محفوظ تصور کرتی ہیں۔

انڈونیشیا کا دستور (68)

انڈونیشیا کا آئین مذہبی آزادی اور جمہوریت کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح یہ تنوع کی بھرپور حمایت کرتا ہے چاہے وہ نسلی ہو یا مذہبی۔ مقامی سطح پر اسلامی قانون کے نفاذ میں فرق پایا جاتا ہے جس کی توضیح آئین میں بھی موجود ہے اور اس تقسیم میں بھی عوامی پسند و ترجیحات کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس آئین کا سب سے مضبوط پہلو یہ ہے کہ یہ مختلف ثقافتوں میں ہم آہنگی کو فروغ دیتا ہے۔

پاکستان کا دستور (65)

پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کی بھی ضمانت دیتا ہے، البتہ بعض اقلیتی حقوق کے مسائل کے باعث اسے تنقید کا سامنا کرتا ہے۔ اسی طرح آئین میں سربراہ حکومت کے مسلم ہونے کی بھی شرط لاگو ہے۔ کچھ معاملات میں واضح تفریق کے باوجود آئین میں اسلامی احکام کے ساتھ ساتھ بنیادی حقوق کی دفعات بھی شامل ہیں، جو کہ غیر مسلموں کی حقوق کی ضمانت دیتی ہیں۔

بنگلہ دیش کا دستور (63)

بنگلہ دیش کا آئین اسلام کو ریاستی مذہب تسلیم کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق اور آزادیوں کے تحفظ کی کوششیں بھی بات کی گئی ہے۔ آئین میں متعدد حوالوں سے آزادیوں کی دفعات شامل ہیں، جو خصوصاً کمزور طبقات اور اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔

مصر کا دستور (60)

مصر کا آئین دینِ اسلام کو ریاست کا مذہب تسلیم کرتا ہے۔ انفرادی حقوق کی دفعات بھی اس میں

شامل ہیں، البتہ ان کے نفاذ میں عدم استحکام اور مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ آئین میں عقیدے کی آزادی اور امتیازی سلوک کی ممانعت کی دفعات بھی شامل ہیں۔اس کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ نئی ترامیم کے بعد اس میں عسکری ادارے کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

سعودی عرب(60)

سعودی عرب کا آئین ایک رسمی تحریری آئین کے بغیر ہی، اسلامی قانون پر مبنی ہے، جو شہری آزادیوں کی حدود کو واضح کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی پاسداری کے باوجود، ملک کی ثقافت میں مضبوط روایات کی عکاسی ہوتی ہے۔

ایران(58)

ایران کا آئین اسلامی حکومت کے قیام پر زور دیتا ہے مگر اس پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور سیاسی تنوع کی کمی کے باعث تنقید کی جاتی ہے۔ایرانی آئین میں سب سے زیادہ اسلامی اصولوں اور اقدار کا اعادہ نظر آتا ہے، جو قوم کی ثقافتی شناخت کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

اسلامی ممالک کے دساتیر کی درجہ بندی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی اصولوں کی پیروی اور ساتھ میں انسانی حقوق کے تحفظ کی کوششیں، دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، البتہ مختلف سیاسی اور سماجی چیلنجز ان کے مؤثر نفاذ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو پانچ اسلامی و جمہوری خصائص کی روشنی میں مسلم ممالک کے دساتیر عمدہ درجہ بندی میں بہت زیادہ شامل نہیں ہوتے۔ صرف چند ممالک ہیں جو کامیابی کے ساتھ اور بغیر کی کسی طبقاتی امتیاز کے، آئین کو مرتب کرتے ہیں۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلم دنیا میں آئینی اصلاحات کی ضرورت ہے تاکہ وہ اسلامی اصولوں کے ساتھ ساتھ، عالمی انسانی حقوق کے معیارات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکیں اور جمہوریت کو اچھے سے فروغ دیا جا سکے۔

او آئی سی کے مسلم رکن ممالک کے دساتیر میں اسلامی عنصر

اگر صرف اسلامی شقوں اور اسلامی شناخت پر زور کے اعتبار سے دیکھا جائے تو او آئی سی میں شامل مسلم ممالک کی درجہ بندی اسلامی دفعات کی، شرح کے اعتبار سے یہ درجہ بندی سامنے آتی ہے[3]۔

تعداد	ممالک	اسلامی دفعات کی شرح
1	ایران، 1979 (ترمیم 1989)	26
2	سعودی عرب، 1992 (ترمیم 2005)	23
3	مالدیپ، 2008	17
4	پاکستان، 1973 (ترامیم 2002، ترمیم (2024,2012)	16
5	صومالیہ، 2012	14
6	یمن، 1991 (ترمیم 2001)	13
7	بحرین، 2002	11
8	عراق، 2005	11
9	الجزائر، 1963 (ترمیم 2008)	9
10	موریتانیہ، 1991 (ترمیم 2012)	9
11	سوڈان، 2005	9

[3] اس درجہ بندی کے لیے ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

Abou El Fadl, Khaled. Islamic Law and Muslim Minorities: The Rights of Non-Muslims in Islamic Law. New York: NYU Press, 2016.

Brown, Nathan J. Constitutions in a Nonconstitutional World: Arab Basic Laws and the Challenge of Democratisation. New York: Cambridge University Press, 2013.

Hossain, Kamrul. "Islamic Law and Human Rights in Bangladesh." Asian Journal of Comparative Law 14, no. 1 (2019): 69-98.

Khamenei, Ali. "Islamic Government: Governance of the Jury

تعداد	ممالک	اسلامی دفعات کی شرح
12	مصر،2013	8
13	لیبیا،2011	8
14	عمان،1996(ترمیم2011)	8
15	قطر،2003	7
16	کویت،1962(دوبارہ1992)	7
17	مراکش،2011	7
18	متحدہ عرب امارات،1971(ترمیم2004)	6
19	کوموروس،2001(ترمیم2009)	5
20	برونائی،1959(ترمیم1984)	5
21	ملائیشیا،1957(ترمیم1996)	5
22	شام،2012	5
23	یوگنڈا،1995(ترمیم2005)	5
24	تیونس،2014	4
25	اردن،1952(ترمیم2011)	2
26	بنگلہ دیش،1972(ترامیم1986،2011)	1
27	جبوتی،1992(ترمیم2010)	0
28	البانیہ،1998(ترمیم2008)	0
29	آذربائیجان،1995(ترمیم2009)	0
30	بنین،1990	0
31	برکینافاسو،1991(ترمیم2012)	0
32	کیمرون،1972(ترمیم2008)	0
33	چاڈ،1996(ترمیم2005)	0

تعداد	ممالک	اسلامی دفعات کی شرح
34	کوٹ ڈی آئیوری، 2000	0
35	گابون، 1991 (ترمیم 1997)	0
36	گیمبیا، 1996 (ترمیم 2004)	0
37	گنی، 2010	0
38	گنی-بیساؤ 1984 (ترمیم 1991)	0
39	گیانا، 1980 (ترمیم 1995)	0
40	انڈونیشیا، 1945 (دوبارہ 1959، ترمیم 2002)	0
41	قازقستان، 1995 (ترمیم 1998)	0
42	کرغز جمہوریہ، 2010)	0
43	لبنان، 1926 (ترمیم 2004)	0
44	مالی، 1992	0
45	موزمبیق، 2004 (ترمیم 2007)	0
46	نائیجر، 2010	0
47	نائیجیریا، 1999	0
48	سینیگال، 2001 (ترمیم 2009)	0
49	سیرالیون، 1991 (ترامیم 1996، 2008)	0
50	سورینام، 1987 (ترمیم 1992)	0
51	تاجکستان، 1994 (ترمیم 2003)	0
52	توگو، 1992 (ترمیم 2007)	0
53	ترکی، 1982 (ترمیم 2002)	0
54	ترکمانستان، 2008	0

مسلم ممالک کے دساتیر میں بنیادی انسانی حقوق

مصر کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 4: ریاست کا فرض ہے کہ وہ انسانی حقوق کا احترام کرے اور ان کی حفاظت کرے۔
- آرٹیکل 6: ہر شخص کو آزادئ اظہار رائے کا حق حاصل ہے، اور ریاست اس حق کو تحفظ فراہم کرے گی۔
- آرٹیکل 8: ہر شخص کو آزادی اور جان کی سلامتی کا حق حاصل ہے، اور کسی کو بھی غیر قانونی طریقے سے گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔
- آرٹیکل 9: ہر شخص کو رائے دینے اور مذہب کی آزادی حاصل ہے۔
- آرٹیکل 11: خواتین اور بچوں کے حقوق کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے۔
- آرٹیکل 15: ہر شخص کو اپنے ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہے۔
- آرٹیکل 40: ہر شخص قانون کے سامنے برابر ہے، اور کسی بھی قسم کی تفریق غیر قانونی ہے۔
- آرٹیکل :51 ہر شخص کو اپنے حقوق اور آزادیوں کے تحفظ کے لیے عدالتوں سے رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔

تیونس کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 21: تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں اور ان میں کسی بھی قسم کا امتیاز نہیں ہو گا۔ ریاست ہر شہری کی زندگی، آزادی اور عزت کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔
- آرٹیکل 23: ہر فرد کو زندگی اور ذاتی سلامتی کا حق حاصل ہے۔ کسی کو جسمانی یا ذہنی اذیت نہیں دی جائے گی، اور یہ انسانی وقار کے خلاف جرم تصور کیا جائے گا۔
- آرٹیکل 24: ہر شہری کو نجی زندگی اور ذاتی معلومات کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ ریاست

شہریوں کے نجی ڈیٹا اور ذاتی حقوق کی حفاظت کی ضامن ہے۔

- آرٹیکل 25: تیونس کا ہر شہری کسی بھی ملک میں رہائش اختیار کر سکتا ہے اور ملک میں واپسی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔
- آرٹیکل 31: اظہار رائے کی آزادی کو آئین کے تحت مکمل تحفظ حاصل ہے۔ اس میں تحریر، تقریر اور دیگر میڈیا ذرائع کی آزادی شامل ہے۔
- آرٹیکل 32: ریاست معلومات تک رسائی کے حق کو یقینی بنائے گی اور اسے ہر فرد کے لیے دستیاب بنائے گی، تاکہ شہری آزادی کو فروغ دیا جا سکے۔
- آرٹیکل 34: ریاست خواتین اور مردوں کو سیاسی عمل میں شرکت کا مساوی حق دے گی۔
- آرٹیکل 38: ہر فرد کو صحت کا حق حاصل ہے، اور ریاست صحت کے شعبے میں معیار اور خدمات کی بہتری کے لیے کام کرے گی۔
- آرٹیکل 46: ریاست خواتین کے حقوق کی ضمانت دیتی ہے اور تمام شعبوں میں ان کی شرکت کو ممکن بنائے گی۔ خواتین پر تشدد کے خلاف اقدامات کیے جائیں گے۔
- آرٹیکل 49: حقوق اور آزادیوں کو محدود نہیں کیا جا سکتا، سوائے ان صورتوں کے جہاں قانون میں واضح طور پر انسانی حقوق اور سماجی تحفظ کو برقرار رکھنے کے لیے پابندیوں کی اجازت ہو۔

لبنان کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 7: تمام لبنانی شہری قانون کے سامنے برابر ہیں۔ کسی بھی شہری کو اس کی جنس، نسل، زبان، یا مذہب کی بنیاد پر امتیاز کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔
- آرٹیکل 8: شخصی آزادی کی ضمانت دی جاتی ہے اور اسے بغیر کسی مجرمانہ سرگرمیوں کے، محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی شخص کو قانونی حکم کے بغیر گرفتار یا نظربند نہیں کیا جائے گا، اور صرف شفاف قانونی ضروریات کے تحت ہی گرفتاری کی جا سکتی ہے۔
- آرٹیکل 9: آزادی مذہب کو مکمل تحفظ حاصل ہے، اور ہر شہری کو اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے کا حق ہے۔ ریاست مذہبی آزادی کے حوالے سے احترام کو یقینی بنائے گی۔

- آرٹیکل 12: تمام شہریوں کو سرکاری عہدوں پر تقرری کا مساوی حق حاصل ہے، بشرطیکہ وہ قانونی قابلیت اور اہلیت رکھتے ہوں۔
- آرٹیکل 13: اظہار رائے، تحریر، پریس، اور اجتماعات کی آزادی کو آئین کے تحت تحفظ حاصل ہے، بشرطیکہ ان حقوق کا استعمال امن عامہ اور اخلاقیات کے دائرے میں ہو۔
- آرٹیکل 15: ملکیت کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور کسی شہری کی ملکیت کو عوامی مفاد کے بغیر اور مناسب معاوضے کے بغیر ضبط نہیں کیا جائے گا۔

ملائیشیا کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 5: زندگی اور شخصی آزادی کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ کسی کو قانونی ضروریات کے بغیر اس کے حقوق سے محروم نہیں کیا جائے گا، اور گرفتار شخص کو 24 گھنٹے کے اندر عدالت میں پیش کیا جانا ضروری ہے۔
- آرٹیکل 6: کسی بھی شخص کو جبری مشقت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اور غلامی یا جبری مشقت کی کسی بھی شکل کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔
- آرٹیکل 8: تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں، اور جنس، نسل، مذہب، یا پیدائش کی بنیاد پر کسی بھی شہری کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔
- آرٹیکل 8: ملائیشیا کے ہر شہری کو ملک کے اندر آزادانہ نقل و حرکت کا حق حاصل ہے، اور ریاست میں رہائش اختیار کرنے کا بھی حق محفوظ ہے۔
- آرٹیکل 10: آزادی اظہار، اجتماع، اور انجمن سازی کا حق ہر شہری کو حاصل ہے، لیکن کچھ حالات میں ان پر مناسب پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں تاکہ امن عامہ، اخلاقیات، اور ملکی سلامتی برقرار رہیں۔
- آرٹیکل 11: آزادی مذہب کا حق ہر فرد کو حاصل ہے۔ کسی بھی شخص کو اس کے مذہبی عقائد پر عمل کرنے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی، البتہ اسلام ریاستی مذہب ہے۔
- آرٹیکل 12: تعلیم کے معاملے میں کسی بھی شہری کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں برتا جائے گا،

اور تمام شہریوں کو مساوی تعلیمی حقوق فراہم کیے جائیں گے۔

- آرٹیکل 13: ملکیت کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ کسی بھی شہری کی ملکیت کو عوامی مفاد کے بغیر اور مناسب معاوضے کے بغیر ضبط نہیں کیا جا سکتا۔

انڈونیشیا کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 27: تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں اور انہیں برابر حقوق اور ذمہ داریاں حاصل ہیں، چاہے ان کی سماجی حیثیت کچھ بھی ہو۔
- آرٹیکل 28 A: ہر شخص کو زندگی گزارنے، جسمانی اور روحانی بہتری کو یقینی بنانے کا حق حاصل ہے۔
- آرٹیکل 28 B: ہر شخص کو خاندان بنانے اور بچوں کو جنم دینے کا حق حاصل ہے۔ بچوں کو ان کے حقوق کے تحفظ کا بھی حق حاصل ہے۔
- آرٹیکل 28 C: ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے اور سائنسی و فنی ترقی سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر سکے۔
- آرٹیکل 28 D: ہر شہری کو کام، مساوی سلوک، اور انصاف کا حق حاصل ہے اور انہیں قانونی تحفظ بھی دیا جائے گا۔
- آرٹیکل 28 E: ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے، اپنی رائے رکھنے، اور کسی بھی سیاسی یا سماجی گروہ میں شامل ہونے کی آزادی حاصل ہے۔
- آرٹیکل 28 F: ہر شخص کو معلومات تک رسائی اور اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے۔
- آرٹیکل 28 G: ہر شخص کو ذاتی تحفظ، خاندان، اور ملک کے اندر اور باہر تحفظ کا حق حاصل ہے، اور وہ خوف کے بغیر زندگی گزارے گا۔
- آرٹیکل 28 H: ہر شخص کو صحت اور بنیادی ضروریات زندگی کا، اور باوقار زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔
- آرٹیکل 28 I: انسانی حقوق کا تحفظ ریاست کا فرض ہے اور ان حقوق کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ نسلی،

مذہبی، اور ثقافتی حقوق کا احترام بھی لازم ہے۔

- آرٹیکل 29: ریاست مذہبی آزادی کو یقینی بناتی ہے اور ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔

سعودی عرب کے قانون میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

سعودی عرب میں کوئی تحریری آئین نہیں ہے۔ سعودی عرب کا بنیادی قانونی ڈھانچہ قرآن اور سنت پر مبنی ہے، اور اس کا نظام بنیادی قانونِ حکومت (Basic Law of Governance) کے تحت چلتا ہے، جو 1992 میں جاری کیا گیا۔

- آرٹیکل 8 : حکومت انصاف، مشاورت، اور مساوات کے اصولوں پر مبنی ہو گی، جیسا کہ اسلامی شریعت میں بیان کیا گیا ہے۔
- آرٹیکل 26 : ریاست انسانی حقوق کا تحفظ کرے گی اور اسلامی شریعت کے اصولوں کے مطابق ان حقوق کو یقینی بنائے گی۔
- آرٹیکل 27 : ریاست شہریوں اور ان کے خاندانوں کو قانون کے مطابق سماجی تحفظ اور صحت کی سہولیات فراہم کرے گی۔
- آرٹیکل 36 : ریاست ہر ملکی شہری اور غیر ملکی مقیم کے لیے امن وامان اور شخصی سلامتی کو یقینی بنائے گی۔ کسی بھی شخص کو قانونی جواز کے بغیر قید، سزا، یا نظر بندی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔
- آرٹیکل 37 : ریاست ہر شہری کے گھر کی حرمت اور رازداری کا احترام کرتی ہے، اور کسی گھر کی تلاشی بغیر قانونی اجازت کے نہیں ہو گی۔
- آرٹیکل 38 : کسی بھی شخص کو اس وقت تک سزا نہیں دی جاسکتی جب تک کہ اس پر جرم ثابت نہ ہو، اور سزا بھی قانونی بنیاد پر ہی دی جائے گی۔
- آرٹیکل 39: میڈیا اور ذرائع ابلاغ کو معاشرے کی ترقی، اسلامی اقدار کے فروغ، اور قومی یکجہتی کے اصولوں کے تحت اپنی سرگرمیاں جاری رکھنی چاہییں۔

- آرٹیکل 43: ریاست کے شہریوں کو سرکاری حکام سے اپیل اور شنوائی کا حق حاصل ہے۔

متحدہ عرب امارات کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 14: ریاست کی بنیاد انصاف، آزادی، اور مساوات پر قائم ہو گی، اور ان اصولوں کو سیکیورٹی، امن، اور معاشرتی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے نافذ کیا جائے گا۔
- آرٹیکل 25: تمام افراد قانون کے سامنے برابر ہیں اور کسی بھی قسم کے نسلی، مذہبی، یا معاشرتی امتیاز کے بغیر مساوی حقوق رکھتے ہیں۔
- آرٹیکل 26: ذاتی آزادی کی ضمانت دی جاتی ہے، اور کسی بھی شخص کو قانونی طریقے کے بغیر اس کی آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔
- آرٹیکل 27: ملک کے ہر شہری کو قانون کے مطابق شخصی تحفظ حاصل ہو گا۔ کوئی بھی شخص قانون کے بغیر گرفتار یا نظر بند نہیں کیا جا سکتا۔
- آرٹیکل 28: ملزم کو معصوم تصور کیا جائے گا جب تک کہ جرم ثابت نہ ہو جائے، اور اسے سزا دینے کے عمل میں انسانی وقار کا خیال رکھا جائے گا۔
- آرٹیکل 30: اظہار رائے کی آزادی کی ضمانت دی جاتی ہے، بشرطیکہ یہ قانون کے دائرے میں ہو۔ ریاست میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے اس پر مناسب حدود لاگو کی جا سکتی ہیں۔
- آرٹیکل 31: خط و کتابت، مواصلات، اور ذاتی معلومات کی رازداری کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔
- آرٹیکل 32: ریاست میں موجود ہر فرد کو مذہبی آزادی کا حق حاصل ہے، اور مذہب کی آزادی اسلامی قوانین کے دائرے میں رہے گی۔
- آرٹیکل 33: تمام شہریوں کو پرامن اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی دی گئی ہے، بشرطیکہ یہ قانون اور ریاست کے عمومی امن کے مطابق ہو۔
- آرٹیکل 34: تمام شہریوں کو کام کرنے کا حق ہے، اور ان پر جبری مشقت عائد نہیں کی جا سکتی۔

بنگلہ دیش کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 27: تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں اور انہیں مساوی تحفظ حاصل ہے۔
- آرٹیکل 28: ریاست کسی بھی شہری کے ساتھ اس کی جنس، نسل، ذات، مذہب، یا مقام پیدائش کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کرے گی۔ خواتین اور بچوں کو خصوصی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔
- آرٹیکل 31: ہر شخص کو زندگی، آزادی، جسمانی تحفظ اور قانون کے ذریعے انصاف کا حق حاصل ہے، اور انہیں کسی بھی غیر قانونی یا امتیازی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔
- آرٹیکل 32: زندگی اور ذاتی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق ہے اور اسے صرف قانون کے مطابق محدود کیا جا سکتا ہے۔
- آرٹیکل 33: ہر شہری کو گرفتاری اور نظر بندی سے متعلق قانونی سہولیات حاصل ہیں۔ کسی بھی گرفتار شدہ شخص کو وجوہات سے آگاہ کیا جائے گا اور جلد از جلد عدالت میں پیش کیا جائے گا۔
- آرٹیکل 36: ملک کے اندر آزادانہ نقل و حرکت کا حق ہر شہری کو حاصل ہے اور اسے کسی بھی علاقے میں رہائش اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔
- آرٹیکل 37: ہر شہری کو پرامن طور پر اجتماع کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ یہ ریاست کے امن و امان کے خلاف نہ ہو۔
- آرٹیکل 38: ہر شہری کو انجمن سازی اور تنظیم سازی کی آزادی حاصل ہے، لیکن اس آزادی کو قومی مفاد میں محدود کیا جا سکتا ہے۔
- آرٹیکل 39: اظہار رائے، پریس، اور معلومات تک رسائی کی آزادی ہر شہری کو حاصل ہے، لیکن ان حقوق پر مناسب پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں تاکہ ریاست کی سالمیت، اخلاقیات، اور امن عامہ محفوظ رہیں۔
- آرٹیکل 41: ہر شخص کو مذہب کی پیروی اور اس پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے، اور ریاست کسی شخص کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کرے گی۔
- آرٹیکل 44: آئین میں فراہم کردہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی صورت میں شہریوں کو

عدالت سے رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔

ایران کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 19: تمام ایرانی شہری، چاہے ان کی نسل، قبیلہ، یا زبان کچھ بھی ہو، قانون کے سامنے برابر ہیں اور ان کے حقوق میں کسی قسم کا امتیاز نہیں ہوگا۔
- آرٹیکل 20: ملک کے تمام شہریوں کو انسانی، سیاسی، معاشی، سماجی، اور ثقافتی حقوق حاصل ہیں، بشرطیکہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں۔
- آرٹیکل 21: ریاست خواتین کے حقوق کی ضمانت دیتی ہے اور ان کے وقار اور حقوق کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کرے گی۔
- آرٹیکل 22: ہر شخص کی جان، جائیداد، عزت، اور رہائش کو تحفظ حاصل ہے اور ان کی خلاف ورزی اس وقت تک نہیں کی جائے گی جب تک کہ قانونی ضرورت نہ ہو۔
- آرٹیکل 23: کسی بھی شخص کو اپنے عقیدے کی بنیاد پر ہراساں نہیں کیا جائے گا، نہ سزا دی جائے گی۔
- آرٹیکل 24: پریس اور اشاعت کی آزادی کو تحفظ حاصل ہے، بشرطیکہ یہ اسلامی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔
- آرٹیکل 26: انجمن سازی اور تنظیم سازی کی آزادی کو تحفظ حاصل ہے، بشرطیکہ یہ آزادی اسلامی اصولوں، ملک کی آزادی، یا قومی یکجہتی کے خلاف نہ ہو۔
- آرٹیکل 27: پرامن جلسے اور اجتماعات کی اجازت ہے، بشرطیکہ یہ اصولِ اسلام اور امن عامہ کے خلاف نہ ہوں۔
- آرٹیکل 28: ہر شہری کو ملازمت کرنے اور کام کرنے کا حق ہے، اور ریاست ایسی پالیسیاں اپنائے گی جس سے روزگار کے مواقع پیدا ہوں۔
- آرٹیکل 29: ہر فرد کو سماجی تحفظ اور امداد کا حق حاصل ہے۔ ریاست صحت اور مالی امداد کے نظام کو فروغ دیتے ہوئے عوام کے لیے سماجی سہولیات فراہم کرے گی۔

- آرٹیکل 32: کسی بھی شخص کو بغیر قانونی اجازت کے گرفتار یا نظر بند نہیں کیا جا سکتا، اور گرفتار شدہ شخص کو فوری طور پر اس کے الزامات سے آگاہ کیا جانا ضروری ہے۔
- آرٹیکل 38: کسی بھی شخص کو تشدد یا اذیت کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور اس طرح کے امور کو غیر قانونی سمجھا جائے گا۔
- آرٹیکل 43: ریاست افراد کی بنیادی ضروریات پوری کرنے، غربت کو ختم کرنے، اور سماجی انصاف کو فروغ دینے کے لیے اقتصادی اقدامات کرے گی۔

ترکی کے آئین میں انسانی حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 10: تمام افراد قانون کے سامنے برابر ہیں اور انہیں مساوی قانونی تحفظ حاصل ہے، قطع نظر جنس، نسل، مذہب، زبان، یا کسی دیگر حیثیت کے۔
- آرٹیکل 12: ہر فرد کو انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا حق حاصل ہے، اور ریاست ان حقوق کی حفاظت کرے گی، بشرطیکہ یہ حقوق جمہوری نظام اور عوامی مفادات سے ہم آہنگ ہوں۔
- آرٹیکل 13: بنیادی حقوق اور آزادیوں پر پابندیاں صرف آئین میں دیے گئے قوانین کے تحت اور جمہوری اصولوں کے مطابق ہی لگائی جا سکتی ہیں۔
- آرٹیکل 17: ہر شخص کو زندگی، جسمانی اور روحانی سلامتی کا حق حاصل ہے۔ کسی بھی شخص کو اذیت، بدسلوکی یا غیر انسانی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔
- آرٹیکل 19: کسی بھی شخص کو قانونی جواز کے بغیر گرفتار یا نظر بند نہیں کیا جا سکتا۔ گرفتار شخص کو فوری طور پر اس کے الزامات سے آگاہ کیا جائے گا اور اس کے قانونی حقوق محفوظ ہوں گے۔
- آرٹیکل 20: ہر شخص کو ذاتی زندگی اور رازداری کا حق حاصل ہے، اور کسی کی نجی زندگی میں غیر قانونی مداخلت نہیں کی جائے گی۔
- آرٹیکل 21: کسی کے گھر میں غیر قانونی داخلے یا تلاشی نہیں لی جا سکتی، اور ہر گھر کی حرمت کو تحفظ حاصل ہے۔
- آرٹیکل 22: ہر شخص کو خط و کتابت اور مواصلات کی رازداری کا حق حاصل ہے۔ ان کی نگرانی

قانونی اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔

- آرٹیکل 23: ہر شہری کو آزادانہ نقل و حرکت اور رہائش کا حق حاصل ہے، تاہم قومی سلامتی اور عوامی مفادات کے پیش نظر اس پر مناسب پابندیاں لگائی جاسکتی ہیں۔
- آرٹیکل 24: مذہب اور عقیدے کی آزادی کو یقینی بنایا گیا ہے۔ کسی کو اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد پر کسی قسم کے امتیازی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اور ریاست مذہبی آزادی کا تحفظ کرے گی۔
- آرٹیکل 25: ہر فرد کو اپنی سوچ اور عقائد کے اظہار کا حق حاصل ہے اور کسی کو اپنے خیالات ظاہر کرنے یا نہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔
- آرٹیکل 26: ہر شہری کو آزادئ اظہار کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ یہ آزادی قومی سلامتی، عوامی نظم و ضبط، اور اخلاقیات کے خلاف نہ ہو۔
- آرٹیکل 28: پریس کی آزادی محفوظ ہے، اور ریاست کسی بھی میڈیا پر پابندی نہیں لگائے گی سوائے ان صورتوں کے جو قومی مفاد میں ہوں۔
- آرٹیکل 34: ہر شہری کو پرامن اجتماع اور احتجاج کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ یہ ملک کے امن و امان اور جمہوری اصولوں کے خلاف نہ ہو۔

مسلم ممالک کے دساتیر میں مذہبی آزادی اور اقلیتی حقوق کی دفعات

ترکی کے آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 10: تمام افراد قانون کے سامنے برابر ہیں، اور ریاست کسی بھی فرد کے ساتھ جنس، نسل، زبان، یا مذہب کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کرے گی۔
- آرٹیکل 24: ہر شہری کو مذہبی عقیدے کی آزادی حاصل ہے اور کسی کو بھی اپنے عقائد کی پیروی یا اظہار سے روکا نہیں جائے گا۔ تاہم، مذہبی حقوق کو ریاستی اور جمہوری اصولوں کے مطابق محدود کیا جا سکتا ہے، اور کسی کو مذہبی عبادات یا مذہبی اصولوں کی پیروی پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔
- آرٹیکل 42: تعلیم کے میدان میں مذہب اور عقیدے کی آزادی کو یقینی بنایا جائے گا۔ کسی تعلیمی ادارے میں ایسے مذہبی اصولوں کو نافذ نہیں کیا جا سکتا جو طلبہ پر جبر کا سبب بنیں یا فرقہ واریت کو فروغ دیں۔
- آرٹیکل 66: ترکی کے آئین کے مطابق، ترک قومیت میں وہ تمام افراد شامل ہیں جو ترک شہریت رکھتے ہیں، اور ترک شہریت حاصل کرنے والا ہر فرد برابر حقوق اور فرائض رکھتا ہے، قطع نظر اس کی مذہبی وابستگی کے۔
- آرٹیکل 90: ایسے بین الاقوامی معاہدے جو انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے تحفظ کے متعلق ہیں، اور ترکی نے ان پر دستخط کیے ہیں، وہ ملکی قانون پر بالاتر ہوں گے اور ان پر عمل درآمد لازمی ہو گا۔

لوئیزن معاہدہ (1923) کے مطابق ترک اقلیتیں

لوئیزن معاہدہ کے تحت ترکی نے کچھ مخصوص اقلیتوں، جیسے کہ آرمینیائی، یونانی اور یہودی کمیونٹیز، کے حقوق کو تسلیم کیا ہے۔ یہ معاہدہ ان اقلیتوں کو اپنے مذہبی اور ثقافتی تشخص کو برقرار رکھنے کے حقوق فراہم کرتا ہے۔ تاہم، ترکی کے آئین میں دیگر مذہبی اقلیتوں کو سرکاری سطح پر اقلیت نہیں مانا گیا ہے۔

مصر کے آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 4: مصر کے قانون اور سماجی اصول اسلامی شریعت پر مبنی ہیں، اور اسلامی شریعت اصولوں کی سب سے بڑی ماخذ ہو گی۔"
- آرٹیکل 53: تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں اور انہیں مساوی حقوق حاصل ہیں، بغیر کسی امتیاز کے۔ ریاست مذہبی، نسلی، یا فرقہ واریت پر مبنی امتیاز کے خلاف ہے اور اس طرح کے امتیاز کو جرم قرار دیتی ہے۔
- آرٹیکل 64: عقیدے کی آزادی کو یقینی بنایا گیا ہے اور ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق عبادات کرنے کا حق حاصل ہے۔ صرف اسلامی، عیسائی اور یہودی مذاہب کی عبادات اور مذہبی رسومات کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔
- آرٹیکل 65: ہر شخص کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہے، تاہم اس آزادی کو مذہبی، ثقافتی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق استعمال کیا جانا چاہیے۔
- آرٹیکل 7: الازہر ایک آزاد اسلامی ادارہ ہے جو اسلامی اصولوں کی تشریح اور فروغ کے لیے ذمہ دار ہے، اور یہ اسلام کے اعتدال پسند پیغام کو فروغ دینے میں ریاست کی مدد کرتا ہے۔
- آرٹیکل 3: عیسائی اور یہودی برادریوں کے ذاتی احوال سے متعلق معاملات، جیسے شادی، طلاق، اور وراثت، میں ان کے اپنے مذاہب کے اصولوں کو لاگو کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔
- آرٹیکل 235: ریاست نئے گرجا گھروں کی تعمیر میں سہولت فراہم کرنے کی پابند ہے اور عیسائی برادریوں کے عبادت گاہوں کی تعمیر و مرمت کی اجازت فراہم کرتی ہے۔

ایران کے آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 12: اسلام کا شیعہ اثنا عشری مکتب فکر سرکاری مذہب ہوگا، لیکن دیگر اسلامی مکاتب فکر، جیسے کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، اور زیدی، مکمل احترام کے حقدار ہیں اور ان کے پیروکار اپنے مذہبی معاملات میں آزاد ہیں۔
- آرٹیکل 13: زرتشتی، یہودی، اور مسیحی ایرانی شہری سرکاری طور پر تسلیم شدہ مذہبی اقلیتیں ہیں اور انہیں اپنے مذہبی عقائد پر عمل پیرا ہونے کی آزادی حاصل ہے۔
- آرٹیکل 14: ریاست اسلامی اصولوں کے مطابق غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کرے گی، بشرطیکہ وہ ایران کی خود مختاری اور امن کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں۔
- آرٹیکل 15: فارسی زبان سرکاری زبان ہے، لیکن دیگر علاقائی اور نسلی زبانوں کو بھی ذرائع ابلاغ اور تعلیمی اداروں میں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔
- آرٹیکل 19: تمام ایرانی قومیں اور گروہ نسل، زبان، اور رنگ کی بنیاد پر مساوی حقوق رکھتے ہیں، اور ریاست ان کے حقوق کے تحفظ کی پابند ہے۔
- آرٹیکل 20: تمام افراد قانون کے سامنے برابر ہیں اور انہیں بغیر کسی مذہبی امتیاز کے مساوی قانونی حقوق حاصل ہیں۔
- آرٹیکل 23: کسی شخص کو اپنے عقیدے کے اظہار پر روکا نہیں جائے گا، اور کسی کو اپنے مذہب کی بنیاد پر جوابدہ نہیں ٹھہرایا جائے گا۔
- آرٹیکل 64: مجلس شوریٰ اسلامی (پارلیمنٹ) میں تسلیم شدہ مذہبی اقلیتوں کو مخصوص نمائندگی حاصل ہے، جیسے کہ زرتشتی، یہودی، اور عیسائی برادریوں کے لئے مخصوص نشستیں۔

ملائیشیا کے آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 3: اسلام ریاست کا سرکاری مذہب ہے، لیکن دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو امن کے ساتھ اپنے مذاہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔
- آرٹیکل 8: تمام افراد قانون کے سامنے برابر ہیں، اور کسی کے ساتھ جنس، نسل، مذہب، یا جائے

پیدائش کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

- آرٹیکل 11: ہر شہری کو مذہب کی آزادی حاصل ہے، اور ہر مذہبی گروہ کو اپنے مذہبی عقائد کی پیروی، عمل، اور تبلیغ کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ یہ عمل عوامی امن وامان کو متاثر نہ کرے۔
- آرٹیکل 11 (4): ریاست مسلمانوں کے درمیان کسی بھی غیر مسلم کے مذہب کی تبلیغ کو روکنے کے لیے قوانین بنا سکتی ہے۔
- آرٹیکل 12: تعلیم کے معاملے میں مذہبی آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ کسی بھی تعلیمی ادارے میں کسی شخص کو کسی مخصوص مذہب کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔
- آرٹیکل 153: ملائی قوم اور مقامی قبائل کے خصوصی حقوق اور مفادات کا تحفظ کیا جائے گا، جبکہ دیگر نسلی گروہوں کے جائز مفادات کا بھی خیال رکھا جائے گا۔

انڈونیشیا کے آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 28 (1) E: ہر شخص کو مذہب کوئی بھی اختیار کرنے اور اپنی عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی حاصل ہے۔
- آرٹیکل 28 (2) E: ہر شخص کو اپنے خیالات اور مذہبی عقائد کی پیروی، اظہار اور انتخاب کرنے کا حق حاصل ہے۔
- آرٹیکل 29 (1): ریاست انڈونیشیا ایک توحید پرست ریاست، اور اس میں عوام کی مذہبی اور ثقافتی اقدار کی حفاظت کی جاتی ہے۔

سعودی عرب کے قانون میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 1: سعودی عرب ایک خود مختار اسلامی ریاست ہے جس کا مذہب اسلام اور آئین قرآن وسنت ہے۔
- آرٹیکل 7: سعودی عرب کی حکومت قرآن و سنت کے اصولوں پر مبنی ہوگی اور انہیں تمام قوانین اور قواعد کی بنیاد مانا جائے گا۔
- آرٹیکل 8: حکومت انصاف، مشاورت (شوریٰ)، اور مساوات کے اصولوں پر عمل کرے گی،

جیسا کہ اسلامی شریعت میں بیان کیا گیا ہے۔

- آرٹیکل 23: ریاست اسلامی اصولوں کے مطابق مسجد الحرام اور مسجد نبوی کی حفاظت کرے گی اور اسلام کی اشاعت کی ذمہ داری نبھائے گ
- آرٹیکل 26: ریاست، اسلامی شریعت کے مطابق انسانی حقوق کا تحفظ کرے گی۔
- آرٹیکل 39: اظہارِ رائے اور ابلاغ کے ذرائع اسلامی تعلیمات کے مطابق ہونے چاہئیں، اور کوئی ایسا مواد نشر نہیں کیا جا سکتا جو اسلامی اقدار، امنِ عامہ، یا ریاست کے مفاد کے خلاف ہو۔

بنگلہ دیش کے آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل A2: اسلام ریاست کا مذہب ہے، لیکن دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو ان کے مذہب کی پیروی اور عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔
- آرٹیکل 28(1): ریاست کسی شہری کے ساتھ مذہب، نسل، ذات، جنس یا جائے پیدائش کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کرے گی۔"
- آرٹیکل 28(3): ریاست مذہبی، نسلی یا لسانی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرے گی اور انہیں ان کے مذہبی اور ثقافتی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کی آزادی دے گی۔
- آرٹیکل 41(1): ہر شہری کو اپنے مذہب کی پیروی، تبلیغ، اور عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے، بشرطیکہ یہ عوامی امن و امان کو نقصان نہ پہنچائے۔
- آرٹیکل 41(2): کسی بھی فرد کو کسی مخصوص مذہب کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

متحدہ عرب امارات کے آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 7: اسلام ریاست کا سرکاری مذہب ہے، اور اسلامی شریعت کو تمام قوانین کا بنیادی ماخذ قرار دیا گیا ہے۔
- آرٹیکل 25: تمام افراد قانون کے سامنے برابر ہیں اور انہیں نسل، قومیت، مذہب، یا سماجی مقام

کے بغیر مساوی قانونی حقوق حاصل ہیں۔

- آرٹیکل 32: ہر شخص کو اپنے مذہب کی پیروی کی آزادی حاصل ہے، بشرطیکہ یہ عوامی نظم وضبط اور اخلاقیات کے خلاف نہ ہو۔
- آرٹیکل 40: غیر ملکی باشندوں کو ریاست کے قوانین کے مطابق اپنے حقوق اور آزادیوں کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے، اور ریاست ان کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کا احترام کرتی ہے۔

تیونس کے آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق دفعات:

- آرٹیکل 1: تیونس ایک آزاد ریاست ہے، جس کا مذہب اسلام ہے، زبان عربی ہے، اور نظام جمہوری ہے۔
- آرٹیکل 2: تیونس ایک سویلین ریاست ہے، جس کی بنیاد شہریت، عوام کی مرضی، اور قانون کی بالادستی پر قائم ہے۔
- آرٹیکل 6: ریاست مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ یہ عقائد کے آزادانہ اظہار اور عبادت کی آزادی کو یقینی بناتی ہے، اور نفرت، تشدد، اور تکفیر کی روک تھام کی ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے۔
- آرٹیکل 21: تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں اور ان کے حقوق و فرائض میں کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔
- آرٹیکل 39: ریاست تیونس کی اسلامی اور عربی شناخت کی حفاظت کی پابند ہے اور تنوع کو برقرار رکھتے ہوئے شہریوں کی ثقافتی شناخت کو محفوظ بنائے گی۔
- آرٹیکل 49: قانون شہریوں کے حقوق اور آزادیوں پر اس صورت میں حدود لگا سکتا ہے جب یہ دوسرے لوگوں کے حقوق اور امن عامہ کے تحفظ کے لیے ضروری ہوں، مگر ان کو آئین میں دیے گئے حقوق کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے۔

آئینی بحران، نوآبادیاتی اثرات اور چیلنجز

اسلامی آئینی نظام ایک اہم موضوع ہے جو جدید حکمرانی کے سیاق وسباق میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مقصد اسلامی اقدار اور قوانین کو جمہوری نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے، جو کہ کئی چیلنجز کا حامل ہدف ہے۔ اسلامی قانون، جو کہ بنیادی طور پر قرآن وسنت پر مبنی ہے، کی تاریخ میں مختلف ادوار میں مختلف تشریحات کی گئی ہیں، اور مختلف مسلم معاشروں نے اپنے مخصوص ثقافتی اور سیاسی سیاق و سباق کے مطابق اس کی تعبیر کی۔ یہ تشریحات اسلامی آئینی نظام کو لاحق کئی اہم مسائل کو نمایاں کرتی ہیں۔ جہاں کچھ مسلم ممالک نے اسلامی اقدار کو جمہوری اداروں کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے، وہیں کچھ دیگر ممالک میں ان اقدار کو محدود کرنے یا نظرانداز کرنے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

اسلامی اقدار اور جمہوری نظریات کے درمیان ہم آہنگی کی کوشش کے دوران کئی چیلنجز سامنے آتے ہیں تاہم، ان مسائل کے باوجود، یہ ممکن ہے کہ اسلامی آئینی نظام میں ایسے مواقع پیدا کیے جائیں جہاں جدید انسانی حقوق اور عوامی شراکت کی اقدار کو فروغ دیا جاسکے۔

آئینی بحران میں نوآبادیاتی اثرات

نوآبادیاتی اور غیر نوآبادیاتی مسلم ممالک کے آئین میں اسلامی عناصر کی بنیاد اور ان کے مختلف عوامل کو سمجھنا ایک اہم مگر پیچیدہ موضوع ہے۔ نوآبادیاتی اثرات نے اسلامی ممالک کے آئینی ڈھانچے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، اور یہ دیکھا گیا ہے کہ نوآبادیاتی تاریخ کے حامل ممالک میں اسلامی عنصر کا اضافہ زیادہ نمایاں ہے۔

نوآبادیاتی حکومتوں کے زیر سایہ رہنے والے مسلم ممالک میں اسلامی عنصر کو آئینی ڈھانچے میں شامل کرنے کی بڑی تحریکیں چلتی رہی ہیں۔ پاکستان میں یہی ہوا، اور ایسے ہی مصر اور انڈونیشیا وغیرہ جیسے ملک بھی ان تحریکوں سے گزرے ہیں۔ پاکستان میں کئی مذہبی جماعتوں نے مل کر یہ کوششیں کیں

جن میں تمام مسالک کی نمائندگی تھی۔ مصر میں اخوان المسلمون نے آئین کو اسلامی اقدار کے مطابق ڈھالنے کے لیے کوششیں کیں، مصر میں البتہ انہیں زیادہ تو سیاسی اور عوامی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ چونکہ نوآبادیاتی تسلط سے نکلنے والی ریاستوں میں مذہبی جماعتیں زیادہ طاقتور رہی ہیں اور اب بھی ہیں، بلکہ وہ اقتدار میں بھی شراکت کی متمنی ہوتی ہیں، اس لیے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ آئینی اصلاحات مکمل طور پہ عوامی خواہشات کی عکاسی کرتی ہیں یا ان میں کہیں نہ کہیں سیاسی کشمکش کا اثر بھی موجود ہے۔

نوآبادیاتی دور کے آغاز سے پہلے، اسلامی ممالک میں مذہبی اور آئینی اصول ایک ہی بنیاد پر قائم تھے۔ مسلم معاشروں میں قانون اور حکمرانی کے اصول قرآن اور شریعت کے مطابق تھے۔ نوآبادیاتی حکومتوں نے مسلم دنیا کے سیاسی اور قانونی ڈھانچے پر گہرے اثرات مرتب کیے، خاص طور پر جنوب مشرقی ایشیا، افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں۔ یورپی طاقتیں اپنی قانونی روایات کو مسلم معاشروں پر نافذ کرنے کی کوشش کرتی رہیں، جس سے اسلامی اصولوں اور مغربی قوانین میں کشمکش پیدا ہوئی۔

نوآبادیاتی دور کے بعد مسلم ممالک میں سب سے بڑا سوال یہ سامنے آیا کہ اسلامی شناخت کو آئینی شکل میں کیسے برقرار رکھا جائے؟ پاکستان، انڈونیشیا، اور مصر جیسے ممالک میں اسلامی عناصر کو آئینی ڈھانچے میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی گئی تاکہ مذہبی شناخت کو برقرار رکھا جاسکے۔ ان ممالک میں اسلامی عناصر کو آئین میں شامل کرنے کا عمل عوام کی مذہبی خواہشات اور نوآبادیاتی اثرات کے خلاف ایک ردعمل تھا۔

نوآبادیاتی مسلم ممالک میں اسلامی اصولوں کی آئین میں شمولیت تو ہو چکی ہے، مگر عملی طور پر ان اصولوں کے نفاذ میں مشکلات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر، پاکستان میں خواتین کے حقوق اور شہری و اقلیتی آزادیوں کے کے حوالے سے اسلامی اور جدید قوانین میں کچھ تضاد ہے۔ مصر میں اخوان المسلمون کی حکومت کے دوران بھی اسلامی آئین کے نفاذ میں سیاسی مخالفت اور سیکولر قوتوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

سعودی عرب اور ایران جیسے غیر نوآبادیاتی مسلم ممالک میں آئین کے اسلامی اصول کو مغربی اثرات

سے آزاد رکھنے کی کوشش کی گئی۔ سعودی عرب میں قرآن اور سنت کو آئین کے بنیادی اصول قرار دیا گیا ہے۔ اس ملک میں اسلامی قانون کو براہ راست آئینی بنیاد کے طور پر اپنانا ممکن ہوا کیونکہ یہاں نوآبادیاتی اثرات نہیں تھے۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد آئینی ڈھانچے کو شیعہ اسلامی عقائد کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا اور اسلامی نظریات کو ریاست کا حصہ بنایا گیا۔

مجموعی طور پہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی زیر تسط رہنے والے ملکوں میں آئینی بحران کا مسئلہ زیادہ شدید ہے۔ وہاں مختلف طبقات کی رسہ کشی اور عوام کا فکری ابہام اس چیز کو مزید گنجلک بنا دیتا ہے۔

اسلامی آئینی نظام کی تشکیلِ نو

اسلامی آئینی ڈھانچے کی تشکیل کا تاریخی پس منظر بہت اہم ہے، جو ہمیں اس کی بنیادی تشکیلات اور ارتقاء کی تفہیم میں معاونت کرتا ہے۔ اسلامی قانون کی بنیادیں قرآن اور سنت میں پیوست ہیں، جو کہ مسلم معاشروں میں قانون سازی اور سماجی زندگی کے قواعد و ضوابط کے لئے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی اسلامی دور میں، خاص طور پر خلفائے راشدین کے دور میں، اسلامی قوانین و اقدار کو سیاسی اور سماجی نظام کی بنیادوں کے طور پر دیکھا گیا۔ اُس دور میں، اسلامی اقدار و قوانین کے تحت مضبوط سیاسی نظم قائم کیا گیا جو اسلامی تعلیمات کے مطابق چلتا تھا۔ اس تاریخی پس منظر میں، اسلامی آئینی ڈھانچے کی ایک منفرد شکل کے طور پر خلافت کا نظام بھی سامنے آتا ہے۔ خلافت کی بنیاد اسلامی اصولوں پر قائم تھی، اور یہ ایک ایسا نظام تھا جس میں شرعی قوانین کو نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ عوامی مسائل کا حل بھی نکالا گیا۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ، مختلف سلاطین اور حکومتوں نے اسلامی اقدار کی الگ الگ تشریحات بھی کیں اور انہیں اپنے حساب و ضروریات کے مطابق ڈھالا، جس سے سیاسی فقہ کا ایک وسیع ذخیرہ سامنے آیا۔

عصر حاضر میں، کئی مسلم ممالک نے اسلامی آئینی نظام کی تشکیلِ نو کی کوشش کی ہے، جو کہ اسلامی اقدار اور جدید جمہوری نظریات کا ایک مرکب ہے۔ اگر سیاست و سماجیات کی وسیع تر مفاہیم کی حامل جدید اصطلاحات کو مد نظر رکھ کر مسلم دنیا کے سیاسی نظم کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آئین سازی کے دوران مذہب اور جدید انسانی حقوق کے درمیان توازن قائم رکھنا سب سے پیچیدہ چیلنج ہے۔

مختلف مسلم ممالک میں آئینی اصلاحات کا مقصد بھی یہ ہے کہ وہ مذہبی اصولوں اور انسانی حقوق کے معیارات کے درمیان ایک ایسی فضا پیدا کریں جہاں دونوں کا احترام موجود ہو۔ مثلاً، ترکی میں ایک عرصے تک سیکولر آئین کا نفاذ کیا گیا تھا، جس میں مذہب اور ریاست کو علیحدہ رکھا گیا تھا، لیکن 2000 کی دہائی میں اس میں تبدیلیاں کی گئیں اور مذہبی آزادی کو بڑھایا گیا، خاص طور پر اسلامی جماعتوں کے اثر و رسوخ کو قبول کیا گیا۔ اسی طرح، مصر میں 2011 میں ہونے والی آئینی تبدیلیوں میں مذہب اور انسانی حقوق کے مسائل پر بات کی گئی، جس میں عورتوں کے حقوق اور اقلیتی گروہوں کے حقوق کو بھی پہلے سے زیادہ اہمیت دی گئی۔

اسلامی آئینی ڈھانچے کی تشکیل کے دوران یہ ضروری ہے کہ مذہبی متون کے مفاہیم و مقاصد کے ساتھ علاقائی تاریخ، اور مختلف ثقافتی سیاق و سباق کو مدنظر رکھا جائے۔ یہ دونوں قدیم و جدید عناصر، نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ چل سکتے ہیں بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم اسلامی آئینی نظام کی تشکیل میں مددگار بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں، اسلامی آئینی نظام کی تشکیل کے تاریخی تجربات سے سیکھنا ضروری ہے تاکہ مستقبل میں اس حوالے سے بہتری لائی جا سکے۔

اسلامی آئینی نظام کی تشکیل میں درپیش چیلنجز

عصر حاضر میں مسلم دنیا کو ایک کامیاب اسلامی آئینی نظام کی تشکیل میں کئی اہم چیلنجز درپیش ہیں۔ ان میں سیاسی عدم استحکام، ثقافتی اختلافات، مذہبی انتہاپسندی، عالمی سیاسی حالات، معاشی مسائل اور شعوری فقدان نمایاں ہیں۔ یہ تمام عناصر مل کر اسلامی آئینی نظام کی تشکیل کی راہ میں مختلف رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔

۱۔ سیاسی عدم استحکام ایک بنیادی چیلنج ہے جو اکثر اسلامی ممالک میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بہت سے مسلم ممالک میں حکومتوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش، جمہوری عمل میں عدم دلچسپی، اور عوامی عدم اطمینان کے باعث سیاسی بحران پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بحران نہ صرف حکومت کی ساکھ کو متاثر کرتے ہیں بلکہ عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ جب عوامی اعتماد ٹوٹتا ہے تو اس سے اسلامی آئینی نظام کی تشکیل کی کوششیں متاثر ہوتی ہیں، کیونکہ لوگوں کا

حکومت پر اعتماد کم ہو جاتا ہے اور وہ تبدیلیوں کے عمل کا حصہ بننے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔

۲۔ ثقافتی اختلافات بھی ایک اہم چیلنج ہے۔ اسلامی دنیا میں مختلف ثقافتوں، زبانوں، اور روایات کی موجودگی ایک زمینی حقیقت ہے، جو کہ بعض اوقات اسلامی اقدار کی تشریح اور ان کی عملی تنفیذ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، کچھ علاقوں میں اسلامی اقدار و تعلیمات کی تشریح میں اعتدال پسندی کا رویہ موجود ہے، جبکہ کچھ دیگر مقامات پر سخت گیر تشریح کے حامل افراد کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ یہ فرق مختلف مذہبی جماعتوں کے درمیان تنازعات کو جنم دیتا ہے، جس سے آئین میں مذہبی عنصر اور جدید سماجی اخلاقیات کے درمیان توازن قائم رکھنا اور اس پر اتفاق رائے مشکل ہو جاتا ہے۔

۳۔ مذہبی انتہا پسندی کا مسئلہ بھی اسلامی آئینی نظام کی تشکیل میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بعض گروہ اور جماعتیں اپنے مقاصد و اہداف کے تحت مذہبی تعلیمات کی غلط تشریح کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انتہا پسند نظریات کو فروغ ملتا ہے۔ اس سے، ظاہر ہے کہ اسلامی معاشروں میں عدم برداشت اور عدم اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ انتہا پسند عناصر نہ صرف قومی سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی مسلم ممالک کی ساکھ کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ عناصر اپنا اپنا الگ آئینی خاکہ پیش کرتے ہیں۔

مختلف فرقہ وارانہ نظریات، جیسے کہ سنی، شیعہ، اور دیگر اسلامی مسالک کے غیر ضروری باہمی اختلافات بھی اسلامی نظام کی تشریح میں پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں۔ یہ نظریاتی تقسیم اکثر سیاسی جدوجہد میں بھی بدل جاتی ہے، جس کی وجہ سے اسلامی آئینی نظام کے قیام کے لیے ایک مشترکہ بنیاد تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس تقسیم کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف فرقوں کے درمیان مکالمہ اور باہمی تعاون کی فضا پیدا ہو۔

۴۔ عالمی سیاسی حالات بھی آئینی بحران میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عالمی طاقتوں کے درمیان کشمکش، نوآبادیاتی ورثے، اور مسلم ممالک کی خود مختاری کے مسائل اس کے اندر آجاتے ہیں۔ بہت سے مسلم ممالک عالمی سیاست میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں،

لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں بین الاقوامی دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ دباؤ کبھی کبھی اسلامی اصولوں کے مطابق فیصلے کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے، کیونکہ بعض اوقات عالمی برادری کی توقعات اور مقامی روایات میں تضاد ہوتا ہے۔

۵۔ معاشی مسائل بھی مسلم دنیا کے اس مسئلے کا اہم حصہ ہیں۔ مسلم ممالک کی بہت سی معیشتیں مالی طور پر کمزور ہیں، جس کی وجہ سے حکومتیں ترقیاتی منصوبوں میں کامیاب نہیں ہو پاتی ہیں۔ جب اقتصادی حالات اچھے نہیں ہوتے تو عوامی زندگی میں بے چینی پیدا ہوتی ہے، جمہوریت سے بیزاری جنم لیتی ہے اور اس سے سیاسی عدم استحکام بھی پیدا ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں عوام کی توجہ معاشی مسائل کی جانب زیادہ ہوتی ہے، اور وہ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر آئینی تبدیلیوں کے عمل میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے، اور نہ ہی ایک کمزور معیشت کی حامل ریاست آئینی اصلاحات کے ضمن میں کچھ خاص اقدامات کر سکتی ہے۔

۶۔ عوامی شعور اور تعلیم کا فقدان بھی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ بہت سے مسلم ممالک میں تعلیم کا نظام کمزور ہے، جس کی وجہ سے عوام کو اسلامی اصولوں، شہری حقوق اور جدید سیاسی نظام کے بارے میں مکمل آگاہی نہیں ہوتی۔ جب عوام کو آئینی مسائل و اصلاحات اور ان کے اثرات کی اہمیت کا احساس نہیں ہوگا تو وہ اس کے لیے کسی قسم کی حمایت یا دلچسپی کا اظہار نہیں کریں گے۔ جبکہ ریاستی مقتدرہ خود ایسے اقدامات کی کبھی قائل نہیں ہوتی جب تک کہ عوامی مطالبات و شعور کا عمل دخل شامل نہ ہو۔

تعلیمی اصلاحات مسلم دنیا کے آئینی بحران کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ تعلیمی نظام میں معتدل اسلامی اصولوں اور جمہوری اقدار کی تعلیم دینے سے عوام میں آگاہی اور شعور بڑھے گا۔ اس سے نوجوان نسل میں مثبت تبدیلیاں آئیں گی اور وہ آئینی اصلاحات کے عمل میں فعال شرکت کرنے کے قابل ہوں گے۔ تعلیمی اداروں کو اسلامی نظریات، حقوق انسانی، اور جمہوریت کی اہمیت پر زور دینا چاہیے تاکہ لوگ ایک بہتر اسلامی آئینی نظام کی تشکیل کی طرف راغب ہو سکیں۔

یہ تمام چیلنجز مل کر اسلامی آئینی نظام کی تشکیل کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ ان کا حل تلاش کرنا اور ایک ایسا نظام تشکیل دینا جو اسلامی اصولوں کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق اور جمہوری نظریات کو بھی اہمیت دیتا ہو، نہایت ناگزیر ہے۔

اسی طرح مسلم دنیا کی بڑی مؤثر تنظیموں، جیسے اسلامی تعاون تنظیم (OIC) ، کی مدد سے اسلامی ممالک ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ تعاون مشترکہ چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے یکجہتی کی فضا بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اسلامی ممالک میں تجربات کا تبادلہ، نظریاتی بحث، اور اصلاحات کی کامیابیوں کو سراہا جانا، سب کچھ اسلامی آئینی نظام کے قیام میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ضروری ہے کہ مسلم ممالک میں ایک جامع حکمت عملی اپنائی جائے، جو کہ سیاسی، ثقافتی، اقتصادی، اور تعلیمی پہلوؤں کا احاطہ کرے۔ ان چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے ایک مضبوط قومی اتفاق رائے، عوامی حمایت، اور عالمی تعاون کی ضرورت ہے، تاکہ اس طرح کی کوششیں کامیاب ہو سکیں۔

عرب بہار کے دساتیر پر اثرات

اس میں شک نہیں کہ عرب بہار (2010-2012) نے متعدد مسلم ممالک میں انقلابات اور بحرانوں کو جنم دیا اور مشرق وسطی عدم استحکام کی لپیٹ میں آ گیا۔ مگر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عرب بہار نے کئی ملکوں میں دستوری تبدیلیوں کی راہیں ہموار کیں اور اصلاحات کی گئیں۔ دستور کے حوالے سے عرب بہار کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کا جائزہ لینا اہم ہے۔

اس ضمن میں حسن طارق کی کتاب 'دستورانیۃ ما بعد انفجارات 2011' بہت خاص ہے۔ یہ کتاب تین اہم عرب ممالک مصر، تیونس اور مراکش کے دستوری تجربات پر روشنی ڈالتی ہے، جنہوں نے 2011 کے بعد آئینی اصلاحات کیں۔ مصنف اس کتاب میں آئینی اصلاحات کو ایک منفرد زاویے سے دیکھتے ہیں، جس میں عرب دنیا کی سیاسی تاریخ، دساتیر کے کردار اور ان دساتیر کی حقیقت پر سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ اس تجزیے میں طارق اس سوال کو اٹھاتے ہیں کہ 2011 کے بعد جو دستوری تغیرات آئے، ان کا اصل مقصد سیاسی طاقت کو محدود کرنا اور عوامی آزادیوں کا تحفظ تھا یا ان دساتیر کا مقصد حکومتوں کی طاقت کو مزید مستحکم کرنا اور سیاسی اشرافیہ کو سیاسی عمل سے بے دخل کیے جانے سے بچانا تھا؟ مثال کے طور پہ مراکش میں، 2011 کے بعد، شاہ محمد VI نے آئینی اصلاحات کا عمل شروع کیا جس میں پارلیمانی اختیارات کو بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ ان اصلاحات کے تحت مراکش میں ایک نئے آئین کا مسودہ پیش کیا گیا، جس میں بادشاہ کی طاقت کو کچھ حد تک کم کیا گیا، لیکن بادشاہت کا کردار ابھی بھی اہم رہا۔ طارق کے مطابق، حقیقت یہ ہے کہ مراکش میں جمہوریت کی طرف بہ ظاہر ایک قدم بڑھایا گیا، لیکن شاہی ادارہ اب بھی بہت طاقتور ہے، اور یہ آئین صرف ایک "جمہوری" ریکارڈ اور رنمائش کے طور پر وضع کیا گیا، جب کہ عملی طور پر اشرافیہ کی طاقت برقرار رہی۔

حسن طارق کے مطابق، دستوری اصلاحات نے ایک طرف طاقت کے ارتکاز کو روکنے کی کوشش کی، لیکن دوسری طرف ان اصلاحات میں اقتدار کی تقسیم اور شفافیت کا فقدان تھا۔ دساتیر کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ حکومت کی طاقت کو بہ ظاہر محدود کرتے ہیں، مگر اکثر عرب ممالک میں ان دساتیر کا مقصد حکومتی اختیار کو جواز فراہم کرنا اور ان کی سیاست کو "آئینی" بنانا تھا۔

ایک اہم مسئلہ جس کا سامنا عرب بہار کے بعد کئی ممالک نے کیا، وہ یہ تھا کہ ان دساتیر میں اسلامی احکامات کا کتنا کردار ہونا چاہیے۔ 2011 کے بعد، خاص طور پر مصر اور تیونس میں، اس سوال پر وسیع بحث ہوئی کہ آیا آئین میں شریعت کو قانون کا ماخذ تسلیم کیا جائے یا نہیں۔ مصر کے 2012 کے آئین میں شریعت کو بنیادی ماخذ قرار دیا گیا تھا، جو بعد میں ختم کر دیا گیا۔ تیونس میں، اسلامی شریعت کی اہمیت کو آئینی طور پر تسلیم کیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک جدید قومی جمہوری ریاست کی بنیاد بھی رکھی گئی، جو کئی لوگوں کے لیے متنازعہ تھا۔

بہر حال، عرب بہار کے نتیجے میں جو دستوری تبدیلیاں رونما ہوئیں ان اختصار کے ساتھ تجزیہ پیش ہے۔

عرب بہار اور دستوری تبدیلی کی لہر

مسلم دنیا میں دستوری بحران کی سب سے بڑی وجہ حکومتی استبداد اور جابرانہ نظام رہا ہے۔ زیادہ تر عرب ممالک میں حکومتی اقتدار خاندانوں یا قریبی طبقات کے ہاتھوں میں مرکوز تھا، جس کی وجہ سے عوامی خواہشات اور حقوق کو نظر انداز کیا گیا۔ ان استبدادی حکومتوں نے عموماً آئینی اصلاحات کو مسترد کیا یا ان کا نفاذ عوامی مفادات کی بجائے حکومتی مفادات کو تقویت دینے کے لیے کیا۔ مثلاً، مصر، تیونس اور لیبیا میں طویل عرصے تک ایک ہی خاندان کی حکومت رہی، اور انہوں نے آئین کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

اسی طرح معاشی بدحالی، بے روزگاری اور حکومت کی جانب سے عوامی سطح پر کسی مؤثر حکومتی پالیسی کا نہ ہونا بھی دستوری بحران کا باعث بنا۔ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کے آئینی حقوق کی حفاظت کے لیے کوئی طریقہ کار اور راستہ موجود نہیں ہے۔

عرب بہار نے 2010 میں تیونس سے شروع ہوئی اور پھر پورے عرب خطے میں سیاسی تبدیلیوں کی لہر پیدا کی۔ تیونس میں اس تحریک نے حکومت کو گرا دیا اور ایک نئے آئین کی تشکیل کی راہ ہموار کی۔ تیونس کے بعد مصر میں عوامی احتجاجات کی لہر آئی، جس میں لاکھوں افراد نے حکومتی استبداد کے خلاف سڑکوں پر نکل کر انقلابی تحریک کو جنم دیا۔ مصر میں حسنی مبارک کی حکومت کو گرا دیا گیا، اور ایک عبوری حکومت کے ذریعے آئینی اصلاحات کا عمل شروع کیا گیا۔ تاہم، ان اصلاحات نے متوازن اور جامع دستوری نظام کی بنیاد نہیں رکھی، اور ملک میں سیاسی اور مذہبی گروہوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے، جس کی وجہ سے مصر کے آئینی عمل میں عدم استحکام آیا۔ لیبیا میں معمر قذافی کے طویل اقتدار کے بعد عوامی تحریک نے حکومتی ڈھانچے کو مکمل طور پر درہم برہم کر دیا۔ یہاں انقلابی قوتوں نے نظام کو بدلنے کی کوشش کی، تاہم اس کے بعد آنے والی انارکی اور خانہ جنگی نے ملک کی آئینی صورتحال کو مزید پیچیدہ کر دیا۔

عرب بہار کے نتیجے میں مسلم دنیا کے مختلف ممالک میں دستوری تبدیلیاں اور آئینی اصلاحات کے عمل کی کوششیں ہوئیں، تاہم بیشتر ممالک کو یا تو کامیابیاں نہ ملیں یا پھر انہیں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔

عرب بہار کے بعد آئینی رجحانات

عرب بہار کے بعد جو آئینی اثرات مرتب ہوئے، وہ تمام ممالک میں یکساں نہیں تھے، لیکن کچھ اہم رجحانات ایسے تھے جو مشترک رہے۔ مثال کے طور پہ:

(ا) آئینی اصلاحات کی ضرورت کا ادراک

عرب بہار نے واضح کیا کہ کئی عرب ممالک میں آئینی ڈھانچے بنیادی طور پر حکومتی جابرانہ نظاموں کی حمایت کرتے ہیں۔ ان ممالک میں جمہوری اصولوں اور شہری حقوق کی کمی تھی، جو طویل عرصے تک عوامی مظاہروں کا سبب بنے۔ اس کے نتیجے میں کئی ممالک نے اپنے آئینی ڈھانچے میں اصلاحات کی ضرورت کو تسلیم کیا۔

(۲)شہری حقوق کی اہمیت

عرب بہار سے سیاسی اشرافیہ پر یہ بھی واضح ہوا اور دباؤ بڑھا کہ عوامی حقوق اور آزادیوں کی ضمانتیں موجودہ دساتیر میں ناکافی ہیں۔ اس لیے بعض ممالک نے اپنے دساتیر میں تبدیلیاں کیں تاکہ ان حقوق کو بہتر طور پر تحفظ فراہم کیا جاسکے۔

(۳)مذہبی اور سیکولر ڈھانچوں کے درمیان توازن

عرب بہار نے اس اہم بحث کو جنم دیا کہ اسلامی قوانین (شریعت) اور جدید جمہوری قوانین کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔ بہت سے ممالک میں آئینی اصلاحات میں یہ سوال مرکزی حیثیت اختیار کر گیا۔

(۴)فوجی اداروں کی طاقت میں کمی

عرب بہار نے اس بات کو بھی اجاگر کیا کہ کئی ممالک میں فوجی ادارے آئینی اور سیاسی طاقت کے مراکز بن چکے ہیں۔ ان ممالک میں آئینی اصلاحات کا مقصد فوج کے اثر ورسوخ کو محدود کرنا تھا۔

(۵)میڈیا اور راظہارِ رائے کی آزادی

آئین میں اصلاحات کا ایک اور اہم پہلو اظہار رائے کی آزادی تھا۔ عوام میں یہ شعور پیدا ہوا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ آزادی اظہار اور میڈیا کی آزادی کے بغیر ایک جمہوری معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔ لہذا آئین میں اس حوالے سے بھی بہتری لائی گئی۔

دستوری اصلاحات کا تنوع

عرب بہار کے بعد مختلف ممالک میں جو اصلاحات کا تنوع سامنے آیا، اس کو واضح کرنے کے لیے چند مثالیں پیش ہیں۔

تیونس

تیونس میں عرب بہار کامیاب رہی، جہاں ایک جامع آئین کی تشکیل کے لیے مختلف سیاسی، مذہبی اور سماجی گروہوں نے مل کر کام کیا۔ 2014 میں تیونس کا نیا آئین منظور ہوا، جو ایک جمہوری، سیکولر اور

مذہبی آزادی کی ضمانت دینے والا دستوری خاکہ تھا جس نے تیونس کی سیاست میں ایک نیا توازن پیدا کیا۔

- 2014 کا یہ نیا آئین اسلامی نظریات کو جدید جمہوریت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ آئین انسانی حقوق، جمہوریت اور آزادی سے جڑے مسائل میں معتدل ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔
- اس آئین میں ریاست کا مذہب اسلام قرار دیا گیا، لیکن مذہب اور ریاست کے درمیان واضح تفریق برقرار رکھی گئی، جس کا مقصد تمام شہریوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دینا تھا۔
- خواتین کے حقوق کو تحفظ دینے کے لیے بھی اہم اقدامات کیے گئے، اور عورتوں کو سیاسی، سماجی اور اقتصادی میدانوں میں مساوی حقوق دیے گئے۔
- اس آئین میں یہ بھی ضمانت دی گئی کہ کوئی حکومت یا سیاسی جماعت ریاستی اداروں پر غلبہ نہیں حاصل کر سکتی، اور جمہوریت کی مضبوطی کے لیے ایک مضبوط عدلیہ کا خاکہ پیش کیا گیا۔

مصر

مصر میں حسنی مبارک کی حکومت کے خاتمے کے بعد آئینی اصلاحات کی کوششیں کی گئیں، تاہم ملک میں جمہوریت کے قیام کے لیے کی جانے والی کوششیں مختصر مدت میں ناکام ہو گئیں۔ 2012 میں محمد مرسی کی حکومت نے ایک نیا آئین پیش کیا، جس میں اسلامی نظریات کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی تھی، مگر 2013 میں فوجی بغاوت کے نتیجے میں مرسی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ بعد ازاں جنرل عبدالفتاح السیسی کی قیادت میں نیا آئین بنایا گیا۔

- محمد مرسی کی حکومت کے تحت منظور ہونے والا آئین اسلامی اور شریعت کے اصولوں پر مبنی تھا، جس میں مذہب کو ریاستی قانون کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔
- اس آئین میں مذہبی آزادی اور شہری حقوق کے تحفظ کی کچھ ضمانتیں دی گئیں، لیکن اس میں سیاسی جماعتوں اور فوج کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی کوشش ناکام رہی۔
- 2013 میں مرسی کی حکومت کے خاتمے کے بعد، عبدالفتاح السیسی کی فوجی حکومت نے نئے

آئینی اصلاحات کیں، جس میں فوجی اداروں کو مزید طاقت دی گئی اور سیاسی آزادیوں کو محدود کیا گیا۔

- 2014 میں نیا آئین منظور کیا گیا، جس میں فوجی اداروں کا اثر مزید بڑھا دیا گیا اور سول سوسائٹی کے خلاف اقدامات کی گنجائش دی گئی۔

لیبیا

لیبیا میں معمر قذافی کے اقتدار کے خاتمے کے بعد ملک میں آئینی اصلاحات کا عمل بہت مسائل کا شکار ہو گیا۔ قذافی کی 42 سالہ حکومت کے دوران ملک میں کوئی مستقل آئین نہیں تھا، اور اس کی جگہ ایک شخصی حکومتی نظام تھا جس میں بنیادی آئینی اصول موجود نہیں تھے۔ لیبیا میں معمر قذافی کے اقتدار کے خاتمے کے بعد ملک میں آئینی بحران جاری رہا جو ابھی تک چل رہا ہے۔ یہاں مختلف سیاسی گروہوں اور ملیشیاؤں کے درمیان اقتدار کی جنگ نے شدید عدم استحکام پیدا کر دیا ہے۔

- 2011 میں قذافی کے اقتدار کے خاتمے کے بعد، ایک عبوری حکومت قائم کی گئی اور 2012 میں قومی کانگریس نے آئین کی تشکیل کے لیے کمیٹی تشکیل دی۔
- یہاں کا آئینی عمل بحران کا شکار رہا کیونکہ مختلف سیاسی گروہ، ملیشیا اور قبائل ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہو گئے۔
- آئینی اصلاحات کے عمل میں کئی بار رکاوٹیں آئیں، اور یہاں تک کہ 2014 میں نئے انتخابات کے بعد بھی ملک میں کوئی مستحکم آئینی نظام قائم نہ ہو سکا۔
- لیبیا میں آئینی عمل کا عدم استحکام اور خانہ جنگی نے ایک مستقل آئین کی تشکیل کو ناممکن بنا دیا۔

یمن

- یمن میں 2011 میں علی عبداللہ صالح کے اقتدار کے خاتمے کے بعد، ملک میں آئینی اصلاحات کا عمل شروع ہوا، لیکن یہاں بھی سیاسی انتشار اور خانہ جنگی نے اس عمل کو متاثر کیا۔

- 2011 کے احتجاج کے بعد ایک عبوری حکومت تشکیل دی گئی اور 2012 میں صدر منصور ہادی کی قیادت میں آئینی اصلاحات کی کوشش کی گئی۔
- آئین میں پارلیمنٹ کی تشکیل، سیاسی آزادیوں کا تحفظ، اور عوامی رائے کو شامل کرنے کے اقدامات کیے گئے۔
- تاہم، حوثی باغیوں کے خلاف حکومتی افواج کی جنگ اور سعودی اتحاد کی مداخلت نے آئینی اصلاحات کے عمل کو شدید متاثر کیا۔
- 2015 کے بعد ملک میں خانہ جنگی اور سیاسی بحران نے آئینی اصلاحات کے عمل کو مزید مشکل بنا دیا۔

بحرین

- بحرین میں 2011 میں عرب بہار کی تحریک کی شدت کم رہی، لیکن یہاں بھی اس کے بعد سیاسی اصلاحات کی کوششیں کی گئیں، خاص طور پر شیعہ اکثریتی آبادی کے حقوق کے حوالے سے۔
- بحرین میں 2011 میں احتجاج کے بعد حکومت نے چند سیاسی اصلاحات کیں، جیسے پارلیمنٹ میں نمائندگی بڑھانا اور بعض آزادیوں کا تحفظ کرنا۔
- 2012 میں بحرین نے آئینی اصلاحات کی ایک نئی کوشش کی، جس میں پارلیمان کو حکومتی اختیارات میں حصہ دیا گیا۔
- بحرین میں سیاسی اصلاحات کے باوجود ملک میں آئینی تبدیلیوں میں پیش رفت شدت محدود رہی۔

شام

عرب بہار شروع ہونے کے بعد بشار الاسد نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے آئینی اصلاحات کا وعدہ کیا۔ تاہم، ان اصلاحات کا مقصد زیادہ تر حکومت کی طاقت کو مزید مستحکم کرنا تھا، نہ کہ حقیقی جمہوریت یا عوامی آزادیوں کی طرف قدم بڑھانا۔

- 2011 میں، بشار اسد کی حکومت نے شامی آئین میں ترمیم کرنے کی کوشش کی اور ایک نیا آئین پیش کیا، جس میں حزبِ اختلاف کے لیے بھی سیاسی عمل میں شرکت کی گنجائش رکھی گئی تھی۔
- 2012 میں شامی حکومت نے ایک اور نیا آئین منظور کیا جس میں متعدد دفعات کو تبدیل کیا گیا، جیسے کہ یک جماعتی نظام کو ختم کر کے متعدد جماعتوں کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت دینا، اور آزادی اظہار کو بہتر بنانے کے وعدے کیے گئے۔

ان دو چار آئینی اصلاحات کو بہت سے نقادوں نے محض سیاسی تماشہ قرار دیا، کیونکہ اس کے بعد بھی بشار الاسد کی حکومت نے اپنے مخالفین کو دبانے کا عمل جاری رکھا۔ نئے آئین میں حزب اللہ اور دیگر غیر ریاستی مسلح جماعتوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کی کوئی واضح حکمت عملی نہیں تھی، اور اس آئین میں جنگی جرائم کے خلاف بھی کوئی بات نہیں کی گئی تھی۔

عراق

عراق کی آئینی اصلاحات کا عمل ایک مختلف پس منظر میں تھا۔ وہاں دستوری اصلاحات کا آغاز 2003 میں صدام حسین کے اقتدار کے خاتمے کے بعد ہوا، اور اس کے بعد امریکی افواج نے عراقی سیاست میں ایک نیا آئینی ڈھانچہ وضع کیا۔ عراق میں آئینی اصلاحات کا مقصد ایک جمہوری اور وفاقی ریاست کا قیام تھا، لیکن ملک کی فرقہ وارانہ تقسیم اور سیاسی استحکام کی کمی نے اسے خواب ہی رہنے دیا۔

- عراق کا موجودہ آئین 2005 میں منظور کیا گیا تھا، اور اس کا مقصد ملک میں ایک جمہوری وفاقی ریاست کی بنیاد رکھنا تھا۔
- آئین میں وفاقی حکومت کے ساتھ ساتھ کردستان کی خود مختاری کو تسلیم کیا گیا اور عراقی عوام کو بنیادی حقوق اور آزادیوں کی ضمانت دی گئی۔
- اس آئین میں شہری آزادیوں، آزادی اظہار، خواتین کے حقوق، اور اقلیتی گروہوں کے حقوق کو اہمیت دی گئی۔
- 2014 میں شیعہ صدر نوری المالکی کی حکومت کے دوران سنی اور کرد اکثریتی علاقوں میں

شدید سیاسی بحران پیدا ہوا، جس کی وجہ سے آئین میں مزید تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی۔

- 2017 میں، عراقی حکومت نے کردستان کے ساتھ بات چیت کی تاکہ آئین میں اس کے حقوق کو بہتر طریقے سے تحفظ فراہم کیا جاسکے۔

عراقی آئین میں اصلاحات کی کوششیں ہمیشہ فرقہ وارانہ سیاست اور بیرونی مداخلت سے متاثر ہوئیں۔ امریکی افواج کی عراق میں موجودگی کے بعد آئین میں جتنی بھی تبدیلیاں آئیں، وہ ہمیشہ عراقی سیاست میں درپیش مختلف چیلنجز اور ان مشکلات کے تناظر میں کی گئیں، مگر مسائل کبھی حل نہ ہوئے۔ ملک میں سیاسی بحران اور فرقہ وارانہ جنگوں نے اس عمل کو اور بھی ناکامی سے دوچار کر دیا۔

ریاست کے اسلامی ہونے کے معیارات اور سیاسی تشکیل کی قدریں

علامہ مختار شنقیطی*

اسلامی تمدن میں ائینی بحران کے جاری رہنے اور کسی حل تک نہ پہنچ پانی کی ایک وجہ وہ غموض اور التباس ہے جو دور جدید میں اسلامی ریاست کے تصور کو گھیرے ہوئے ہیں، جس کے نتیجے میں ایک المناک تضاد پیدا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے دل ایک اخلاقی سیاسی خیال سے وابستہ ہیں، جس پر ان کے دین کی نصوص، ان کے نبی ﷺ کی سیرت اور ان کے خلفائے راشدین کی زندگی دلالت کرتی ہے ،اور وہ اس خیال سے دستبردار ہونے کے لیے راضی نہیں ہیں، خواہ اکتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں اور کیسی ہی ہولناکیوں سے دوچار ہونا پڑے۔ لیکن اس خیال کی مجسم شکل، اس کو جانچنے کی منضبط معیارات اور ان سے تنفیذ کے مقام تک پہنچانے والے عملی طریقے واضح کرنے کے لیے جو محنت ناگزیر تھی وہ ان کی عقلوں نے نہیں کی۔

رشید رضا نے اس بات کا ادراک کر لیا تھا کہ اسلام کی قدروں اور اس کے سیاسی قوانین کو اداروں اور طریقہ کار کے پیکر میں پیش کرنے میں کوتاہ رہنا مسلمانوں کی بڑی کوتاہی تھی، وہ لکھتے ہیں:

> ''اہل حل و عقد سربراہوں میں کوئی ایسا نہیں پایا گیا جسے خلافت کے لیے ایک شرعی نظام وضع کرنے کی سوجھی ہوتی، اس مفہوم میں جسے آج تک کے زمانے میں اساسی قانونی (دستور) کہا جاتا ہے جس میں وہ شریعت کی نصوص کے ذریعے خلیفہ کا اقتدار اور معاملات میں مشاورت کو مقید کرتے جس طرح انہوں نے سیاست

---

* یہ مضمون مختار شنقیطی کی کتاب کے اردو ترجمہ 'اسلامی تمدن میں آئینی بحران' سے لیا گیا ہے۔

انتظام، وصولی، عدلیہ اور جنگ کے واجب العمل احکام کے لیے ضخیم کتابیں وضع کیں۔ اگر انہوں نے اس سلسلے میں کتاب تیار کی ہوتی جس میں قرآن و سنت اور خلفائے راشدین کی سیرت کے دلائل کی قوت ہوتی اور اس میں وہ وارثوں کے لیے ولی عہدی کو منع کرتے، خلیفہ کے انتخاب میں شوری کی قید عائد کرتے اور واضح کرتے کہ اقتدار امت کے لیے ہے جسے اس کے اہل حل و عقد انجام دیتے ہیں اور اسے قابل اتباع اصول بنا دیتے، تو ہم آج اس حالت میں نہیں پڑے ہوتے جس میں جا پڑے ہیں"۔

رشید رضا نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ اسلام کی سیاسی قدروں کو اداروں قوانین اور طریقہ کار کی شکل دینے کے لیے معاصر انسانی ارتقاء سے استفادہ کریں۔ یہ قدر تاریخی حق تلفی کا شکار ہوئی اور صدیوں سے اس کی اثر افرینی تعطل کا شکار ہے۔ یہ بات ہم نے اس سے پہلے وضاحت سے ذکر کی کہ امریکی جمہوریت کے بانی باباؤں نے کس طرح ارسطو کے زمانے سے اپنے زمانے تک پھیلے ہوئے سیاسی فلسفے کے طویل ورثے پر بنار کھی اور ان بڑے سیاسی افکار سے بھی رشتہ استوار کیا جنہیں امریکی انقلاب سے کچھ پہلے تک یورپ میں جان لاک، مانٹیسکو اور روسو جیسے سیاست کے فلسفیوں نے تراشا تھا۔ لیکن امریکی باباؤں کی عبقریت اصل میں ان نظری افکار کو اجرائی صیغوں اور پختہ اداروں میں تبدیل کرنے میں ظاہر ہوئی۔ حالانکہ ان افکار کو تراشنے والے اس کام میں ناکام ہو چکے تھے۔ اسٹیفن اسمتھ نے بہت خوب کہا ہے کہ "امریکی بانیوں نے کوشش کی کہ اپنے افعال سے اس چیز کو حقیقت کا روپ دیں جسے ان سے 2 ہزار سال پہلے افلاطون نے اقوال کے زور سے حقیقت پذیر کرنا چاہا تھا"۔

اسی لیے اسلامی تمدن کو اس کے ائینی بحران سے نکالنے اور عالم اسلام میں صحیح سمت میں سیاسی سفر کو از سر نو جاری کرنے کے لیے پہلی شرط ریاست کے اسلامی ہونے کے اجرائی پیمانوں کو ڈھالنا ہے جو قرآن و سنت میں منصوص قدروں کو عملی ضابطوں میں تبدیل کر دیں، جن کو ناپنا اور معاصر معاشروں میں ان کے انطباق کو یقینی بنانا ممکن ہو اور اس طرح سیاسی نظاموں کی ان سے مطابقت یا عدم مطابقت کا فیصلہ آسان ہو جائے۔ اب ہم نیچے کے دونوں جدولوں میں دیکھیں گے۔ یہ پہلی اور

دوسری فصل میں مذکور اسلامی قدروں کو دستوری اصولوں اور منضبط پیمانوں کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان کی بناپر دور حاضر میں ریاست کے اسلامی ہونے کا فیصلہ کیا جاسکے۔

سیاسی تشکیل کی قدریں

نمبر شمار	سیاسی قدر	اس کی معاصر عملی شکلیں
۱	انسان کی تکریم اور اس کا خلیفہ ہونا	اقتدارِ عام پر واجب ہے کہ اپنے زیر اقتدار ہر انسان کی زندگی، اس کی آزادی، اس کی دولت اور اس کی عزت کی نگہداشت کرنا اور انسان کے شرف وانسانیت کی کسی طرح کی بے حرمتی کو روکنا اور اسے اپنے اخلاقی مشن کی ادائیگی کا پورا موقع دینا۔
۲	سیاسی بت پرستی کو مسترد کرنا	کسی حاکم کو کسی طرح کا تقدس یا قانون کی عملداری سے کسی طرح کا استثناء حاصل نہیں ہے۔ قانون کے سامنے حاکم اور محکوم برابر ہیں۔ قوم کا حق اور فرض ہے حاکم کی کردگی کا احتساب کرنا اور اس کی نااہلی یا خیانت کی صورت میں اسے معزول کردینا۔
۳	فرعونی ہرمی ترتیب کو الٹ دینا	منصبِ عام کی زمام کار جس کے ہاتھ میں ہو وہ قوم کے نزدیک اجیر ہے، اسے کوئی تقدس حاصل نہیں ہوتا۔ تکبر اور سروں پر سواری کا اسے حق نہیں ہے، اسے سماج کو تقسیم کرنے کا اختیار ہے اور نہ ہی قوم سے ہٹ کر اپنے لیے ایک خوشامدی درباریوں کا ٹولہ بنانے کا۔
۴	عدل اور فضل کو یکجا کرنا	ریاست کی تاسیس ایسے آئینی تصور کی بناپر ہونی چاہیے جو عدل اور سماجی تکافل کو یقینی بنائے اور اخلاقی طور پر پابند ہونے اور قانونی طور پر پابند کرنے کو یکجا کرے۔ اس کے لیے منصفانہ قوانین بنائے جائیں اور فاضلانہ اخلاق کی پرورش کی جائے۔
۵	سیاسی اقتدار ضروری ہے	وطنی اجتماعیت کے وجود اور اسلامی امت کی وحدت کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ایسی ریاست قائم کی جائے جس میں اقتدار کی اطاعت کی جائے، اس کے ادارہ جاتی وجود کی حفاظت کی جائے،

نمبر شمار	سیاسی قدر	اس کی معاصر عملی شکلیں
		سیاسی خلفشار کو روکا جائے اور اس کا راستہ بند کیا جائے۔
۶	آزادی موقع اور ذمہ داری ہے	افراد یا جماعتوں کی آزادی پر قدغن یا انفرادی اور اجتماعی پیش قدمیوں پر روک لگانا جائز نہیں ہے، سوائے اس کے کہ مفادِ عام اسے حتمی ضرورت قرار دے۔ جن مصالح کی تکمیل سول سوسائٹی کر سکتی ہو انہیں سیاسی اقتدار اپنے ہاتھ میں نہ لے۔
۷	حکومت اور تقسیم میں انصاف	عمومی مناسب کو سنبھالنے کے سلسلے میں قوم کے افراد یکساں ہیں۔ اس کے لیے ان کی اہلیت اور ان کے ذریعے مصالح عامہ کا حصول پیش نظر رہے گا۔ وہ عمومی اقتدار کے ثمرات اور عمومی دولت سے استفادے کے معاملے میں بھی برابر ہیں۔
۸	سیاسی اہلیت میں برابری	قوم کے درمیان قبیلہ، قوم یا مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا جائز نہیں ہے، نہ تو عمومی مناسب کو سنبھالنے میں اور نہ ہی عمومی اقتدار کے ثمرات سے استفادہ کرنے میں۔
۹	سماجی مراتب کو کالعدم کرنا	قوم کے افراد کے درمیان نسل، رنگ یا جنس کی بنیاد پر تفریق کرنا جائز نہیں ہے، نہ تو عمومی مناصب کو سنبھالنے میں اور نہ ہی عمومی اقتدار کے ثمرات سے استفادہ کرنے میں۔
۱۰	سیاسی نمائندگی کی ضروری ہے	قوم پر واجب ہے کہ اپنے ایسے عمومی امور کے انجام دہی کے لیے جنہیں سب مل کر راست انجام نہیں دے سکتے اہل افراد کو نمائندہ بنائیں۔ اس میں تنفیذی اقتدار، قانون ساز اقتدار اور عدلیہ کا اقتدار شامل ہے۔ نمائندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نمائندگی کے معاہدے کی پابندی کرے۔
۱۱	حکومت سازی میں شورائیت	حاکم کو حاکم بننے کا جواز صرف ایک صورت میں حاصل ہوتا ہے اور وہ اس وقت جب محکومین اسے منتخب کریں۔ غرض حاکم بنانے، احتساب کرنے اور معزول کرنے کے معاملے میں قوم ہی سیاسی

نمبر شمار	سیاسی قدر	اس کی معاصر عملی شکلیں
		جواز کا ماخذ ہے۔اسی لیے وقت پر انتخاب کرانا ضروری ہے جس سے قوم کو ان تینوں پہلوں سے اپنی ذمہ داری انجام دینے کا موقع حاصل رہے۔
۱۲	سیاسی بیعت کا انعقاد	انتخابات کی حیثیت پوری قوم اور اس کی اکثریت کے ذریعے منتخب فرد کے بیچ معاہدہ کی ہے۔اسی کی بناپر منتخب حکومت کو اطاعت اور نصرت کا حق حاصل ہوتا ہے اور کوشش و خیر خواہی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس معاہدے کو عہدہ تفویض کرنے کی مجلس منعقد کر کے اور حلف برداری کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے، جس میں منتخب قیادت حلف اٹھائے۔
۱۳	جماعت اور اس کے امام سے وابستگی	قوم کے ذریعے منتخب حکومت اور اجتماعی فیصلے سے صادر ہونے والے قوانین کی اطاعت واجب ہے بشرطیکہ اللہ کی نافرمانی نہ ہو۔اور اجتماعیت کے فیصلے کا دفاع کرنا ان لوگوں کے خلاف واجب ہے جو اس سے بغاوت کریں اور اس کی صف میں تفریق ڈالیں۔
۱۴	جائز حکومت کی اطاعت	قوم کے ذریعے منتخب ہونے والے سیاسی قائدین کی اطاعت، انہیں قوم سے مربوط کرنے والے دستوری میثاق کی دفعات کے دائرے میں واجب ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اللہ کی نافرمانی نہ ہو اور ان کے خلاف بغاوت کرنے والوں کی نصرت بذریعہ طاقت واجب ہے، جب تک وہ اس میں میثاق کی دفعات کے پابند ہوں۔
۱۵	امارت کی خواہش کی ممانعت	یہ جائز نہیں ہے کہ ایک فرد اپنے آپ کو کسی عمومی منصب کو حاصل کرنے کے لیے پیش کرے، سوائے اس حالت کے کہ جب سیاسی خلا پیدا ہو جائے جو ریاست کے وجود اور اجتماعیت کے ڈھانچے کے لیے خطرہ ہو۔نام پیش کرنے کا کام پارٹیوں، مجلسوں اور عام لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔

نمبر شمار	سیاسی قدر	اس کی معاصر عملی شکلیں
۱۶	بگاڑ سے محفوظ رکھنے والی مدافعت	قانون سازی، عدلیہ اور تنفیذ کے دائروں کو الگ الگ رکھنا واجب ہے، اس طرح کہ ان کے بیچ توازن قائم رہے۔ پارٹیوں، میڈیا اور یونینز کی سطح پر تکثیریت کا قیام ضروری ہے جو سماج کے تنوع کی آئینہ دار ہو اور امور عامہ پر اجارہ داری کو روکے۔

سیاسی عمل کی قدریں

نمبر شمار	سیاسی قدر	اس کی معاصر عملی شکلیں
۱	اللہ اور رسول کی طرف لوٹانا	اسلام کے ماخذ و مرجع ہونے کو دستوری لحاظ سے تحفظ دینا واجب ہے، اس طور سے کہ تمام قوانین اسلامی وحی سے لیے گئے ہوں یا اس کے خلاف نہ ہوں۔ دستوری نگرانی کے اداروں کا قیام ضروری ہے جو اس تحفظ کو یقینی بنائیں۔
۲	سوادِ اعظم کی پابندی	قوم کے اچھے لوگوں کی اکثریت یا ان کے نمائندے امور عامہ میں (جیسے انتخابات اور قوانین کا اجراء) اختلاف کو ختم کرنے کے سلسلے میں شرعی معیار ہیں۔ بعض اہم امور میں جہاں تک ہو سکے اجماع اور اتفاق رائے کا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔
۳	ظالم کا ہاتھ پکڑنا	کسی بھی ظلم کے مرتکب ہونے پر منصب عام سنبھالنے والے کا محاسبہ واجب ہے۔ اس کا منصب پر رہنا اسے اس سے محفوظ نہیں رکھے گا اور خود اس پر واجب ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے اور مظلوم کو ظالم سے انصاف دلائے۔
۴	مال، اللہ کا مال ہے	عمومی دولت کی حفاظت و نگہداشت، اس میں اضافہ اور اس کی جمع و تقسیم میں عدل ضروری ہے۔ اس کے لیے ایسی صورت اپنائی جائے کہ اس سے مفادِ عام کی تکمیل ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مالِ عام اور مال خاص میں واضح فرق رکھا جائے، خاص طور سے ان کا مال جو منصب عام سنبھالے ہوئے ہیں۔

نمبر شمار	سیاسی قدر	اس کی معاصر عملی شکلیں
۵	کرپشن اور رشوت کو روکنا	مالِ عام پر دست درازی کرنے والے کو سزا دینا ضروری ہے، وہ حاکم ہو یا محکوم۔ نیز ایسے قوانین بنانا جو رشوت کے لین دین دونوں کو جرم قرار دیں اور ایسے نگران ادارے بنانا جو امور عامہ میں مالی شفافیت کو یقینی بنائیں۔
۶	امانت یا اخلاقی اہلیت	ضروری ہے کہ منصب عام کو سنبھالنے والا امانت اور اخلاقی پاکیزگی سے متصف ہو۔ یہ جائز نہیں ہے کہ منصب عام ایسے شخص کو دیا جائے جس کے خلاف خیانت اور دھوکہ دہی کا فیصلہ ہو چکا ہو، سوائے اس کے کہ اس نے جو ناجائز مال بنایا وہ سب واپس کر دے، اور اس کی توبہ اور راست روی بلاشک وشبہ ثابت ہو جائے۔
۷	قوت یا علمی اہلیت	یہ ضروری ہے کہ منصب عام سنبھالنے والا یہ علم رکھتا ہو کہ اسے جو ذمہ داری دی گئی ہے وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہے اور وہ کسی قرابت دار یا دوست یا کسی اور کے ساتھ رعایت کرنے سے اجتناب کرے۔ جانکاری کے مشمولات ہر منصب اور اس کے تقاضوں کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔
۸	سیاسی مناسبت یا حکمت	ضروری ہے کہ منصب سنبھالنے والا زمان ومکان کے پہلو سے اس منصب کے لیے مناسب ہو، مناسب ہونے کا ایک پیمانہ یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے قابل قبول ہو جن کے امور کی بھاگ ڈور اس کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے۔ اسے ان پر مسلط کرنا جائز نہیں خواہ وہ اس میں منصب کا اہل کیوں نہ ہو۔
۹	فیصلہ سازی میں مشاورت	منصب عام سنبھالنے والے کے لیے علم، جانکاری اور تجربے والوں سے، نیز فیصلے کے نتائج سے متاثر ہونے والوں سے مشاورت کرنے کے بعد ہی فیصلہ کرنا جائز ہے۔ اختیارات، مشاورت کے طریقے اور مشاورت کے نتیجے کی پابندی کے سلسلے

نمبر شمار	سیاسی قدر	اس کی معاصر عملی شکلیں
		میں قانون سازی کی جائے۔
۱۰	حاکم اور محکوم کی جانب سے خیر خواہی	انتخاب کرنے والے ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ منصب کے لیے موزوں ترین افراد کا انتخاب کرے۔اس میں شخصی مصلحت کی بناپر کوئی مداہنت یا سودے بازی نہ ہو۔عام لوگوں کی خدمت کے لیے کوشش کرتے رہنا منصب عام سنبھالنے والے پر واجب ہے۔
۱۱	حاکم رعایا کے ساتھ نرمی کرے	منصب عام سنبھالنے والے پر واجب ہے کہ لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے، ان کے کمزوروں کی نگہداشت کرے۔اسے اس سے روکا جائے کہ وہ ان کے ساتھ سختی اور جبر کا معاملہ کرے۔
۱۲	حاکم کا رعایا سے پردہ کرنا منع ہے	منصب عام سنبھالنے والے پر واجب ہے کہ قوم کو راست واسطوں کے ذریعے اپنے تک رسائی کے امکانات فراہم کرے اور اس کا موقع میسر کرے کہ وہ اپنی شکایتیں اور مشورے اس کے پاس پیش کریں اور اس میں ان کا وقت اور مال کا ضیاع نہ ہو۔
۱۳	دین میں زبردستی منع ہے	دین کی آزادی خواہ اعتقاد کے پہلو سے یا مراسم بندگی کے پہلو سے، اس پر بندش لگانا جائز نہیں۔ فکر اور اظہار کی آزادی پر بھی قدغن نہیں لگائی جائے گی، سوائے اس کے کہ مفاد عام کی ضرورت ہو۔دین میں زبردستی منع ہے۔
۱۴	اسلامی اُمت کی وحدت	ایک جامع ڈھانچہ کھڑا کیا جائے جو اسلامی امت کے سیاسی ارادے کی وحدت کو یقینی بنائے اور اس کے لیے باہم نصرت و تعاون کو ممکن بنائے۔اور اس کے لیے باہم نصرت و تعاون کو یقینی بنائے۔ یہ وحدت حسب ضرورت اور حسب حال، انضمام کی صورتوں میں بھی ہو سکتی ہے اور ارتباد کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔

دستور سے متعلق
مذہبی تحریکات کے نظریات

جدید آئینی تشکیل: مذہبی جماعتوں کے نظریات کا تجزیہ

اخوان المسلمین اور جماعت اسلامی، جو پوری دنیا میں سیاسی اسلام کی فکر کے نمایاں دھڑے ہیں، جدید آئینی تشکیل اور آئینی فریم ورک پر معتدل موقف رکھتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں نے مذہبی اصولوں کے تحت جدید آئین کے تصور کو اپنانے کی حمایت کی ہے، تاکہ ریاست میں اسلامی قوانین اور جمہوری اصولوں کے امتزاج کو فروغ دیا جا سکے۔ ان کی فکر اسلامی شریعت کے نفاذ اور جدید جمہوری ڈھانچوں کے ساتھ ہم آہنگی کی کوششوں پر مبنی ہے۔

اخوان المسلمین کا نقطہ نظر

اخوان المسلمین نے جدید آئینی نظام کو اپنانے کے لیے جمہوریت اور شریعت کی ہم آہنگی پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک آئین اسلامی قوانین کی بنیاد پر ترتیب دیا جائے، لیکن عوام کی رائے اور سماجی انصاف کو بھی شامل کیا جائے۔ 2012 میں مصر کے آئین کی تشکیل میں اخوان المسلمین نے اہم کردار ادا کیا۔ اس آئین میں شریعت کو قانون سازی کی بنیاد قرار دیا گیا، مگر ساتھ ہی عوام کے بنیادی حقوق اور آزادیوں کو بھی شامل کیا گیا۔ جماعت کے اہم رہنما حسن البنا اور سید قطب نے اسلامی شریعت اور جدید سیاسی نظام کے امتزاج کی حمایت کی، مگر سید قطب کا زیادہ سخت گیر موقف تنظیم کے اندر اختلافات کا باعث بنا۔

اخوان المسلمین جمہوری عمل کو اسلامی اصولوں کے مطابق سمجھتی ہے اور اس نے مختلف ملکوں میں انتخابات میں حصہ لے کر کے عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ 2012 میں محمد مرسی کے صدر منتخب ہونے کے بعد اخوان نے جمہوری اصولوں کے تحت حکومت چلانے کی کوشش کی، تاہم یہ تجربہ سیاسی مخالفت، فوجی مداخلت اور سماجی دباؤ کی وجہ سے نہیں چل سکا۔

جماعت اسلامی کا نظریہ

جماعت اسلامی جدید آئینی تشکیل کی حمایت کرتی ہے، لیکن اس کے لیے اسلامی اصولوں کو مرکزی حیثیت دیتی ہے۔ مولانا مودودی نے اسلامی ریاست کو ایک آئینی ریاست کے طور پر پیش کیا، جہاں قانون سازی شریعت کے مطابق ہو، مگر حکمرانی جمہوری اصولوں پر مبنی ہو۔ 1956 میں پاکستان کے پہلے آئین میں جماعت اسلامی نے اسلامی دفعات شامل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جماعت اسلامی تشدد کے بجائے آئینی اور جمہوری ذرائع سے اسلامی نظام کے قیام پر یقین رکھتی ہے۔ اس نے نے پاکستان میں انتخابات کے ذریعے سیاسی تبدیلی لانے کی کوشش کی اور آئینی فریم ورک میں اصلاحات کی حمایت بھی کی۔

جدید آئین کی تشکیل کے حق میں دیگر اسلامی سیاسی طبقات

مسلم ممالک کی بعض بہت سی جماعتیں جدید آئینی تشکیل کی حمایت کرتی ہیں، بشرطیکہ ان میں اسلامی اصولوں کو بھی شامل کیا جائے۔ رجب طیب اردگان کی قیادت میں AKP (جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی) نے ترکی کے آئین میں اسلامی اصولوں کو شامل کرنے کے ساتھ سیکولر ڈھانچے کو بھی برقرار رکھا۔ ملیشیا کی پارٹی Pan-Malaysian Islamic Party(PAS) جدید آئینی فریم ورک کے تحت اسلامی قوانین کے نفاذ کی کوشش کرتی ہے اور جمہوری عمل کو اپناتی ہے۔ تیونس کی النہضہ پارٹی بھی جمہوری آئینی عمل کے ذریعے اسلامی اور سیکولر اصولوں کے امتزاج پر زور دیتی ہے۔ مراکش کی جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی بھی جدید آئین کی تشکیل کی حامی ہے، اور اس نے اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے آئینی اصلاحات کی ہمیشہ حمایت کی۔

خلاصہ یہ کہ اخوان المسلمین، جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی جیسی مذہبی جماعتوں نے جدید آئینی تشکیل کے حق میں ایک معتدل موقف اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک اسلامی شریعت اور جمہوری اصولوں کا امتزاج ایک ایسا نظام فراہم کر سکتا ہے جو عوام کے حقوق کا تحفظ کرے اور اسلامی تشخص کو برقرار رکھے۔ یہ جماعتیں جدید آئین کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں، جبکہ سخت گیر تنظیمیں اسے مکمل طور پر مسترد کرتی ہیں۔ معتدل مذہبی جماعتوں کے تجربات نے

یہ ثابت کیا ہے کہ آئینی عمل کے ذریعے پرامن تبدیلی ممکن ہے، بشرطیکہ تمام فریقین تعاون کریں۔

اسلامی خلافت کا تصور اور جدید آئینی ڈھانچوں کی مخالفت

اسلامی خلافت کا تصور کئی سخت گیر مذہبی تنظیموں جیسے حزب التحریر، القاعدہ، اور دیگر کے نظریاتی بیانیے کا مرکزی محور ہے۔ یہ تنظیمیں خلافت کو اسلامی طرزِ حکمرانی کا واحد جائز اور مستند ماڈل قرار دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک خلافت نہ صرف ایک دینی فریضہ ہے بلکہ ایک ایسا سیاسی نظام بھی ہے جو اسلامی احکامات کو عملاً یقینی بناتا ہے۔ اس تصور کے تحت، جدید قومی ریاستیں اور ان کے آئینی ڈھانچے غیر اسلامی اور شریعت کے اصولوں کے منافی تصور کیے جاتے ہیں۔ مسلم دنیا میں اس طرح کے کئی ایسے سخت دھڑے بھی ہیں جو جدید آئین کو مسترد کرتے ہیں۔ القاعدہ اور داعش جیسی سخت گیر تنظیمیں جدید آئینی نظام کو تسلیم نہیں کرتیں کیونکہ وہ اسے مغربی سازش اور غیر اسلامی قرار دیتی ہیں۔

اسلامی خلافت کا تصور سخت گیر تنظیموں کی سوچ کا ایک مرکزی عنصر ہے، جو جدید آئینی ڈھانچوں کو غیر اسلامی سمجھ کر مسترد کرتی ہیں۔ تاہم، اس تصور کی عملی تعبیر میں اختلافات اور شدت پسندانہ رویے مسلم دنیا میں مزید تقسیم اور تناؤ کا باعث بنتے ہیں۔ اسلامی خلافت کا تصور رسول اللہ ﷺ کی ریاست مدینہ سے اخذ کیا جاتا ہے، جسے ایک مثالی اسلامی حکمرانی کا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ بعد میں خلافت راشدہ اور عباسی و عثمانی خلافتوں کو بھی ایک مقدس سیاسی نظام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ سخت گیر تنظیموں کے مطابق، خلافت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حکمران اللہ کے احکامات اور شریعت کے مطابق فیصلے کرے اور مسلمانوں کو ایک عالمی سیاسی و مذہبی وحدت میں جوڑ کر رکھے۔

حزب التحریر کا نظریہ

حزب التحریر خلافت کے احیاء کو اپنی تحریک کا واحد مقصد قرار دیتی ہے۔ اس جماعت کے مطابق، موجودہ آئینی ڈھانچے مغربی طاقتوں کی سازش کا نتیجہ ہیں جو اسلامی امت کو تقسیم کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ ان کے لٹریچر میں خلافت کی بحالی کو فرضِ عین قرار دیا گیا ہے۔ جماعت کی کتاب 'نظام الاسلام' میں خلافت کے تفصیلی خاکے پیش کیے گئے ہیں، جہاں ایک خلیفہ تمام مسلمانوں کی قیادت کرے گا، اور آئین مکمل طور پر قرآن و سنت پر مبنی ہوگا۔ حزب التحریر کے نزدیک موجودہ قومی

ریاستیں غیر اسلامی ہیں، کیونکہ یہ قومی قومیت اور سیکولر آئین پر مبنی ہیں، جو امتِ مسلمہ کے اتحاد کے خلاف ہیں۔

القاعدہ اور خلافت کا نظریہ

القاعدہ خلافت کے احیاء کو اپنے بیانیے کی بنیاد سمجھتی ہے، لیکن اس کا طریقہ حزب التحریر سے مختلف ہے۔ القاعدہ طاقت کے ذریعے اسلامی حکومت کے قیام پر یقین رکھتی ہے اور جدید آئینی نظام کو مغربی سامراج کا تسلسل قرار دیتی ہے۔ اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کے افکار میں خلافت کے نظام کو اسلامی امت کی بقاء اور مغربی غلبے کے خاتمے کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ القاعدہ کے نظریات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جدید آئینی نظام اسلام کی بنیادوں کو ختم کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے اس کے خلاف جہاد ضروری ہے۔ القاعدہ کے بیانیے میں جدید آئینی نظام کو ایک استعماری ورثہ کہا گیا ہے۔ اسامہ بن لادن کے بیانات میں مغربی تہذیب کو "کفر کا نظام" قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ اس نظام نے مسلمانوں کو اقتصادی، سیاسی، اور سماجی طور پر غلام بنایا ہے۔

جدید آئین کو مسترد کرنے کی وجوہات

یہ تنظیمیں جدید آئینی نظام کو مسترد کرنے کے لیے چند اہم نکات پر زور دیتی ہیں۔ ایک تو، آئینی ڈھانچے، جیسا کہ جمہوریت اور سیکولرزم، ان کے نزدیک مغربی تصورات ہیں، جو اسلامی تہذیب کو کمزور کرنے کے لیے درآمد کیے گئے۔ حزب التحریر اور القاعدہ دونوں کے لٹریچر میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مغربی طاقتوں نے خلافت کو ختم کرنے کے بعد قومی ریاستوں کا نظام متعارف کروایا تاکہ مسلمانوں کو متحد ہونے سے روکا جاسکے۔

یہ تنظیمیں جدید آئین کو غیر اسلامی قرار دیتی ہیں کیونکہ ان میں شریعت کو مکمل طور پر نافذ نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر، حزب التحریر کا ماننا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کا آئین صرف قرآن وسنت پر مبنی ہونا چاہیے، اور کوئی بھی انسانی قانون سازی غیر اسلامی ہے۔

ان جماعتوں کے مطابق، جدید قومی ریاستیں مسلمانوں کو قومیتوں اور جغرافیائی سرحدوں میں تقسیم

کرتی ہیں، جبکہ خلافت ایک عالمی نظام کے تحت تمام مسلمانوں کو جوڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کے نزدیک قومی ریاستوں کا نظام اسلامی وحدت کے تصور کو ختم کرتا ہے۔

ان تنظیموں کے مطابق، نوآبادیاتی دور میں مسلم دنیا میں نافذ کیے گئے آئینی ڈھانچے اسلامی حکمرانی کے اصولوں، جیسا کہ شریعت، سے ہم آہنگ نہیں تھے اور ان کا مقصد اسلامی ثقافت کو مغربی معیار پر ڈھالنا تھا۔ سایکس-پیکو معاہدے (Sykes–Picot Agreement) جیسے اقدامات نے مسلم دنیا کو قومیتوں میں تقسیم کر دیا، جس سے امتِ مسلمہ کی وحدت ختم ہو گئی۔ حزب التحریر اس تقسیم کو امت کے زوال کا سبب سمجھتی ہے۔

حزب التحریر اور القاعدہ کے مطابق، جمہوریت اسلامی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ اس میں حاکمیت عوام کے پاس ہوتی ہے، جب کہ اسلام میں حاکمیت اللہ کے پاس ہے۔ حزب التحریر کی کتاب نظام الاِسلام میں جمہوریت کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے۔

یہ تنظیمیں انسانی حقوق کے عالمی تصورات کو بھی تنقید کا نشانہ بناتی ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ یہ اسلامی شریعت سے مطابقت نہیں رکھتے اور مغربی ایجنڈے کا حصہ ہیں۔

حزب التحریر اور القاعدہ دونوں نے اپنے لٹریچر میں مغربی اثرات کے خلاف دلائل پیش کیے ہیں۔ حزب التحریر کی کتاب 'مفاہیم حزب التحریر' میں کہا گیا ہے کہ مغربی طاقتوں نے مسلمانوں کو غلام بنانے کے لیے اپنی تہذیب اور نظام مسلط کیا۔ القاعدہ کے نظریاتی رہنما ایمن الظواہری نے اپنی کتاب فرسان تحت رایۃ النبي (Knights Under the Prophet's Banner) میں نوآبادیاتی نظام کو اسلامی امت کے زوال کا بنیادی سبب قرار دیا ہے۔

حزب التحریر خلافت کے قیام کے لیے پرامن طریقے پر زور دیتی ہے۔ اس کا موقف ہے کہ خلافت کی بحالی کے لیے مسلم عوام اور افواج کو ذہنی طور پر تیار کرنا ضروری ہے۔ ان کے مطابق، موجودہ آئینی ڈھانچے کو اندر سے تبدیل کرنے کے لیے سیاسی اور سماجی تحریک ضروری ہے ان کے لٹریچر میں بار بار اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ یہ نظام امتِ مسلمہ کی وحدت کو ختم کرنے اور اسلامی شریعت کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے تخلیق کیا گیا۔

ان جماعتوں نزدیک جدید دساتیر میں اسلامی شریعت کو مکمل قانونی بنیاد کے طور پر شامل نہیں کیا گیا، بلکہ ان کی جگہ سیکولر یا مخلوط قانونی نظام اپنایا گیا ہے۔ یہ تنظیمیں سمجھتی ہیں کہ شریعت کی عدم شمولیت اسلامی حکمرانی کے اصولوں سے انحراف ہے، اور یہ امت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کو شریعت کے مطابق ڈھالنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ان تنظیموں کے نزدیک اسلامی شریعت ایک کامل اور جامع نظام زندگی ہے جو سیاست، معیشت، عدلیہ، اور سماجی معاملات سمیت ہر شعبے کا احاطہ کرتی ہے۔

حزب التحریر کے لٹریچر میں بارہا ذکر کیا گیا ہے کہ شریعت اللہ کا عطا کردہ نظام ہے، جسے کسی انسانی قوانین یا آئین سے بدلا نہیں جا سکتا۔ کچھ ممالک میں شریعت کو جزوی طور پر شامل کیا گیا ہے، لیکن مکمل طور پر اسے ریاستی قوانین کی بنیاد نہیں بنایا گیا۔ حزب التحریر کے نزدیک یہ طرزِ عمل شریعت کے اصولوں سے کھلا انحراف ہے۔ پاکستان کا آئین اسلامی جمہوریہ کے طور پر شریعت کی بالادستی کا ذکر کرتا ہے، لیکن حزب التحریر اور القاعدہ جیسی تنظیموں کے نزدیک یہ ایک متضاد عمل ہے کیونکہ عملی طور پر سیکولر قوانین غالب ہیں۔ عرب ممالک میں بھی دساتیر میں اسلامی تشخص کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن وہاں شریعت کو صرف مخصوص شعبوں، جیسے خاندانی قوانین، تک محدود رکھا گیا ہے۔ ان تنظیموں کے نزدیک یہ اسلامی حکمرانی کی توہین ہے۔

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مختلف تنظیمیں شریعت کی تشریح میں اختلاف رکھتی ہیں۔ القاعدہ جیسی تنظیمیں شریعت کی سخت گیر تشریح پیش کرتی ہیں، جس میں حدود اور قصاص جیسے قوانین پر زور دیا جاتا ہے۔ جبکہ کچھ جماعتیں، شریعت کے نفاذ کو سیاسی جدوجہد اور معاشرتی اصلاح کے ذریعے ممکن سمجھتی ہیں، نہ کہ طاقت کے ذریعے۔

ان جماعتوں کے نزدیک ان کے نزدیک شریعت ہی ریاستی حکمرانی کا واحد جواز ہے۔ ان تنظیموں کے بیانیے اور لٹریچر میں شریعت کے نفاذ کو امت مسلمہ کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ تاہم، ان کی یہ تشریح مسلم دنیا میں سیاسی اور سماجی انتشار کا باعث بنی ہے اور اسلام کے مختلف نظریاتی مکاتب فکر کے درمیان اختلافات کو مزید گہرا کیا ہے۔

پر تشدد انقلاب

سخت گیر مذہبی تنظیمیں، جیسے القاعدہ، اور داعش، جدید آئینی فریم ورک کو حکمران طبقے کے مفادات کا محافظ سمجھتی ہیں۔ ان کے نزدیک موجودہ آئینی نظام نہ تو اسلامی اصولوں پر مبنی ہے اور نہ ہی عوام کی حقیقی نمائندگی کرتا ہے، بلکہ یہ ایک ایسا ڈھانچہ ہے جو طاقتور طبقے کے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ان تنظیموں کا استدلال یہ ہے کہ پرامن تبدیلی کے امکانات ان نظاموں میں موجود نہیں، اس لیے انقلابی اقدامات اور تشدد کے ذریعے تبدیلی لانا ہی واحد راستہ ہے۔

یہ تنظیمیں پرامن تبدیلی کو ایک ناکام تصور سمجھتی ہیں۔ ان کے نزدیک موجودہ سیاسی جماعتیں نہ تو اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہیں اور نہ ہی عوام کے مسائل حل کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ داعش نے خلافت کے قیام کے لیے طاقت کے استعمال کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ اس کو دینی فریضہ بھی کہا۔ ان کی کتب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ خوف اور طاقت کے ذریعے معاشرے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان تنظیموں کے نزدیک تشدد اور انقلاب اسلامی نظام کے قیام کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہ تنظیمیں اپنے ذاتی فہم پر مبنی قرآن و سنت کے حوالے دے کر اپنے تشدد کو جائز قرار دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک طاقت کے استعمال سے حکمران طبقے کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اسلامی نظام نافذ کیا جا سکتا ہے۔

ان جماعتوں کے برخلاف، زیادہ تر مسلم علماء اور تنظیمیں اس نظریے کو مسترد کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون جیسی تنظیمیں تشدد کے بجائے جمہوری ذرائع سے تبدیلی کی حامی ہیں۔

ان کے مطابق، آئینی فریم ورک میں اسلامی قوانین کو جزوی یا علامتی حیثیت دینا کافی نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ قانون سازی کا ہر پہلو قرآن و سنت پر مبنی ہو۔ اسی لیے افغان طالبان کا موقف بھی یہ رہا ہے کہ افغانستان کا آئین صرف اس وقت قابل قبول ہے جب وہ مکمل طور پر شریعت پر مبنی ہو۔

مسلم دنیا میں عوامی ردعمل

جدید آئین کی تشکیل کی مخالفت کرنے والی سخت گیر مذہبی جماعتوں کو مسلم دنیا کے عوام میں ملی جلی پذیرائی ملی ہے۔ اس پذیرائی کی نوعیت اور حد مختلف معاشروں، سیاسی حالات، اور سماجی طبقات میں

مختلف رہی ہے۔

سخت گیر جماعتوں کو عموماً ایسے افراد یا طبقات کی حمایت ملی جو سماجی و معاشی ناانصافیوں، بدعنوانی، یا ریاستی ناکامیوں سے مایوس ہیں۔ ان کے نظریات کو ان لوگوں نے قبول کیا جنہیں یہ یقین دلایا گیا کہ اسلامی خلافت یا شریعت پر مبنی نظام ان کے مسائل حل کرے گا۔

سخت گیر جماعتوں نے اپنے نظریات کے نفاذ کے لیے عموماً تشدد اور انتہا پسندی کا راستہ اپنایا، جس کی وجہ سے عوام کی ایک بڑی تعداد نے انہیں مسترد کر دیا۔ القاعدہ اور داعش جیسی تنظیموں کی جانب سے بے گناہ لوگوں کو نشانہ بنانا اور دہشت گردی کی کارروائیاں عوام میں ان کی حمایت کم کرنے کا سبب بنیں۔ اس لیے عوام، خاص طور پر وہ طبقہ جو امن و استحکام کا خواہاں تھا، نے ان جماعتوں کو غیر موثر اور غیر عملی سمجھا۔

سخت گیر تنظیموں کی جانب سے اسلامی قوانین کی سخت تشریحات کو مسلم دنیا کے مذہبی علما، نے بھی مسترد کیا۔ یہ جماعتیں شریعت کے نفاذ میں سختی اور تشدد کی حامل تھیں، جسے علما نے اسلامی تعلیمات کے برعکس قرار دیا۔ مصر میں اخوان المسلمین نے نسبتاً معتدل رویہ اپنایا، جس کی وجہ سے انہیں عوامی حمایت ملی، جبکہ القاعدہ جیسے سخت گیر گروہوں کی حمایت کم رہی۔

ایسے ہی، سخت گیر جماعتیں عمومی طور پر عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبوں میں حصہ لینے سے قاصر رہیں۔ وہ اپنی توجہ صرف نظریاتی معاملات پر مرکوز رکھتی ہیں، جبکہ عوام کی روزمرہ ضروریات جیسے صحت، تعلیم، اور روزگار کی فراہمی پر کام نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے ان کی مقبولیت محدود رہی۔ بیشتر مسلم ممالک میں عوام نے جمہوری عمل اور آئینی ڈھانچے کو اپنایا اور اسے اپنی سماجی اور سیاسی ضروریات کے لیے موزوں سمجھا۔ جمہوری حکومتوں نے عوامی رائے کو شامل کرنے اور ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے سخت گیر جماعتوں کی حمایت کم ہوئی۔

میڈیا، تعلیم، اور سول سوسائٹی کی تنظیموں نے سخت گیر نظریات کی مخالفت میں اہم کردار ادا کیا۔ عوام میں اعتدال پسندی اور سماجی ہم آہنگی کے لیے کام کرنے والی تنظیموں نے ان جماعتوں کے بیانیے کو چیلنج کیا۔ اس لیے نوجوان نسل، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ، سخت گیر تنظیموں کے نظریات

سے متاثر نہیں ہوا۔

سخت گیر مذہبی جماعتوں کو مسلم دنیا میں عوام کی طرف سے وسیع پیمانے پر پذیرائی نہیں ملی۔ ان کی محدود حمایت کا انحصار معاشرتی ناانصافیوں، حکومت کی ناکامیوں، اور دیہی علاقوں کے مسائل پر رہا، لیکن ان کی شدت پسند حکمت عملی، تشدد کے استعمال، اور عوامی فلاح و بہبود کے امور کو نظرانداز کرنے نے انہیں بڑے پیمانے پر عوامی حمایت حاصل کرنے سے محروم رکھا۔ اس کے برعکس، جمہوری اور آئینی ڈھانچے کی مقبولیت نے ان جماعتوں کے نظریات کو محدود کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

افغان جہاد اور اسلامی دستور*

1979 سے 1992 تک جاری رہنے والے افغان جہاد نے، جو سوویت یونین کی جارحیت اور اس کے قائم کردہ حکومت کے خلاف شروع ہوا تھا، افغانستان میں ایک اسلامی معاشرے کے قیام کے تصور کو تقویت دی۔ اس دوران عام مسلمان یا تو روایتی علماء سے رہنمائی لیتے رہے یا جدید فکر کے حامل نظریات کے پیروکار بنے، لیکن زیادہ تر افراد حکومتوں پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ حکومتیں "جدیدیت" کے نام پر اوپر سے مسلط کی گئی ایسی پالیسیاں نافذ کر رہی تھیں جو نہ صرف اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ نہیں تھیں بلکہ عوام کے مذہبی جذبات کا بھی خیال نہیں رکھتی تھیں۔

1970 کی دہائی میں کئی سیاسی انقلابات نے افغان بادشاہت کا خاتمہ کیا اور قوم پرست آمرانہ حکومتوں کے قیام کی راہ ہموار کی۔ ان حکومتوں نے سماجی اور معاشی اصلاحات کے نام پر سخت گیر پالیسیاں نافذ کیں، جس کے خلاف عوامی مزاحمت بڑھتی گئی۔ بالآخر افغان کمیونسٹ پارٹی کی حکومت نے اس بڑھتی ہوئی مزاحمت کو کچلنے کے لیے سوویت یونین کو ملک میں مداخلت کی دعوت دی۔

سوویت جارحیت اور کمیونسٹ حکومت کی پالیسیوں کے خلاف مزاحمت میں اسلامی نظریات رکھنے والے گروہ پیش پیش تھے۔ سنی اور شیعہ اسلام پسند جماعتوں نے عسکری تنظیمیں تشکیل دیں اور سوویت حمایت یافتہ حکومت کے خلاف ایک اتحاد قائم کیا۔ لیکن جب یہ اتحاد سوویت افواج کو پسپا کرنے اور افغان حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا تو اندرونی اختلافات نے اسے تقسیم کر دیا۔

یہ اختلافات اس بات پر تھے کہ ایک اسلامی ریاست کیسی ہونی چاہیے، اس کا نظامِ حکومت کیا ہو اور

---

* یہ مضمون افغان نژاد مفکر شمشاد پسارلے کی کتاب The Constitutional Imagination of the Mujahidin: A History and Translation of T anslation of Two Constitutions Proposed b opposed by Afghan Islamist ghan Islamist Militias in the 1990s. کے ایک باب کا خلاصہ ہے۔
شمشاد پسارلے شکاگو یونیورسٹی امریکا میں مدرس ہیں۔

معاشرے پر کون سے قوانین نافذ کیے جائیں۔ انہی بحث و مباحثوں کے نتیجے میں مختلف اسلامی آئینی خاکے تیار کیے گئے، جن میں ہر خاکہ ایک الگ تصور کی نمائندگی کرتا تھا۔ برہان الدین ربانی کی جماعت اسلامی نے 1993 میں مجاہدین حکومت کے لیے ایک آئینی مسودہ پیش کیا، لیکن دیگر جماعتوں نے اس پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے متبادل آئین تیار کرنے کی کوشش کی۔

شیعہ جماعت حزب وحدت نے اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے ایک ایسا آئینی خاکہ تجویز کیا جو کثیر المذاہب اور جامع وفاقی اسلامی ریاست کا تصور پیش کرتا تھا، تاکہ تمام گروہوں کو ایک متوازن کردار دیا جاسکے۔ اسی دوران حرکتِ اسلامی نامی تنظیم نے 1980 کی دہائی میں اپنا آئینی مسودہ تیار کیا تھا اور امید کی جارہی تھی کہ اسے مجاہدین کی حکومت کے آئین میں شامل کیا جائے گا۔ ان تمام کوششوں نے واضح کیا کہ افغان جہاد کے بعد کے سیاسی منظرنامے میں اتحاد قائم رکھنا کتنا مشکل اور پیچیدہ کام تھا۔

سنی سیاسی جماعتوں کی تشکیل اور آئین کی تیاری

1970 کی دہائی میں اسلام پسند حلقے سیاست سے زیادہ تر دور رہے، لیکن اس دوران وہ اس بات پر تشویش میں مبتلا تھے کہ ان کے مخالف، کمیونسٹ، کس حد تک ریاستی اداروں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے۔ 1973 تک افغان کمیونسٹ پارٹی (PDPA) اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اس نے محمد داؤد خان کے ساتھ مل کر ایک انقلاب کے ذریعے بادشاہت کا خاتمہ کیا۔ داؤد خان ایک سیکولر نظریات رکھنے والے شخص تھے جنہیں کمیونسٹوں کی حمایت حاصل تھی اور وہ اسلام پسندوں کے سخت مخالف تھے۔

داؤد کی حکومت (1973-1978) کے دوران کمیونسٹوں کو اہم حکومتی عہدوں پر فائز کیا گیا اور اسلام پسند تحریک کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی گئی۔ اس دوران کئی اہم اسلام پسند رہنما، جیسے برہان الدین ربانی، گلبدین حکمت یار، عبدالرب رسول سیاف، اور صبغت اللہ مجددی، پاکستان کے شہر پشاور ہجرت کر گئے۔ وہاں انہیں پاکستانی حلقوں کی جانب سے بھرپور حمایت ملی، جنہوں نے انہیں بنیادی عسکری تربیت، مالی معاونت، اور ہتھیار فراہم کیے۔ پاکستان نے ان رہنماؤں کو افغان حکومت کے

خلاف منظم مزاحمت شروع کرنے کی دعوت دی۔

ان جلاوطن اسلام پسندوں میں سے کچھ اس منصوبے کو فوراً شروع کرنے کے حامی تھے، جبکہ کچھ نے احتیاط برتنے کا راستہ چنا۔ ان اختلافات کی وجہ سے گلبدین حکمت یار نے برہان الدین ربانی سے علیحدگی اختیار کر کے ایک شدت پسند تنظیم، حزب اسلامی افغانستان، کی قیادت سنبھالی اور فوری طور پر عسکری کارروائیاں شروع کر دیں۔ دوسری طرف ربانی نے کئی سینئر اسلام پسند رہنماؤں کو اپنے ساتھ رکھا اور ایک بڑی جماعت، جمعیت اسلامی، کی قیادت جاری رکھی، جس نے حکمت عملی کے تحت انتظار کی پالیسی اپنائی۔

جب پاکستان میں سنی اسلام پسند اپنی تنظیم سازی میں مصروف تھے، افغان کمیونسٹوں نے حکومت میں اپنا کنٹرول مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ 1973 کے انقلاب میں داؤد خان کا ساتھ دینے کے بعد افغان کمیونسٹ پارٹ (PDPA) پردے کے پیچھے رہنے پر اکتفا نہیں کر رہی تھی۔ 1978 میں، انہوں نے ایک خونریز انقلاب کے ذریعے داؤد خان کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ لیکن کمیونسٹ حکومت اس بات کا ادراک نہ کر سکی کہ اسے نہ تو عوامی حمایت حاصل ہے، نہ ہی انتظامی صلاحیت، اور نہ ہی قانونی جواز اس کے پاس ہے۔

افغان کمیونسٹ پارٹ (PDPA) نے ایک غیر دانشمندانہ مارکسسٹ لیننسٹ سماجی اور سیاسی پروگرام نافذ کرنے کی کوشش کی، جو اقتصادی اور سماجی اصلاحات پر مبنی تھا۔ یہ پروگرام افغان عوام کے لیے ناقابلِ فہم اور ان کی اکثریت کے لیے ناقابلِ قبول ثابت ہوا۔ 1979 میں جب دیہی علاقوں میں بغاوتیں شروع ہوئیں تو سوویت یونین نے افغان کمیونسٹ پارٹ (PDPA) حکومت کو بچانے کے لیے افغانستان پر حملہ کر دیا۔

سوویت حملے کے بعد اسلام پسند جماعتوں کی تشکیل

سوویت یونین کے حملے کے نتیجے میں امریکہ، سعودی عرب اور پاکستان سمیت کئی ممالک نے افغان اسلام پسندوں کو بھاری مالی امداد اور ہتھیار فراہم کیے۔ ان اسلام پسندوں نے کابل کی حکومت اور اس کے سوویت حمایتیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ جیسے ہی ان کی عسکری کامیابیاں بڑھنے لگیں، سنی

اسلام پسند تحریک مختلف دھڑوں میں تقسیم ہو گئی، جو اجتماعی طور پر سنی مجاہدین کہلانے لگے۔ ان جماعتوں میں یہ گروہ شامل تھے:

- جمعیت اسلامی، جس کی قیادت برہان الدین ربانی نے کی۔
- حزب اسلامی، گلبدین حکمت یار کی سربراہی میں۔
- اتحاد اسلامی، عبدالرب رسول سیاف کی قیادت میں قائم ہوئی۔
- حرکت انقلاب اسلامی، محمد نبی محمدی کی قیادت میں۔
- محاذ ملی اسلامی، سید احمد گیلانی کی سربراہی میں۔
- جبھہ نجات ملی اسلامی، صبغت اللہ مجددی کی قیادت میں۔

ان جماعتوں کو ایک طرف تو کمیونسٹ حکومت اور سوویت افواج کی مخالفت نے متحد رکھا، اور دوسری طرف ایک اسلامی ریاست کے قیام کی خواہش نے۔ لیکن ان کے درمیان مستقبل کے افغانستان کی شکل وصورت پر کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔

1989 میں جب سوویت افواج افغانستان سے نکل گئیں اور کمیونسٹ حکومت کے خاتمے کا امکان ظاہر ہونے لگا، تو ان جماعتوں کے رہنماؤں کے درمیان اقتدار کے حصول کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ ہر رہنما اپنے مطلوبہ نظریات کے مطابق اگلی ریاست کی تشکیل کا خواہاں تھا۔

سنی مجاہدین نہ صرف آپس میں بلکہ شیعہ ملیشیا کے اتحادیوں کے ساتھ بھی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے کابل میں موجود کمیونسٹ حکومت کچھ عرصے تک خود کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ بالآخر، 1992 میں، سنی مجاہدین رہنماؤں نے کابل پر قبضہ کر لیا اور ایک عبوری حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔

ابتدائی معاہدے کے مطابق، عبوری حکومت کی سربراہی دو ماہ کے لیے صبغت اللہ مجددی اور چار ماہ کے لیے برہان الدین ربانی کو سونپی گئی۔ اس دوران، اصل طاقت ایک 50 رکنی شوریٰ (شورائے رہبری) کے پاس تھی، جس میں تمام مجاہدین جماعتوں کے نمائندے شامل تھے۔ اس شوریٰ کا ایک اہم کام مستقل حکومت کے لیے منصوبے تیار کرنا تھا۔

مجاہدین جماعتوں کی حکومت، اندرونی کشیدگی، اور آئین سازی کا عمل

مجاہدین جماعتیں حکومت چلانے میں نہایت ناکام ثابت ہوئیں۔ جب ربانی کی بطور سربراہ چار ماہ کی مدت ختم ہوئی، تو مجاہدین جماعتیں مستقل حکومت کے ڈھانچے پر متفق نہ ہو سکیں۔ لیکن ربانی نے بھی اقتدار سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ یہ فیصلہ اتحاد میں شامل دیگر جماعتوں کے رہنماؤں کے لیے ناقابل قبول تھا اور بالآخر ایک خونی خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اس لڑائی میں ہزاروں شہری جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

مارچ 1993 میں بڑی سنی مجاہدین جماعتوں نے ایک نئے معاہدے پر اتفاق کیا، جس کے تحت ربانی کی بطور صدر مدت میں توسیع کی گئی لیکن گلبدین حکمت یار کو وزیر اعظم کے طور پر اضافی اختیارات دیے گئے۔ اس مشترکہ حکومت کے تحت، مجاہدین جماعتوں کو آٹھ ماہ کا وقت دیا گیا کہ وہ تمام دھڑوں کے لیے قابل قبول آئین تیار کریں۔

یہ معاہدہ کابل میں نسبتاً امن کا باعث بنا، لیکن ربانی کے مخالفین، خاص طور پر حکمت یار، ان پر اور ان کی جماعت جمعیت پر کبھی اعتماد نہ کر سکے۔ حکمت یار نے بطور وزیر اعظم کابل جانے سے انکار کر دیا اور اپنی حلیف سنی جماعتوں کے ساتھ اپنے مضبوط گڑھ میں کابینہ تشکیل دی اور اجلاس منعقد کیے۔ یوں ایک متوازی حکومت کا نظام وجود میں آیا، جو ربانی کی جگہ لینے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

1993 کے وسط میں، ربانی کی جمعیت اور حکمت یار کی حزب اسلامی (اور اس کے حلیفوں) کے درمیان کشیدگی کھلی جنگ میں بدل گئی، جو پہلے کابل میں شروع ہوئی اور پھر ملک کے دیگر حصوں تک پھیل گئی۔

اس کشیدہ ماحول میں ربانی نے دیگر مجاہدین جماعتوں کے ساتھ مل کر جامع آئین سازی کا کمیشن قائم کرنے کی ذمہ داری ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے، انہوں نے 44 اراکین پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دیا، جس میں نہ تو حزب اسلامی کے نمائندے شامل تھے اور نہ ہی طاقتور شیعہ دھڑوں کے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسا آئینی مسودہ تیار ہوا، جس میں صدر کو مضبوط اور وزیر اعظم کو نسبتاً

کمزور اختیار دیا گیا۔

آئین کا تنازع، اقتدار کی کشمکش، اور طالبان کا ظہور

حکمت یار نے توقع کے مطابق آئینی کمیشن کے مسودے کو مسترد کر دیا، ان کا موقف تھا کہ اس آئین کے تحت صدر کی جماعت، یعنی جمعیت، تمام حکومتی فیصلوں پر حاوی ہو جائے گی۔ حکمت یار نے تجویز دی کہ وزیر اعظم کے اختیارات کو بڑھایا جائے، لیکن جمعیت نے ان ترامیم کو رد کر دیا۔ ان کا مؤقف تھا کہ مجوزہ نیم صدارتی نظام کے تحت وزیر اعظم کی جماعت (جو اس وقت حزب اسلامی تھی) حکومت پر غالب آجائے گی۔

چھوٹی مجاہدین جماعتوں، بشمول چند شیعہ جماعتوں، نے تجویز دی کہ انتظامی اختیارات نہ صدر کے پاس ہوں اور نہ وزیر اعظم کے، بلکہ یہ اختیارات تمام بڑی مجاہدین جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک گورننگ کونسل کو دیے جائیں۔ تاہم، نہ ربانی کی جمعیت اور نہ حکمت یار کی حزب اسلامی اس حل کو اپنانے پر تیار ہوئیں۔ دونوں جماعتیں اس طاقت کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں جو وہ صدارتی یا نیم صدارتی نظام میں حاصل کر سکتی تھیں۔ مزید یہ کہ ان دونوں سنی جماعتوں نے شیعہ دھڑوں کو حکومت میں کوئی نمایاں کردار دینے سے بھی گریز کیا۔

آئین کے مسودے پر اتفاق نہ ہونے کے باعث جمعیت کی قیادت میں قائم اتحاد، حزب اسلامی کے اتحاد، اور شیعہ جماعتوں کے درمیان تنازعات شدت اختیار کر گئے، اور ہر جماعت اپنے اپنے مضبوط گڑھ میں واپس جا کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ میں مصروف ہو گئی۔ 1995 تک افغانستان مکمل طور پر انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔

اسی دوران ایک نئی اسلامی تحریک، طالبان، منظر عام پر آئی۔ یہ تحریک ان طلبہ پر مشتمل تھی جو دیہی علاقوں کے مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ طالبان مجاہدین جماعتوں کے خود غرض رویے سے سخت نالاں تھے۔ طالبان نے اتنی عسکری تربیت حاصل کر لی کہ وہ تیزی سے ملک کے بیشتر حصوں پر قابض ہو گئے۔

شیعہ اسلامی آئین

1970 کی دہائی کے اواخر میں، جب پاکستان میں موجود سنی مجاہدین جماعتیں کابل کی کمیونسٹ حکومت کے خلاف اپنی مسلح مزاحمت تیار کر رہی تھیں، تو ہزارہ جات کے علاقے میں شیعہ بھی کمیونسٹ حکومت کے خلاف اپنی مزاحمت کو منظم کر رہے تھے۔ 1979 کے موسم خزاں میں، کمیونسٹ انقلاب کے ایک سال سے بھی کم عرصے بعد، شیعہ رہنماؤں نے ایک سیاسی تنظیم قائم کی جس کا مقصد ہزارہ جات کو خود مختار علاقہ بنانا تھا۔

اس مقصد کے تحت افغانستان کی شیعہ قیادت نے شوریٰ اتحاد اسلامی افغانستان کے نام سے ایک تنظیم تشکیل دی۔ اس شوریٰ نے حکومت کے تمام عہدیداروں اور فورسز کو ہزارہ جات سے نکال باہر کیا اور اس کے بدلے ایک "چھوٹی ریاست" قائم کی۔ یہ ریاست اپنے شہریوں کو تعلیم، مواصلات، اور صحت کی سہولیات فراہم کرتی تھی؛ ٹیکس عائد کرتی؛ شناختی کارڈ تقسیم کرتی؛ اور فوجی خدمات کو لازمی قرار دیتی۔

افغان حکومت کی واضح طور پر سوویت یونین کے ساتھ شراکت داری اور معاشی و سماجی اصلاحات سے خائف ہو کر، متعدد شیعہ علما نے شوریٰ کی حمایت کی۔ ان علما میں معروف شیعہ رہنما سید علی بہشتی بھی شامل تھے، جو عراق کے ایک شیعہ مدرسے میں تعلیم حاصل کر چکے تھے اور شوریٰ کے سربراہ کے طور پر مقرر کیے گئے۔

بہشتی کا شوریٰ میں قیادت قبول کرنے کا فیصلہ ایک حیرت انگیز امر تھا۔ شیعہ "خوئی نظریے" کے مطابق، عام حالات میں علما کو عوامی سیاسی سرگرمیوں سے اجتناب کرنا چاہیے اور خود کو اسلامی تعلیم و تبلیغ تک محدود رکھنا چاہیے۔ بہشتی اور ان جیسے دیگر طلبہ کا خیال تھا کہ علما کو مسلم عوام کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ اگر ریاست غیر منظم شیعہ قوانین کو بعض معاملات میں نافذ کرنے کا فیصلہ کرے، تو علما جج یا مشیر کے طور پر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ریاست کسی مجوزہ قانون کو شیعہ اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنا چاہے، تو علما سے رائے لے سکتی ہے۔

تاہم، ان معاملات میں جہاں خدا کی مرضی کے تعین پر اختلاف ہو سکتا ہے، "خوئی نظریے" کے

مطابق ان فیصلوں اور قوانین کے تعین کا اختیار سیکولر قیادت کو ہونا چاہیے۔

بہشتی کا سیاسی کردار اور خمینی فکر کے ساتھ تنازع

سید علی بہشتی، ایک "خوئی نظریے" کے پیروکار ہونے کے ناطے، صرف غیر معمولی حالات کی بنا پر تدریس اور مشاورت کے کردار سے سیاست میں قدم رکھنے پر آمادہ ہوئے۔ ان کے نزدیک، کمیونسٹ انقلاب اور سوویت افواج کی مسلم علاقوں پر یلغار نے ایک غیر معمولی خطرناک سماجی و سیاسی بحران کو جنم دیا تھا، جو شیعہ معاشرے کے لیے انتہائی مہلک تھا۔ ایسے حالات میں علما کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے سیاسی کردار سے اجتناب کے اصول کو وقتی طور پر ترک کریں اور معاشرے کے دفاع کے لیے وہ سب کچھ کریں جو ان کے بس میں ہو، چاہے اس کا مطلب سیاسی قیادت کا منصب قبول کرنا ہی کیوں نہ ہو۔

بہشتی کی قیادت میں، شوریٰ کے رہنماؤں نے اپنی تمام تر توجہ ہزارہ جات کے آزاد شدہ علاقوں کے دفاع اور کنٹرول کو یقینی بنانے پر مرکوز کی، تاکہ ملک میں ایک "اسلامی جمہوریہ" کے قیام کا خواب پورا ہو سکے۔ اس دوران بہشتی اور دیگر خوئی نظریے کے علما نے یہ موقف اپنایا کہ یہ صرف ایک ہنگامی اقدام ہے۔ جیسے ہی حالات معمول پر آئیں گے، علما سیاست سے الگ ہو کر اپنی روایتی ذمہ داریوں کی طرف لوٹ جائیں گے۔

تاہم، وقت کے ساتھ شوریٰ کی محتاط پالیسی اور محدود سیاسی عزائم نے خمینی فکر کے ماننے والے انقلابی علما کو مایوس کیا۔ خمینی کے حامی علما کا اصرار تھا کہ شیعہ فقہا کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ فعال طور پر ایک اسلامی ریاست قائم کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ تمام شہری خدا کے قانون کے تحت زندگی بسر کریں۔

اس اختلاف نے شیعہ معاشرے میں اندرونی تنازع کو جنم دیا۔ 1980 کی دہائی کے آغاز میں، جب اسلامی جمہوریہ ایران نے اپنی "اسلامی انقلاب" کی فکر کو دیگر شیعہ علاقوں تک پھیلانا شروع کیا، تو ہزارہ جات میں خمینی کے حامیوں نے اپنی پوزیشن مضبوط کر لی۔ انہوں نے شوریٰ کو چیلنج کرنے کے لیے متعدد اہم سیاسی تنظیمیں قائم کیں۔ ایران میں مقیم افغان شیعہ یا وہ طلبہ جو وہاں تعلیم کے لیے

گئے تھے، بڑی تعداد میں ہزارہ جات میں واپس آنے لگے۔

1980 کی دہائی کے وسط تک، خمینی کے حامی اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ انہوں نے شوریٰ کو بے دخل کر دیا اور شیعہ داخلی سیاست پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس طرح، ہزارہ جات میں خمینی نظریے کا غلبہ ہوا، جو شوریٰ کے ابتدائی نظریے سے واضح انحراف تھا۔

حرکت اسلامی: خوئی فکر کی بازیابی اور خمینی اثر کے خلاف جدوجہد

شوریٰ کے زوال کے باوجود، افغانستان میں خوئی نظریے کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا۔ 1980 کی دہائی کے اوائل میں، شیعہ سیاسی جماعتوں میں سے ایک نمایاں جماعت "حزب حرکت اسلامی" تھی، جو 1979 میں ایران کے شہر قم میں شیخ آصف محسنی کی قیادت میں تشکیل دی گئی۔ محسنی بھی خوئی کے شاگرد تھے اور ان کے خیالات کو حرکت کے اندر فروغ دینے میں پیش پیش رہے۔ جماعت کے بنیادی چارٹر میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس کا اولین مقصد "قرآن، سنت، حکمت، اور فکری اصولوں پر مبنی ایک منصفانہ اسلامی جمہوریہ کا قیام" ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، افغانستان کے مسلمانوں کو کمیونسٹ حکومت اور غیر ملکی جارحیت سے آزاد کرانا بھی اس کے اہداف میں شامل تھا۔

تاہم، خوئی نظریے کے ماننے والوں کے لیے "اسلام کی بحالی" کا مطلب خمینی نظریے سے بالکل مختلف تھا۔ شوریٰ کی طرح، حرکت اسلامی کے چارٹر میں بھی اس بات کا اشارہ موجود تھا کہ قبضہ شدہ علاقوں کو ایک اسلامی جمہوریہ کے قیام کے بعد منتخب سیاسی قیادت کے حوالے کر دینا چاہیے، اور علما کو اپنے روایتی کاموں یعنی تعلیم و تبلیغ تک محدود رہنا چاہیے۔

خمینی کی حامی جماعتوں کے مسلسل دباؤ کے باعث، محسنی کی حرکت اسلامی نے پاکستان کا رخ کیا اور اپنا مرکز کوئٹہ میں قائم کیا۔ یہاں سے محسنی نے پاکستان اور پشاور میں مقیم سنی مجاہدین کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کیا۔ اس نئی قربت اور اتحاد نے حرکت کو افغان شیعہ سیاست میں ایران نواز اسلام پسندوں کی کامیابی کے باوجود متحرک رہنے کا موقع فراہم کیا۔

حزب حرکت اسلامی ایک قومی شیعہ جماعت تھی جو ایک کثیر المسلکی اور وحدانی اسلامی ریاست کا تصور پیش کر رہی تھی، جس میں سنی اور شیعہ علما کا کردار صرف ایک مشاورتی کونسل کے ذریعے نگرانی تک

محدود تھا۔ یہ کونسل ان مسائل کی نشاندہی کرتی جہاں تمام مسالک میں اسلامی قانون کے حوالے سے اتفاق رائے موجود ہو۔ ہر مسلک کے علما کونسل میں ان امور کو واضح کرتے جو ان کے فقہی نظریے کے مطابق واجب العمل ہوں۔ جہاں قانونی معاملات پر اختلاف موجود ہو، وہاں حرکت کے آئین نے سیاستدانوں کو، جو عموماً فقہی تربیت سے محروم ہوتے، یہ اختیار دیا کہ وہ عوامی مفاد میں بہترین قانون سازی کریں۔

مختصر یہ کہ حرکت اسلامی کا آئین ایران کے خمینی ماڈل کا ایک خوئی نظریئے پر مبنی متبادل پیش کرتا تھا۔ خمینی کے برعکس، یہ ماڈل علما کو صرف مشاورتی اور نگرانی کے کردار تک محدود رکھتا تھا، نہ کہ انہیں ایک سپریم لیڈر کے طور پر تمام ریاستی اختیارات کا حامل بناتا، جو یکطرفہ طور پر اسلامی قانون کے غیر طے شدہ معاملات میں فیصلہ کن کردار ادا کرے۔

افغان مجاہدین کے آئین کا مقدمہ

تحریکِ اسلامی افغانستان کی علمی کونسل کی ایک کمیٹی نے افغانستان کے لیے 1990 میں ایک آئینی مسودہ تیار کیا تھا۔ اس آئین کے مقدمے سے چند اہم نکات قارئین کی توجہ کے مستحق ہیں:

ا۔ جعفری مکتب فکر کی آئینی حیثیت

اس مسودے میں جعفری مکتب فکر کو تسلیم کیا گیا ہے، جو شاید کچھ سنی بھائیوں کے لیے حیرت یا اعتراض کا باعث بنے۔ لیکن ہمیں جذبات کے بجائے حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ افغانستان میں لاکھوں لوگ جعفری مکتب فکر سے وابستہ ہیں۔ اگر ان کی شناخت اور حقوق کو آئین میں شامل نہ کیا گیا تو ان کے لیے یہ آئین بے معنی ہوگا۔

افغانستان کے ماضی کے تناظر میں جعفری برادری کو کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ یہ رویہ جعفری مسلمانوں کے حقوق کی سنگین خلاف ورزی تھا۔ چونکہ جعفری برادری اپنے مذہبی رسومات کے مطابق زندگی گزارتی ہے، اس لیے ان کے حقوق کو تسلیم کرنا آئینی انصاف کا تقاضا ہے۔

۲۔اسلامی اصولوں کی بالادستی

مسودے میں اسلامی اصولوں کو ریاست کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، جو افغانستان کی زمینی حقیقت اور عوام کی اکثریتی رائے کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلام ہمارے قومی اتحاد کا مرکز ہے اور ایک ایسی طاقت ہے جو ملک کے مختلف طبقوں کو یکجا رکھ سکتی ہے۔

۳۔آزادی کا فروغ

آزادی کو مسودے میں ایک بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ نہ صرف ہر انسان کا فطری حق ہے بلکہ افغانستان میں آمریت کو روکنے اور ایک متوازن سیاسی نظام قائم کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ آزادی ہماری قوم کی ترقی اور خود مختاری کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔

۴۔سیاسی جماعتوں کی تعداد محدود نہ کرنا

اس مسودے میں افغانستان میں سیاسی جماعتوں کی تعداد کو محدود نہیں کیا گیا، لیکن ملک کے ماضی کے تجربات (خصوصاً 1973 کے انقلاب کے بعد) یہ ظاہر کرتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کی بڑی تعداد نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے اگر صرف تین جماعتوں کو کام کرنے کا حق دیا جائے تو یہ بہتر ہوگا۔ ان میں سے دو جماعتیں سنی اور ایک شیعہ سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔

۵۔صدر اور قومی اسمبلی کے ارکان کے لیے استثنیٰ ختم

اس مسودے میں صدر اور قومی اسمبلی کے ارکان کو قانونی استثنیٰ فراہم نہیں کیا گیا ہے۔ اسلامی عدل کے اصولوں کے مطابق کسی بھی ریاستی عہدیدار کو ایسا استثنیٰ دینا غلط ہے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہونے چاہییں۔ کسی کے عمل یا بات کا اگر قانون سے تضاد ہو تو اس پر وہی اصول لاگو ہونے چاہییں جو عوام پر لاگو ہوتے ہیں۔ عوام اور ان کے نمائندوں کے درمیان فرق یا امتیاز کرنا اسلامی اور اخلاقی اصولوں کے خلاف ہے۔

۶۔ مجلس تدوین کے قیام کی تجویز

اس مسودے میں ایک "مجلس تدوین" کے قیام کی تجویز دی گئی ہے، جو اسلامی فقہ کے اصولوں کی

تشریح اور قانون سازی میں معاون ہو گی۔ بظاہر یہ تجویز نئی اور حیرت انگیز معلوم ہو سکتی ہے، لیکن اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ عوام اپنے نمائندوں کو علم، تجربے اور تقویٰ کی بنیاد پر منتخب نہیں کرتے، بلکہ سماجی تعلقات اور نسلی بنیادوں پر انتخاب ہوتا ہے۔ ان حالات میں زیادہ تر نمائندے مطلوبہ مذہبی علم اور اہلیت سے محروم ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمارے ملک کی اکثریت ناخواندہ ہے، اس مسئلے کا فوری حل ممکن نہیں۔ اس لیے اسلامی قانون کے معاملات کو سلجھانے اور قانون سازی میں مدد کے لیے مجلس تدوین ناگزیر ہے۔

۷۔ صدر کی مدت کی تحدید

مسودے میں صدر کے لیے ایک مدت کی حد مقرر کی گئی ہے تاکہ صدر جمہوری نظام پر غیر قانونی طور پہ اثر انداز نہ ہو سکے اور جمہوریت کو نقصان نہ پہنچائے۔

۸۔ صدر اور وزیر اعظم کا انتخاب

مسودے میں لکھا گیا ہے کہ صدر عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو گا جبکہ وزیر اعظم قومی اسمبلی کے ووٹ سے۔ یہ ایک بہتر تجویز ہے، لیکن ہم اس پر اصرار نہیں کرتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں عہدے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا دونوں قومی اسمبلی کے ووٹ سے منتخب کیے جائیں۔

۹۔ وزراء کے تقرر اور برطرفی کے اختیار کا خاتمہ

اس مسودے میں صدر کو وزیر اعظم اور دیگر وزراء کے تقرر یا برطرفی کا اختیار نہیں دیا گیا۔ یہ انتظامی اختیارات کو تقسیم کرنے اور کرپشن و آمریت کے خطرے کو کم کرنے کی کوشش ہے۔ تمام اختیارات ایک فرد کو دینا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ صدر کے اختیارات میں کمی

مسودے میں صدر کے بعض اختیارات "مجلس تدوین" کو دیے گئے ہیں۔ اس کا مقصد شریعت کے اصولوں کی پاسداری کو یقینی بنانا ہے، کیونکہ صدر ممکنہ طور پر اسلامی شریعت کے علم سے محروم ہو سکتا ہے۔

یہ تجاویز افغانستان کے آئندہ آئینی ڈھانچے کو مزید منصفانہ اور مستحکم بنانے کی کوشش ہیں، جو اسلامی اصولوں اور عوامی مفادات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

۱۱۔ غیر ملکی مداخلت سے گریز پر زور

اس مسودے میں غیر ملکی مداخلت سے اجتناب پر زور دیا گیا ہے کیونکہ ایسی مداخلت ہمیشہ تقسیم، اختلاف اور عدم استحکام کا سبب بنتی ہے۔ افغانستان کی سالمیت اور اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملکی معاملات میں بیرونی طاقتوں کی مداخلت نہ ہو۔

۱۲۔ آئینی مسودے کو سمجھنے کی دعوت

ہم قارئین کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ "افغانستان میں اسلامی طرز حکومت کی تصویر" نامی کتاب کا مطالعہ کریں۔ یہ کتاب اس آئینی مسودے کو بہتر طور پر سمجھنے میں مددگار ہو گی۔

اختتامی بات

ہم ماہرین اور عوام کی رائے کو سننے کے لیے تیار ہیں۔ ہم خوشی محسوس کریں گے اگر اس مسودے کے حوالے سے سوالات کیے جائیں۔ عوام کی تجاویز اور سفارشات ہمارے لیے بہت اہم ہیں، اور ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں تاکہ اس مسودے کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔

ریاستِ پاکستان کی شرعی حیثیت:
تحریکِ طالبان پاکستان کا موقف

شمس الدین حسن شگری

ریاست پاکستان کی شرعی حیثیت: تحریک طالبان پاکستان کا موقف

تحریک طالبان کے تصور دین کے مطابق پاکستان اسلامی مملکت نہیں ہے۔ اسی لیے پیغام کے جواب میں لکھی گئی اس کتاب میں اس موضوع پر بھی بہت زیادہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ پیغام پاکستان میں، پاکستان کے اسلامی مملکت ہونے کے حوالے سے جو دلائل اور شواہد پیش کیے تھے فاضل مصنف نے ایک ایک کر کے ان کو رد کیا ہے۔ قیام پاکستان کے پس منظر، قیام پاکستان کے مقصد، قرارداد مقاصد، آئین پاکستان اور اس میں موجود اسلامی شقیں، شرعی عدالت، نظریاتی کونسل، ادارہ تحقیقات اسلامی پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان ایک غیر اسلامی ریاست ہے۔ اختصار کے پیش نظر ایک دو حوالے ملاحظہ فرمائیں۔

قرارداد مقاصد اور آئین پاکستان کے اسلامی ہونے کی دلیل پر کافی طویل تنقید کے بعد لکھتے ہیں۔

> ''پاکستان کے اسلامی ہونے سے انکار اور یہ دعوی کہ ملک پاکستان میں طاغوتی نظام نافذ ہے اس وجہ سے رد نہیں ہو سکتا کہ قرارداد مقاصد میں حاکمیت اعلیٰ کا ثبوت اللہ تعالی کے لیے قرار دیا گیا ہے۔۔۔ خلاصے سمیت تفصیل ایک بار پھر دیکھ کر خود فیصلہ کریں کہ ایسے آئین کو کس طرح اسلامی مانا جائے؟ اور اس کی وجہ سے ملک کس طرح اسلامی بنے گا؟''۔[1]

ٹی ٹی پی کو آئین پر جو اعتراضات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آئین میں ان شقوں کو اسلامی احکام کی وجہ سے شامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ طاغوتی نظام جمہوریت کی رو سے پارلیمنٹ کی منظوری کی وجہ سے شامل کیا گیا ہے۔ اب اس پر کیا عرض کریں۔ یہ ایک ایسی عجیب وغریب منطق ہے جسے رد کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ پیغام پاکستان میں، اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک رپورٹ کا حوالہ دے کر یہ دعوی کیا گیا تھا کہ پاکستان میں ۹۵ فیصد قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہیں۔ فاضل مصنف نے اس دعوی کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور پھر کہا ہے کہ اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو باقی ۵ فیصد کی وجہ سے بھی یہ ایک غیر اسلامی آئین ہے۔ اس پانچ فیصد والی بات کو بہت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ پھر موصوف کا کہنا ہے کہ ان قوانین پر عمل بھی تو نہیں ہوا۔ حدود کا نفاذ آج تک نہیں ہوا تو یہ کیسا اسلامی آئین ہے۔ ص ۴۵ نیز صفحات ۶، ۵۵، ۸۷، ۸۸،

ٹی ٹی پی کو نفس آئین پر بھی اعتراض ہے ان کے خیال میں آئین وغیرہ سیکولرازم کی دین ہے، اسلام میں قرآن، حدیث اور فقہ کی صورت میں مکمل آئین موجود ہے، اس لیے آئین وغیرہ کے نام پر جو کچھ ہے وہ فی نفسہ غیر اسلامی عمل ہے۔ محترم عبد الرحمن حماد صاحب ''مجلہ تحریک طالبان پاکستان میں آئین پاکستان اسلامی یا غیر اسلامی کے عنوان سے قسطوں میں مضمون لکھ رہے ہیں۔ قسط نمبر ۴ میں لکھتے ہیں۔

> ''مگر جب سے دنیا پر سیکولرازم کا غلبہ ہوا ہے اور دین کو حکومت سے الگ کرنے کی مذموم منصوبہ روبہ عمل ہے، تو کفار کی طرف سے عالم اسلام پر مسلط کردہ حکمرانوں نے آئین اور قانون جیسے بہانوں پر اسلامی شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے، آئین میں چند ایسی مبہم اسلامی دفعات لا کر مسلمانوں کو خوش کیا کیا ہے جن کا عمل کی دنیا میں کوئی کردار وحیثیت نہیں، مگر ان مبہم دفعات کی وجہ سے آج بہت سے علماء آئین کو اسلامی کہتے ہوئے نہیں تھکتے اور پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ آئین کو اسلامی قرار دینے سے پورے نظام حکومت کو اسلامی گردانتے ہیں''۔ (۲)

بالکل اسی طرح کے خیالات کا اظہار محترم ظاہر مدنی صاحب بھی اپنے مضمون ''دستور پاکستان اسلامی

ہے؟ میں کرتے ہیں۔ موصوف بھی مجلہ تحریک طالبان پاکستان میں اس موضوع پر قسط وار مضمون لکھ رہے ہیں۔ قسط نمبر ۳ میں لکھتے ہیں کہ پاکستان کا آئین بھی عجیب و غریب اسلامی آئین ہے جس میں جمہوریت اور اسلام جیسے دو متضاد نظاموں کو یکجا کیا گیا ہے، لہذا یہ آئین اسلامی کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک نظام وہ ہے جس میں حاکمیت خدا کی ہے اور دوسرا نظام وہ ہے جس میں حاکمیت غیر اللہ کی ہے۔ ایک میں حلال و حرام کا اختیار اللہ کے پاس ہے دوسرے میں اس کا اختیار اکثریت کے پاس ہے۔ دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد موصوف لکھتے ہیں۔

> ''لہٰذا اسلام اور جمہوریت کا ملغوبہ بنانا دو ایسے عقائد کو خلط ملط کرنے کے مترادف ہے جو بالکل مختلف بنیادوں سے پھوٹے ہیں اور یکسر مختلف اثرات و نتائج کے حامل ہیں''۔ (۳)

تحریک طالبان پاکستان کے ان اہل علم حضرات کو پاکستان کے آئین سے متعلق جو شبہات اور اعتراضات ہیں وہ دیگر مسلح گروہوں کو بھی ہیں۔ اس کے لیے آپ القاعدہ کے رہنما ایمن الظواہری مرحوم کی معروف کتاب ''الصبح والقندیل، رسالة حول رغم اسلامیة دستور باکستان'' ملاحظہ فرمائیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ''سپیدہ سحر اور ٹمٹماتا چراغ، اسلامی دستور سمجھے جانے والے دستور پاکستان کا شریعت کی روشنی میں محاکمہ'' کے عنوان سے موجود ہے۔ ایمن صاحب کی یہ کتاب ان تمام مسلح تنظیموں کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے جو پاکستان کو غیر اسلامی ریاست سمجھ کر مسلح جدوجہد میں مصروف ہیں۔ پیغام پاکستان کے جو جوابات ابھی تک تحریک طالبان کی طرف سے سامنے آئے ہیں ان سب میں اس کتاب کے اثرات بہت واضح نظر آتے ہیں۔ ان کے آپس میں جو بھی فقہی یا کچھ نظریاتی اختلافات ہوں مگر اس معاملے میں بھی یہ سب متفق ہیں۔ ان کے خیالات اور دلائل میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک معروف کتاب ''محترم یحی اللیبی مرحوم کی بھی ہے جس کا عنوان ہے'' حد السنان لقتال حکومة وجیش باکستان، اردو میں اس کا ترجمہ شمشیر بے نیام کے عنوان سے موجود ہے۔ اس کتاب میں بھی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ پاکستان کے خلاف جنگ کرنے کی کیا دینی وجوہات اور دلائل ہیں۔ اس میں پاکستان کے آئین کے اسلامی ہونے کے موقف کو بہت

شدت کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔

یحی اللیبی صاحب اپنی کتاب میں آئین کے اسلامی ہونے کا فریب'' کے تحت وہ وجوہات تفصیل سے بیان کرتے ہیں جن کی وجہ سے پاکستان کا آئین اسلامی نہیں ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ ریاست پاکستان کے اسلامی ہونے کا دعوی سوائے فریب کے کچھ نہیں ہے۔ کیوں کہ پاکستان کے کسی بھی شعبہ زندگی میں کہیں بھی اسلامی احکام نافذ نہیں۔ پاکستان کا آئین دیگر طاغوتی دساتیر جیسا ایک دستور ہے۔ اس پر اسلامی آئین کا نام چسپاں کرنے سے اس کی حقیقت ذرہ برابر نہیں بدلتی۔ یحی صاحب لکھتے ہیں۔

> ''اس طاغوتی نظام کو جواز بخشنے کے لئے یہ فاسد دلیل کئی دہائیوں سے دہرائی جارہی ہے جو حقیقت میں اس خطے کے مسلمانوں سے ایک فریب اور اللہ کے دین کے ساتھ تمسخر کے سوا کچھ نہیں۔''(۴)

بعینہ یہی خیالات ایمن الظواہری صاحب کے بھی ہیں۔ ظواہری صاحب لکھتے ہیں۔

> ''اسی طرح جو شخص یہ کہے کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ وحدہ لاشریک کے لیے خالص نہیں بلکہ یہ حق پارلیمان کی دو تہائی اکثریت کو یا کسی اور کو بھی حاصل ہے تو اس نے بھی کفر کیا اگرچہ اس نے عملا کبھی بھی شریعت کے مخالف قانون سازی نہ کی ہو۔ اس طرح جو شخص ایسے قانون بنائے جو شریعت سے متصادم ہو یا جو شریعت سے بالا فیصلے کرنے کا اختیار دیں یا شرعی احکام رد کرنے یا ان پر نظر ثانی کرنے کا حق تفویض کریں، تو یہ شخص بھی کافر ہے''۔(۵)

ہمارے علماء کرام، مذہبی عوام اور انتہا پسند تنظیموں کی اکثریت کو جمہوریت کے حوالے سے بہت سے تحفظات ہیں، ان کے بہت سے شکوک و شبہات ہیں جس کی وجہ سے یہ لوگ جمہوریت کو ایک مستقل نظام اور اسلام سے متصادم سمجھتے ہیں۔ ان شبہات میں سے کچھ کا تعلق نفس جمہوریت کے غلط فہم پر قائم ہے جبکہ کچھ کا تعلق خالص سیکولر اور لبرل تصور جمہوریت سے ہے۔ خالص سیکولر اور لبرل کا

مطلب ہے وہ سوسائٹی اور معاشرے جہاں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسان اپنے خیر و شر اور غلط و صحیح سے متعلق رہنمائی کے لئے اپنی عقل اور اجتماعی دانش سے ماوراء کسی رہنمائی کا محتاج نہیں ہے، ان معاشروں میں اکثریت کی بنیاد پر بہت سے قوانین بن سکتے ہیں جن کو ہم مذہب مخالف بلکہ مذہب سے متصادم کہیں گے، مگر مسلم اکثریتی معاشروں میں یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح انسانوں پر کسی کو حق حکمرانی کس بنیاد پر مل سکتی ہے؟ یا تو خدائی سند ہو، ختم نبوت کے بعد یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ یا پھر طاقت اور قوت سے جبراً اقتدار حاصل کیا جائے، جیسے فوج اپنی طاقت کے بل بوتے پر حکومت پر قبضہ کر کے حکومت شروع کر دے، یہ انسانیت کی توہین ہے کہ ان پر جبراً حکومت کی جائے۔ یا پھر موروثی بادشاہت ہو، مگر پھر بھی کسی بادشاہ کو مندرجہ بالا طریقوں میں سے کسی طریقے سے اقتدار میں آنا ہو گا۔ یا پھر عوام کی مرضی اور منشا سے کوئی اقتدار میں آئے۔ یہی آخری صورت وہ ہے جس کی بہترین صورت موجودہ جمہوریت میں ممکن ہے۔ نظام کیا ہو گا اور کس طرح کا ہو گا وہ اس پارٹی کے منشور کے مطابق ہو گا جسے لوگ منتخب کریں گے، مسلم اکثریتی ملک میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی پارٹی عوام کی امنگوں کے خلاف کوئی منشور پیش کرے اور لوگ اسے منتخب کریں۔ اسلام میں بھی حکمران کے انتخاب کا کوئی ایک متعین طریقہ نہیں ہے اسی لیے حضرت ابو بکر سے حضرت علی تک مختلف طریقے رہے ہیں جس کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب ہوا ہے۔ پھر یزید کے بعد سے موروثیت رائج ہو گئی مگر پھر بھی اقتدار اور حکمرانی کے لیے خون ریز جنگیں ہوئیں۔ بنو امیہ، بنو عباس، بنو فاطمہ سب کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے ہر وقت جمہوریت کو برا کہنا، اسے خلاف اسلام قرار دینا اور اسلام یا نفس مذہب کے خلاف کوئی نظام قرار دینا ناقابل فہم ہے۔

جمہوریت سے متعلق مذہبی ذہن کے شکوک و شبہات پر بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے، مگر بہت مختصر اور جامع مضمون، نوجوان دانشور محترم اسرار مدنی صاحب کا ہے۔ مدنی صاحب نے اپنی کتاب ''اسلام اور جمہوریت ایک متبادل بیانیہ'' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جمہوریت پر منجملہ اعتراضات میں سے ایک یہ ہے کہ اکثریت حق و باطل کا معیار ہے۔ مدنی صاحب اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اکثریت حق و باطل کا معیار بن گئی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اکثریت کی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ صحیح اور غلط کا معیار تو صرف دلیل ہے۔ اکثریت کی رائے تو اصل میں فصل نزاعات کا ایک طریقہ ہے۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں واحد قابل عمل اور دوسرے تمام ممکنہ طریقوں کے مقابلے میں سب سے بہتر اور کم نقصان دہ طریقہ ہے''۔ (۶)

دیگر بہت سے اعتراضات کا جواب بھی اس کتاب میں نہایت مدلل اور احسن انداز میں دیا گیا ہے۔ جن لوگوں کو مذہب کی بنیاد پر جمہوریت پر اعتراضات اور شبہات ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ لازمی کریں۔

جمہوریت اور اسلام سے متعلق ہمارے ہاں جو بحثیں ہوئی ہیں اس میں ابھی تک دونوں طرف سے دلائل قرآن، حدیث اور خلافت راشدہ سے دینے پر زور رہا ہے یعنی دونوں طرف سے استدلال کی بنیاد یہی نظر آتی ہے۔ معاصر مذہبی اسکالر محترم ڈاکٹر عمار خان ناصر صاحب اس بحث کو کسی اور تناظر میں دیکھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اس انداز بحث سے باہر نکلنا ہوگا کیوں کہ ان کے خیال میں ایسے مذہبی شخص کو جو ان بنیادوں پر جمہوریت کو رد کرتا ہے مذہبی استدلال سے قائل نہیں کیا جا سکتا۔ اسے صرف تاریخی تعامل کی تفہیم سے سمجھا جا سکتا ہے۔ عمار صاحب جس منہج کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ ان کے الفاظ میں عرف کے اصول کو برتنا ہے۔ ڈاکٹر عمار صاحب لکھتے ہیں:

''جمہوریت کے حوالے سے زیادہ موزوں طریقہ مذہبی نصوص کی تشریحات پر زور دینے کی بجائے یہ ہے کہ تاریخی عمل اور اس کے تقاضوں کو سمجھا جائے اور اس پر کلام کیا جائے، یعنی زمان و مکان کے اعتبارات کو مد نظر رکھنے کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اسلامی فقہ میں عرف کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔'' (۷)

ہمارے دور کی مسلح تنظیموں اور جمہوریت کے مخالفین جس طرح کچھ آیات، روایات اور خلافت راشدہ سے استدلال کر کے جمہوریت کو غیر اسلامی، کفر اور شرک ثابت کرتے ہیں بعینہ جمہوریت کے

حامی بھی یہی کام کرتے ہیں۔ ویسے عمار صاحب کی یہ تجویز قابل غور ہے کیوں کہ نصوص کی تشریح سے جو ایک خاص فہم حاصل ہوا ہے اور جس پر ہمارا مذہبی ذہن تشکیل پا چکا ہے اس کے لیے شاید زیادہ موزوں منہج یہی ہے۔ مگر شاید پہلا والا طریقہ بھی اس صورت میں مؤثر ہے جب نصوص کے اس خاص فہم کی کمزوریوں کو دلائل سے رد کیا جائے اور متبادل فہم جن نصوص پر قائم ہے اسے مدلل کر کے بیان کیا جائے۔ اس ساری صورتحال میں جمہوریت کے مخالف اور حامی شخص کا مجموعی فہم اسلام اور مجموعی فہم جمہوریت کا کردار بنیادی کردار ادا کرے گا۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس پوری بحث میں تاریخی تعامل کے اصول بہت زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات:

1- ابوزہرۃ، محمد احمد مصطفی، زہرۃ التفاسیر، دار الفکر العربی، تفسیر سورہ التوبۃ، آیت نمبر 33، ص نمبر 3287

2- الکاشانی، فیلسوف الفقہاء محسن الفیض، تفسیر الصافی، مکتبۃ الصدر، طہران، الطبعۃ الثالثۃ 1379 شمسیۃ، ص نمبر 338، ج نمبر 2

3- الطبرسی، ابو علی الفضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، دار المرتضیٰ، لبنان الطبعۃ الاولی 2006ء، ص نمبر 36، ج نمبر 5

4- ایضاً، ص نمبر 162، ج نمبر 9

5- الطھرانی، السید میر علی الحائری، تفسیر مقتنیات الدرر، مؤسسۃ دار الکتب الاسلامی، قم، ایران، الطبعۃ الاولی 2012ء، ص نمبر 168، ج نمبر 5

6- ایضاً، ص نمبر 235، ج نمبر 10، نیز ص نمبر 164-165، ج نمبر 11

7- الشیرازی، ناصر مکارم، تفسیر الأمثل، ص نمبر 206-207، ج نمبر 11

مسلم دنیا میں دساتیر: سیاسی و قانونی پہلو

تیونس کا دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات

دستوری سفر اور ترامیم کے مقاصد

تیونس کا دستوری سفر 1959 میں پہلی بار شروع ہوا جب آزادی کے بعد پہلا آئین تشکیل دیا گیا۔1959 کا آئین عرب دنیا میں ایک اہم سنگ میل تھا۔اس میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ترامیم کی زیادہ تر نوعیت سیاسی نظام کو مستحکم کرنے یا حکمران جماعت کو مزید اختیارات دینے سے متعلق تھیں۔ یہ ترامیم عام طور پر آمرانہ حکومتوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی تھیں اور جمہوری یا عوامی مفادات کے بجائے حکومتی کنٹرول کو مضبوط کرنے پر مرکوز تھیں۔

صدر الحبیب بورقیبہ کے دور حکومت (1970 کی دہائی) میں آئین میں ترامیم کی گئیں تاکہ صدر کو مزید اختیارات دیے جا سکیں۔اس وقت آئین سے صدارتی مدت کی حد ختم کر دی گئی، جس سے بورقیبہ تاحیات صدر بن گئے۔ پارلیمنٹ کو محدود اختیارات دیے گئے اور ایگزیکٹو کو مضبوط بنایا گیا جس کے بعد آمرانہ حکمرانی مزید مستحکم ہوئی۔ سیاسی اختلافات کو دبانے کے لیے آئینی فریم ورک کا استعمال کیا گیا۔ پھر زین العابدین بن علی کے اقتدار میں آنے کے بعد آئین میں ترامیم ہوئیں (1988) تاکہ ان کے اقتدار کو قانونی حیثیت دی جا سکے۔ صدر کے اختیارات کو مزید بڑھا دیا گیا۔ حکومتی نظام کو بھی مزید مرکزیت دی گئی۔ سیاسی جماعتوں اور آزادئ اظہار پر سخت پابندیاں عائد کی گئیں۔ بن علی کے دور میں عوامی دباؤ اور بین الاقوامی مطالبات کے تحت آئینی ترامیم کی گئیں (2002)، جو ظاہری طور پر جمہوریت کی طرف ایک قدم تھیں۔اس وقت صدارتی مدت کی حد کو دوبارہ شامل کر لیا گیا لیکن اس کے اختتام میں نرمی کا دروازہ بھی رکھا گیا۔ یک جماعتی نظام کو ختم کر کے محدود کثیر الجماعتی نظام کی اجازت دی گئی۔ مگر، اصلاحات صرف کاغذی تھیں، کیونکہ عملاً انتخابات غیر شفاف نہیں کرائے گئے اور اپوزیشن کو مکمل آزادی نہیں دی گئی۔ صرف بین الاقوامی سطح پر بن علی کی حکومت کو قانونی جواز دینے کی کوشش کی گئی۔ان ترام میں قانون سازی کا عمل صدر کے کنٹرول میں رکھا گیا اور عدلیہ کی آزادی محدود

کر دی گئی۔ پارلیمنٹ ربڑاسٹیمپ بن گئی،اور نظام مکمل طور پر صدارتی کر دیا گیا۔

2014 سے پہلے آئینی ترامیم حکمرانوں کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے استعمال ہوئیں اور جمہوری و عوامی شمولیت کو نظر انداز کیا گیا۔ آئینی ترامیم کے ذریعے اپوزیشن کو قانونی اور سیاسی طور پر کمزور کیا گیا۔ پارلیمنٹ اور عدلیہ جیسے ادارے حکمران جماعت کے زیر اثر رہے۔ آئینی ترامیم کو عوام نے آمرانہ حکمت عملی کے طور پر دیکھا، جس سے عوام اور حکومتی ڈھانچے کے درمیان خلیج بڑھتی رہی۔

2014 سے پہلے تیونس کا آئینی نظام جمہوری اقدار کے بجائے آمرانہ حکمرانی کا مظہر تھا۔ ان ترامیم نے حکمرانوں کے اقتدار کو طول دینے اور سیاسی اختلافات کو ختم کرنے کا کام کیا۔ 2011 کی عرب بہار اور اس کے بعد نئے آئین کا نفاذ اس بات کی علامت تھا کہ عوام اب ایک نئے اور جمہوری تیونس کے خواہاں ہیں۔

جدید آئین

2011 کی عرب بہار کے بعد، تیونس نے نئے آئین کی بنیاد پر ایک جمہوری ریاست تشکیل دینے کی کوشش کی۔ 2014 میں موجودہ آئین وضع کیا گیا، جسے ملک کے سیاسی، قانونی، اور سماجی ڈھانچے کو بہتر بنانے کے لیے ایک اہم سنگ میل قرار دیا گیا۔ لیکن آئین میں متعدد ترامیم بھی کی گئیں، جنہوں نے ملکی سیاست اور عوامی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان ترامیم نے تیونس میں سیاسی نظام، اختیارات کی تقسیم، اور حکومتی اصلاحات پر وسیع بحث کو جنم دیا۔

2014 کا آئین عرب بہار کے بعد تشکیل دیا گیا، جس نے سابقہ آمرانہ نظام کو جمہوری ڈھانچے میں تبدیل کرنے کی بنیاد رکھی۔ نئے آئین میں صدر، وزیرِ اعظم، اور پارلیمنٹ کے درمیان اختیارات کی تقسیم ہوئی۔ آزادئ اظہار، خواتین کے حقوق، اور سماجی مساوات پر زور دیا گیا، اور ایک آزاد عدالتی نظام کی تشکیل ہوئی۔ 2014 کے آئین کو عالمی سطح پر سراہا گیا، لیکن بعض مسائل اور اختیارات کی مبہم تقسیم کے باعث بعد میں سیاسی کشیدگی بھی پیدا ہوئی۔

النہضہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد صدر قیس سعید نے 25 جولائی 2021 کو پارلیمنٹ معطل کرتے ہوئے انتظامی اور قانون سازی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ یہ عمل آئینی ترامیم کے بغیر

ہوا۔ وزیرِاعظم کے عہدے کو ختم کر دیا گیا اور حکومت کے تمام اختیارات صدر کے سپرد کر دیا گیا۔ ان اقدامات نے آئین کی تشریح اور اس کی حدود پر سوالات کھڑے کیے۔ یہ تیونس کے سیاسی استحکام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے اور عوام میں تقسیم پیدا کی۔

2022 میں صدر قیس سعید نے ایک نیا آئینی مسودہ پیش کیا، جسے ریفرنڈم کے ذریعے منظور کیا گیا۔ اس نئے ڈھانچے میں صدر کو وسیع اختیارات دیدیے گئے۔ پارلیمنٹ کے کردار کو محدود کر دیا گیا۔ عدلیہ کے نظام میں صدر کا کنٹرول بھی بڑھا دیا گیا۔ عدلیہ کی آزادی 2014 کے آئین کی ایک بڑی کامیابی تھی، لیکن 2021 اور 2022 میں صدر نے عدالتی اداروں کو اپنی مرضی کے تحت چلانے کی کوشش کی۔ سپریم جوڈیشل کونسل کو تحلیل کر دیا گیا اور نئی کونسل تشکیل دی گئی۔ اس نئے آئین نے تیونس کے جمہوری نظام کو صدارتی نظام میں تبدیل کر دیا، جس سے جمہوری قوتیں کمزور ہوئیں۔ عالمی سطح پر بھی تنقید ہوئی کہ یہ اقدامات تیونس کو آمریت کی جانب لے جا رہے ہیں، اور عوام میں بھی شدید مایوسی نے جنم لیا۔

2022 کے نئے ترامیم والے دستور میں خواتین کے حقوق، آزادئ اظہار، اور مزدوروں کے حقوق جیسے موضوعات پر چند موجود ہیں، لیکن حکومتی پالیسیاں ان کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مجموعی طور پہ کے آئین میں انسانی حقوق کے معاملات پر کم توجہ دی گئی۔ تیونس کو ایک مستحکم جمہوری ماڈل کے طور پر دیکھا جا رہا تھا، لیکن حالیہ ترامیم نے اس تاثر کو نقصان پہنچایا ہے۔

جماعت النہضہ کا پیش کردہ آئین

تیونس کی اسلامی جماعت النہضہ نے 2011 کی عرب بہار کے بعد سیاسی منظر نامے میں ایک اہم کردار ادا کیا اور 2014 میں نیا آئین پیش کیا۔ یہ آئین عرب دنیا میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد دستاویز ہے کیونکہ اس میں اسلامی اقدار اور جمہوری اصولوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

آرٹیکل 1 اور 2 میں واضح کیا گیا کہ تیونس کا مذہب اسلام اور زبان عربی ہے، لیکن اسے سیکولر جمہوریت کے اصولوں سے ہم آہنگ رکھا گیا۔ قانون سازی میں شریعت کو براہ راست شامل نہیں کیا گیا، بلکہ اسے اخلاقی رہنما خطوط کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ آئین میں آزادئ اظہار اور مذہبی آزادی کی

ضمانت دی گئی، جو عرب دنیا میں ایک انقلابی قدم تھا۔ خواتین کے حقوق کو مساوات کی بنیاد پر تسلیم کیا گیا اور انہیں سیاسی و سماجی شمولیت میں مکمل کردار ادا کرنے کی اجازت دی گئی۔ آرٹیکل 46 میں ریاست کو خواتین کے خلاف تشدد روکنے اور مساوات کے فروغ کے لیے اقدامات کا پابند بنایا گیا۔ آئین میں صدارتی اور پارلیمانی نظام کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ وزیر اعظم کو پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ بنایا گیا، جبکہ صدر کے اختیارات کو محدود کیا گیا۔ عدلیہ کو آزاد اور خود مختار حیثیت دی گئی، جو ایک مضبوط آئینی جمہوریت کی بنیاد ہے۔ آئین میں انسانی حقوق کے بین الاقوامی معاہدوں کو تسلیم کیا گیا اور ان کی پاسداری کا وعدہ کیا گیا۔ اقلیتوں کے تحفظ اور مذہبی آزادی کو آئینی تحفظ دیا گیا، جو عرب دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں نمایاں پیش رفت تھی۔ آئین میں تعلیم، صحت، اور معیشت کے حوالے سے سماجی انصاف کے اصولوں کو ترجیح دی گئی تھی۔ کمزور طبقات کی مدد اور پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے بھی آئینی ضمانت فراہم کی گئی۔

تیونس کے عوام نے النہضہ کے آئین کو ایک متوازن دستاویز کے طور پر قبول کیا، کیونکہ یہ اسلامی اور جمہوری اقدار کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔ خواتین، اقلیتوں، اور نوجوانوں نے آئین کے ترقی پسند پہلوؤں کو سراہا۔ عرب بہار کے بعد، یہ آئین عوامی امنگوں کی عکاسی کرنے والا پہلا قدم سمجھا گیا۔

البتہ اس کے بالمقابل، سخت گیر اسلامی جماعتوں نے اس آئین میں شریعت کو مکمل طور پہ غالب نہ رکھنے پر تنقید کی اور اسے "غیر اسلامی" قرار دیا۔ ایسے ہی، کچھ سخت گیر سیکولر طبقات نے آئین کے اسلامی تشخص کو نمایاں کرنے پر اعتراض کیا۔ بعض قبائلی اور دیہی علاقوں میں آئین کو اشرافیہ کی دستاویز کہا گیا، جو ان کی مقامی ثقافت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

مجموعی طور پہ دیکھا جائے تو تیونس کا یہ آئین عرب دنیا میں ایک مثالی آئین کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جو اسلامی تشخص کو جمہوری اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ مصر، لیبیا، اور دیگر ممالک میں جمہوری تحریکوں کے لیے یہ آئین ایک رہنما اصول کے طور پر کام کرتا ہے۔ یہ آئین ثابت کرتا ہے کہ جمہوریت اور اسلام کو ایک ساتھ پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی

تنظیموں اور انسانی حقوق کے اداروں نے بھی اس آئین کو انسانی حقوق، آزادئ اظہار، اور صنفی مساوات کے لیے ایک بڑی کامیابی قرار دیا۔

دستوری بحران و مسائل

کسی بھی ملک کا دستور جتنا بھی بہتر ہو، بہر حال ایک جدید آئین میں کچھ مسائل بھی ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ حل ہوتے ہیں۔ تیونس کے جدید آئین میں بھی کچھ مسائل بھی ہیں جنہیں آئینی بحران کے طور پہ دیکھا جاتا ہے۔

اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ

تیونس کا آئین (2014) ایک ایسے نظام کو تشکیل دینے کی کوشش تو کرتا ہے جو صدارتی اور پارلیمانی نظام کا امتزاج ہو، لیکن عملی طور پر یہ تقسیم کئی مسائل اور تنازعات کو جنم دیتی ہے۔ صدارتی اور پارلیمانی نظام کے درمیان اختیارات کا یہ عدم توازن تیونس کے سیاسی استحکام کو متاثر کر رہا ہے۔ 2014 کے آئین میں صدر اور وزیرِ اعظم دونوں کو مختلف اختیارات دیے گئے ہیں، لیکن ان اختیارات کی تقسیم واضح نہیں ہے۔ صدر خارجہ پالیسی اور قومی دفاع جیسے شعبوں میں زیادہ بااختیار ہے، جبکہ وزیرِ اعظم کو داخلی معاملات اور حکومتی انتظامیہ کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ 2021 میں جب صدر قیس سعید نے پارلیمنٹ کو معطل کرتے ہوئے انتظامی اور قانون سازی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے، تو آئینی بحران مزید گہرا ہو گیا۔

اختیارات کی غیر متوازن تقسیم کی وجہ سے صدر اور پارلیمنٹ کے درمیان تنازعات بڑھتے ہیں۔ صدارتی اقدامات کو اکثر پارلیمانی جماعتیں غیر آئینی قرار دیتی ہیں، جبکہ صدر پارلیمنٹ کو غیر مؤثر سمجھتے ہیں۔ صدر قیس سعید نے متعدد مرتبہ پارلیمنٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے حکومتی فیصلے کیے، جس سے پارلیمنٹ اور صدر کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی۔ 2019 کے انتخابات کے بعد وزیرِ اعظم اور صدر کے درمیان اقتصادی اصلاحات پر اختلافات نے ہمیشہ حکومتی کارکردگی کو متاثر کیا۔

اختیارات کی تقسیم کو واضح کرنے کے لیے آئینی ترامیم کی ضرورت ہے، لیکن سیاسی جماعتوں اور

حکومتی اداروں کے درمیان اتفاق رائے کی کمی اس عمل کو پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ کئی سیاسی جماعتوں نے آئینی اصلاحات کی تجویز دی ہے، لیکن صدر اور پارلیمنٹ کے درمیان جاری تنازعات کے باعث یہ تجاویز عملی طور پر نافذ نہیں ہو سکیں۔

آئینی عدالت کی غیر فعالیت

تیونس کے جدید آئین میں آئینی عدالت کو ایک اہم ادارہ تصور کیا گیا تھا، جو آئینی تنازعات کے حل اور آئین کی تشریح کے لیے بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ تاہم، آئینی عدالت کے قیام میں تاخیر یا اس کی غیر فعالیت نے تیونس میں قانونی تنازعات کے حل کے عمل کو شدید متاثر کیا ہے۔ آئینی عدالت کی غیر موجودگی نے اختیارات کی تقسیم، عوامی حقوق، اور سیاسی تنازعات کے مسائل کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔

2014 کے آئین میں آئینی عدالت کو یہ ذمہ داریاں دی گئیں:

- آئین کی تشریح اور اس کے مطابق قوانین کی جانچ۔
- صدر، پارلیمنٹ، اور حکومت کے اختیارات سے متعلق تنازعات کا فیصلہ۔
- بنیادی حقوق اور آزادیوں کے تحفظ کو یقینی بنانا۔

یہ عدالت تیونس کے جمہوری نظام کا بنیادی ستون سمجھی گئی، لیکن عملی طور پر اس کا قیام مکمل نہیں ہو سکا۔

آئینی عدالت کی غیر موجودگی میں، آئین کی تشریح کے لیے کوئی قابل اعتماد ادارہ نہیں ہے، جس کی وجہ سے قانونی تنازعات طویل ہو جاتے ہیں۔ آئینی عدالت کی غیر فعالیت نے عوامی حقوق کے تحفظ میں بھی رکاوٹ پیدا کی ہے، کیونکہ عدالت انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر فیصلہ دینے میں ناکام ہے۔ آئینی عدالت کے بغیر پورا جمہوری نظام غیر متوازن اور کمزور ہو جاتا ہے، کیونکہ قوانین اور پالیسیوں کی آئینی حیثیت کو جانچنے کے لیے کوئی ادارہ موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدر قیس سعید نے آئینی عدالت کے بغیر آئین کی دفعہ 80 کے تحت ایمرجنسی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے پارلیمنٹ کو معطل کر دیا۔ آئینی عدالت کی غیر موجودگی نے اس اقدام کی قانونی حیثیت پر سوالات کو حل کرنے کا کوئی راستہ فراہم نہیں کیا۔ کئی مواقع پر حکومت نے ایسے قوانین منظور کیے جنہیں عوام

اور اپوزیشن غیر آئینی قرار دیتے رہے، لیکن آئینی عدالت کے نہ ہونے کے باعث ان قوانین کی جانچ ممکن نہ ہو سکی۔

آئینی عدالت کی غیر فعالیت کی کچھ وجوہات ہیں۔ ایک تو، آئینی عدالت کے لیے ججوں کی تقرری میں سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلافات نے اس عمل کو روکے رکھا ہے۔ آئینی عدالت کے لیے ضروری قوانین کی منظوری میں تاخیر نے بھی اس کے قیام کے عمل کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ، تیونس میں مسلسل سیاسی بحرانوں نے آئینی عدالت کے قیام کے لیے سازگار ماحول فراہم نہیں کیا۔

تیونس کی جمہوری کامیابی کو آئینی عدالت کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے۔ مصر میں آئینی عدالت 1979 سے فعال ہے اور آئینی تنازعات کے حل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ترکی میں آئینی عدالت نہ صرف آئین کے محافظ کے طور پر کام کرتی ہے بلکہ جمہوری عمل کو بھی مستحکم کرتی ہے۔ اسی طرح سے مراکش نے 2011 میں اپنی آئینی اصلاحات کے تحت آئینی عدالت کو فعال کیا، جس نے عوامی اعتماد کو بہتر بنانے میں کردار ادا کیا۔

آئینی عدالت کے قیام میں تاخیر تیونس کے آئینی نظام میں ایک اہم خلا ہے، جو سیاسی اور قانونی بحرانوں کو بڑھا رہا ہے۔ اس عدالت کا قیام نہ صرف تیونس کی جمہوری کامیابی کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ عوامی اعتماد بحال کرنے اور آئینی تنازعات کو مؤثر انداز میں حل کرنے کا واحد راستہ ہے۔

عوامی حقوق اور آزادیوں کا محدود تحفظ

تیونس کے آئین میں عوامی حقوق اور آزادیوں کا تحفظ ایک اہم پہلو ہے۔ آئین میں حقوق اور آزادیوں کی بات تو کی گئی ہے، لیکن بعض امور میں مبہم تشریح اور عملی نفاذ کے فقدان نے بنیادی انسانی حقوق کے مسائل کو جنم دیا ہے۔ آئین میں درج کچھ حقوق کی وضاحت نہیں کی گئی، جیسے کہ آزادیٔ اظہار کو قومی سلامتی اور مذہبی اقدار کے تحت محدود کیا جا سکتا ہے، لیکن ان حدود کی تشریح واضح نہیں۔ ایسے ہی عملی سطح پر عدالتیں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے ان حقوق کو تحفظ دینے میں ناکام رہے ہیں، جس کی وجہ سے عوام کو ان کے بنیادی حقوق تک رسائی مشکل ہوئی ہے۔ آئین میں صنفی مساوات کی ضمانت تو دی گئی، لیکن دیہی علاقوں میں خواتین اب بھی سماجی اور معاشی استحصال کا شکار ہیں۔ صدر

قیس سعید کے غیر معمولی اختیارات استعمال کرنے کے بعد کئی سیاسی کارکنوں اور عوامی نمائندوں کو قید کیا گیا، جو شہری آزادیوں کی خلاف ورزی ہے۔

مقامی قبائلی اثرات کا آئینی معاملات میں عمل دخل

چونکہ تیونس، شمالی افریقہ کا ایک ملک ہے، جو تاریخی طور پر متنوع ثقافتی اور سماجی ڈھانچے کا حامل ہے۔ اس میں شہری اور دیہی دونوں طرزِ زندگی شامل ہیں۔ دیہی اور پسماندہ علاقوں میں قبائلی ڈھانچہ اور روایتی سماجی نظام اب بھی مضبوطی سے قائم ہیں۔ یہ قبائلی اثرات کئی مواقع پر آئینی اصولوں کے نفاذ اور جمہوری عمل میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں، خاص طور پر ایسے معاملات میں جہاں ریاستی قوانین اور روایتی سماجی اصولوں کے درمیان تصادم ہو۔

تیونس میں بہت سے دیہی علاقوں میں قبائلی سرداروں اور روایتی نظام کو قانونی اور انتظامی امور میں برتری حاصل ہے۔ قبائل اکثر مقامی تنازعات حل کرنے کے لیے روایتی طریقے استعمال کرتے ہیں، جو ریاستی عدالتی نظام سے مختلف ہوتے ہیں۔

آئین شہریوں کو مساوات، انصاف، اور بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے، لیکن قبائلی اثرات کے زیر اثر کچھ علاقوں میں یہ حقوق محدود ہو جاتے ہیں۔ قبائلی علاقوں میں خواتین کے حقوق کی صورتحال آئینی ضمانتوں کے برخلاف ہے، جہاں روایتی قوانین صنفی مساوات کو نظرانداز کرتے ہیں۔ قبائلی اثر و رسوخ انتخابات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، جہاں ووٹ قبائلی وابستگی کی بنیاد پر ڈالے جاتے ہیں، نہ کہ امیدوار کی قابلیت یا نظریات کی بنیاد پر۔ دیہی علاقوں میں جرائم اور تنازعات کو حل کرنے کے لیے قبائلی جرگے استعمال کیے جاتے ہیں، جن کے فیصلے اکثر آئینی حقوق کی خلاف ورزی پر مشتمل ہوتے ہیں، جیسے کہ خواتین کی زبردستی شادیاں یا زمین کے تنازعات۔ تیونس کے دیہی علاقوں میں قبائلی نظام کے تحت خواتین کی تعلیم، جائیداد کے حقوق، اور آزادانہ نقل و حرکت پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں، جو آئین کی دفعہ 21 (مساوات) اور دفعہ 46 (خواتین کے حقوق) سے متصادم ہیں۔

ان مسائل پر مناسب حکمت عملی، تعلیم، اور ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔ ریاستی قوانین اور قبائلی روایات کے درمیان توازن پیدا کرنا ایک احسن اقدام ہو سکتا ہے۔

انڈونیشیا کا آئین: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات

آئین کی غیر واضح تعبیر اور مبہم تشریحات

انڈونیشیا کا آئین، جو 1945 میں پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا، میں کئی دفعات اور شقیں ایسی ہیں جن کی زبان مبہم اور غیر واضح ہے، جس کے نتیجے میں سیاسی اور قانونی تنازعات جنم لیتے ہیں۔ اس مسئلے نے ملک میں مختلف حکومتی اداروں، سیاسی جماعتوں، اور عدالتی نظام کے درمیان اختلافات اور تنازعات کو بڑھاوا دیا ہے۔

آئین میں کئی اہم معاملات، جیسے اختیارات کی تقسیم، آئینی ترامیم کے عمل، اور بنیادی حقوق کی تعریف، کو واضح اور جامع انداز میں بیان نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر، انڈونیشیا کے آئین کی بنیاد "Pancasila" کے اصولوں پر ہے، لیکن ان اصولوں کی تشریح مختلف ادوار میں مختلف حکمرانوں نے اپنے سیاسی مفادات کے مطابق کی ہے۔ اس کے نتیجے میں، یہ نظریہ کبھی قوم پرستی کے فروغ کے لیے استعمال ہوا تو کبھی مذہبی کنٹرول کے لیے۔

اسی طرح، آئین صدر کو وسیع اختیارات دیتا ہے، لیکن ان اختیارات کی حدود اور چیک اینڈ بیلنس کا نظام واضح نہیں۔ یہ مسئلہ 1998 میں صدر سہارتو کے استعفے کے بعد شدت اختیار کر گیا تھا۔ صدر سہارتو نے آئین کی مبہم دفعات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی حکومت کو طول دیا۔ ان کے استعفے کے بعد آئینی بحران نے ملک کو سیاسی عدم استحکام کی جانب دھکیل دیا، کیونکہ عبوری حکومت کے قیام اور اقتدار کی منتقلی کے لیے کوئی واضح آئینی رہنمائی موجود نہیں تھی۔

علاقائی خود مختاری کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ آئین میں صوبائی اور مقامی حکومتوں کے اختیارات کی شفاف اور کھلی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے مشرقی انڈونیشیا کے صوبے، جیسے پاپوا، مسلسل علیحدگی کی تحریکیں چلا رہے ہیں۔

انڈونیشیا کے اندر، آئینی عدالت (Constitutional Court) کو اکثر آئین کی تشریح کے لیے مداخلت کرنی پڑتی ہے، لیکن مبہم زبان کی وجہ سے عدلیہ کی تشریحات پر بھی سوال اٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر 2003 میں ایک آئینی تنازع ہوا۔ جب آئینی عدالت نے صدارتی انتخابات کے طریقہ کار پر فیصلہ سنایا، تو سیاسی جماعتوں نے فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے اسے آئینی زبان کے ابہام کا نتیجہ قرار دیا۔

ملک میں عام طور پہ، سیاسی جماعتیں آئینی ابہام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی مرضی کی تشریح پیش کرتی ہیں، جس سے سیاسی کھینچاتانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ قانونی تنازعات کا حل عدلیہ کے کندھوں پر آجاتا ہے، جو اکثر دباؤ کا شکار رہتی ہے۔ آئینی بحران کا خطرہ ہر وقت برقرار رہتا ہے، جو ملک کی جمہوری ترقی میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

آئین کی مبہم دفعات کو واضح کرنے کے لیے جامع ترامیم اور قانونی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اس میں تمام اسٹیک ہولڈرز کی شمولیت اور ایک شفاف عمل کو یقینی بنانا ضروری ہوگا تاکہ آئینی استحکام اور جمہوری اقدار کو فروغ دیا جاسکے۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ

انڈونیشیا ایک وفاقی ریاست ہے، جہاں آئین میں اختیارات کی تقسیم کا نظام مرکزیت پر مبنی ہے۔ تاہم، مرکزیت اور صوبائی خود مختاری کے درمیان توازن کی ناکامی نے ملک کو مسلسل سیاسی کشمکش اور سماجی عدم استحکام سے دوچار رکھا ہے۔ آئین میں اختیارات کی واضح تقسیم نہ ہونے کے باعث مرکزی حکومت اور صوبائی انتظامیہ کے درمیان تنازعات نے کئی مرتبہ علیحدگی کی تحریکوں اور بدامنی کو جنم دیا ہے۔

1945 کا آئین انڈونیشیا کو ایک مضبوط مرکزیت کے حامل ملک کے طور پر پیش کرتا ہے، جہاں زیادہ تر اختیارات صدر اور مرکزی حکومت کے پاس رہتے ہیں۔ سہارتو کے 32 سالہ آمرانہ اقتدار (1998-1967) میں مرکزیت کو مضبوطی سے نافذ کیا گیا، اور صوبائی حکومتوں کو زبردستی مرکز کے ماتحت رکھا گیا۔ اس نے مقامی برادریوں کی خود مختاری کو محدود کر دیا، جس کے نتیجے میں پاپوا اور آچے جیسے

علاقوں میں علیحدگی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔

1998 میں سہارتو کے استعفے کے بعد، جمہوری اصلاحات کے تحت صوبائی خود مختاری کو فروغ دینے کے لیے اہم قانون سازی کی گئی، جن میں Law No. 22/1999 اور Law No. 32/2004 شامل ہیں۔ ان قوانین نے مقامی حکومتوں کو تعلیم، صحت، اور ترقیاتی منصوبوں کے اختیارات دیے۔ لیکن ان اصلاحات نے بھی نئے مسائل کو جنم دیا۔ کیونکہ کچھ شعبوں میں صوبوں کو زیادہ اختیارات دیے گئے، لیکن مالیاتی وسائل مرکز کے کنٹرول میں رہے، جس سے صوبے اپنے اختیارات کو مؤثر طریقے سے استعمال نہیں کر سکے۔

آچے، جہاں ایک مضبوط اسلامی شناخت غالب ہے، نے مرکز کے خلاف خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ اس تحریک کو طاقت کے ذریعے دبانے کی کوشش نے سیاسی کشیدگی کو بڑھاوا دیا، جس کے بعد 2005 میں ایک معاہدے کے تحت آچے کو خصوصی خود مختاری دی گئی۔ اسی طرح، پاپوا میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور مقامی ثقافتی شناخت کے تحفظ کے مطالبے نے بھی علیحدگی کی تحریک کو تقویت دی۔ ایسے ہی، بالا امی صوبے میں معدنیات کی کان کنی کے وسائل پر مرکز اور صوبائی حکومت کے درمیان شدید اختلافات نے ترقیاتی منصوبوں میں رکاوٹیں پیدا کیں اور مقامی اشتعال کو ہوا دی۔ مرکزیت کے باعث مالیاتی وسائل کا زیادہ تر حصہ جکارتہ کے کنٹرول میں رہا، جس سے پسماندہ علاقوں میں ترقیاتی عمل متاثر ہوا۔ بعض صوبائی حکومتوں نے حاصل شدہ خود مختاری کو بہتر حکمرانی کے بجائے ذاتی فوائد کے لیے استعمال کیا، جس سے کرپشن میں اضافہ ہوا۔

اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے انڈونیشیا کے آئین میں اختیارات کی واضح تقسیم اور مالیاتی وسائل کی منصفانہ تقسیم کو زیادہ شفاف انداز میں واضح کرنا ضروری ہے۔

سیاسی جماعتوں کا آئینی دائرہ کار

انڈونیشیا میں سیاسی جماعتیں جمہوری عمل کا ایک اہم ستون ہیں، لیکن آئین میں ان کے کردار اور اختیارات کے دائرہ کار کی غیر واضح صورتحال کے باعث سیاسی عمل میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے لیے قواعد و ضوابط کا عدم استحکام اور مبہم آئینی شقوں نے حکومتی ڈھانچے کو متاثر کیا ہے،

جس کے نتیجے میں نہ صرف سیاسی کشیدگی بڑھتی ہے بلکہ نظام میں شفافیت اور جوابدہی کا فقدان بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

انڈونیشیا کے آئین میں سیاسی جماعتوں کا کردار تو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن ان کے اختیارات، ذمہ داریوں، اور حکومت میں شراکت داری کے اصولوں کی تفصیلات واضح نہیں کی گئیں۔

ایک تو آئین میں انتخابی اتحادوں کی تشکیل اور تحلیل کے اصول اور طریق کار مبہم ہیں، جس کے باعث سیاسی جماعتیں ذاتی مفادات کے تحت اتحاد بناتی اور توڑتی ہیں۔ مخلوط حکومت میں وزارتوں اور اہم عہدوں کی تقسیم پر اکثر جماعتوں کے درمیان تنازعات پیدا ہوتے ہیں، جو حکومتی کارکردگی کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً، صدر یودویونو (2004-2014) کی حکومت میں سیاسی جماعتوں کے درمیان اتحاد تو تشکیل دیا گیا، لیکن اس دوران تنازعات کے نتیجے میں پارلیمنٹ میں اہم بلز پاس نہ ہو سکے، اور حکومتی پالیسی سازی کا عمل شدید متاثر ہوا۔ جماعتوں کے درمیان ایسے تنازعات اور حکومت سے الگ ہونے کے رجحان نے سیاسی غیر یقینی کی صورتحال پیدا کیے رکھی ہے۔

اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ

انڈونیشیا ایک کثیر الثقافتی اور کثیر المذاہب معاشرہ ہے، جہاں آئین میں تمام شہریوں کو مساوی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ تاہم، اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے آئینی شقوں کے عملی اطلاق میں ناکامی نے معاشرتی ہم آہنگی کو متاثر کیا ہے۔ اقلیتوں کو بعض اوقات امتیازی سلوک، تشدد، اور سماجی تنہائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو سیاسی کشیدگی اور سماجی تفریق کو بڑھاتا ہے۔

انڈونیشیا کا آئین 1945 میں تیار کیا گیا، جس میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے عمومی اصول تو موجود ہیں، لیکن عملی طور پر ان اصولوں کی وضاحت اور اطلاق کے ضمن میں کئی خامیاں موجود ہیں۔ آئین کی دفعہ 27 تمام شہریوں کو مساوی حیثیت اور قانون کے سامنے برابری کی ضمانت دیتی ہے، لیکن اس میں اقلیتوں کے مخصوص مسائل کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ دفعہ 29 میں مذہبی آزادی کا حق دیا گیا ہے، لیکن اس میں صرف چھ تسلیم شدہ مذاہب (اسلام، عیسائیت، ہندومت، بدھ مت، کنفیوشسزم، اور کیتھولک) کو شامل کیا گیا ہے، جبکہ دیگر اقلیتوں کے مذاہب کو نظرانداز کیا گیا۔ اکثر

اوقات شیعہ کمیونٹیز کو بھی مذہبی تہواروں کے انعقاد اور اپنی عبادت گاہوں کے تحفظ میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔انڈونیشیا میں کئی دوسرے مقامی مذاہب اور ثقافتی گروہ ہیں جو سرکاری سطح پر تسلیم شدہ نہیں ہیں۔ ان گروہوں کو نہ صرف حکومتی امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ سماجی تفریق اور ریاستی سہولیات سے بھی محرومی کا شکار ہیں۔مثال کے طور پر، Toraja مذہب کے پیروکاروں کو اپنے ثقافتی شعائر کو سرکاری طور پر تسلیم کرانے کے لیے مشکلات کا سامنا ہے۔پارلیمنٹ میں بھی اقلیتوں کی کم نمائندگی ان کے مسائل کو ایجنڈے میں شامل کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے، اور پالیسی سازی میں ان کی آواز اکثر نظرانداز کی جاتی ہے۔

عدلیہ کی آزادی اور آئینی تنازعات

انڈونیشیا میں عدلیہ کو آئین کے تحت آزاد حیثیت حاصل ہے تاکہ وہ تنازعات کو منصفانہ اور مؤثر طریقے سے حل کر سکے۔تاہم، عدلیہ کی آزادی پر اثرانداز ہونے والے عوامل اور آئینی تنازعات کے حل کے نظام میں خامیوں نے نہ صرف عدالتی نظام کو کمزور کیا بلکہ عوامی اعتماد کو بھی متاثر کیا ہے۔

انڈونیشیا کا آئین (1945) عدلیہ کو ایک آزاد ادارہ قرار دیتا ہے، خاص طور پر دفعہ 24 عدلیہ کو قانون کے نفاذ میں آزادی فراہم کرتی ہے۔ایسے ہی دفعہ A24 آئینی عدالت (Constitutional Court) کو آئین کی تشریح اور تنازعات کے حل کا اختیار دیتی ہے۔دفعہ 24C آئینی عدالت کو انتخابات کے تنازعات، سیاسی جماعتوں کے معاملات، اور آئینی مسائل میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیتی ہے۔لیکن ان دفعات کی عملی تشریح اور اطلاق میں کئی مسائل سامنے آئے ہیں، جو عدلیہ کی آزادی پر اثر ڈالتے ہیں۔

آئینی طور پہ عدلیہ کو آزاد تو قرار دیا گیا ہے، لیکن اس پر اکثر سیاسی مداخلت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ 2011 میں انڈونیشیا کی آئینی عدالت کے سربراہ، اکمل مختار، کو کرپشن کے الزامات میں ملوث پایا گیا۔بعض اہم فیصلے، خصوصاً انتخابات سے متعلق، سیاسی دباؤ کے تحت کیے گئے، جنہوں نے عدلیہ کی غیر جانبداری پر سوالات اٹھائے۔ 2020 میں کئی ججوں پر کرپشن کے الزامات لگے، جنہوں نے عدلیہ کی خود مختاری اور عوامی اعتماد کو کمزور کیا۔

انڈونیشیا میں آئینی عدالت کو بہت سے تنازعات کے حل کا اختیار تو دیا گیا ہے، لیکن بعض اہم معاملات

جیسے کہ خود مختاری اور انسانی حقوق کے مسائل میں اس کا کردار محدود ہے۔

اسی طرح عدالتی فیصلوں پر عمل درآمد اکثر غیر مؤثر ہوتا ہے، خاص طور پر جب وہ حکومتی پالیسیوں یا بڑے سیاسی مفادات سے متصادم ہوں۔ 2017 میں آئینی عدالت نے ایک فیصلہ دیا جو مقامی حکومتوں کے انتخابات میں شفافیت کو بہتر بنانے کے لیے تھا، لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ انتخابات کے دوران پیدا ہونے والے تنازعات کو حل کرنے میں آئینی عدالت کو محدود وقت دیا جاتا ہے، جو فیصلوں کے معیار کو متاثر کرتا ہے۔ 2014 کے صدارتی انتخابات میں پرابو و سبیانتو اور جوکو ویڈودو کے درمیان تنازعہ آئینی عدالت میں پہنچا۔ عدالت نے جوکو ویڈودو کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن پراسیس پر اعتراضات کیے گئے کہ عدالت نے سیاسی دباؤ کے تحت جلدی فیصلہ کیا۔

عدلیہ پر سیاسی مداخلت اور بدعنوانی کے الزامات نے عوامی اعتماد کو متاثر کیا، جس سے آئینی تنازعات کے حل کا عمل بھی متاثر ہوا۔

جمہوری اصلاحات اور فوج کے ساتھ تعلقات

انڈونیشیا کی سیاسی تاریخ میں فوج نے ایک انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ 1998 میں سوہارتو کی حکومت کے خاتمے کے بعد جمہوری اصلاحات متعارف کرائی گئیں، لیکن فوج کی طاقت اور سیاست میں مداخلت کا سلسلہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ آئین میں فوج کے کردار کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے کئی سیاسی مسائل پیدا ہوئے، جنہوں نے جمہوری استحکام کو متاثر کیا۔

انڈونیشیا کے آئین (1945) میں فوج کا کردار قومی دفاع اور سلامتی تک محدود کیا گیا ہے، لیکن اس کردار کی وضاحت مبہم ہے، خاص طور پر دفعہ 30 میں فوج اور پولیس کو قومی سلامتی کے ذمہ دار ادارے قرار دیا گیا ہے، لیکن ان کے کردار کی تفصیلات فراہم نہیں کی گئیں۔ آئین میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ فوج کو کن حالات میں غیر عسکری معاملات میں مداخلت کی اجازت ہو گی۔ 1998 کے بعد کی اصلاحات کے باوجود فوج کے سیاست میں کردار کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکا۔

صدر سوہارتو (1966-1998) نے (Dual Function) کا تصور متعارف کرایا، جس کے تحت فوج کو نہ صرف قومی سلامتی بلکہ سیاسی اور سماجی استحکام کے تحفظ کا بھی ذمہ دار ادارہ بھی قرار دیا گیا۔ اس

پالیسی کے نتیجے میں فوج نے سیاست، معیشت، اور حکومتی ڈھانچے پر گہرا اثر ڈالا، جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ جمہوری اصلاحات (1998 کے بعد) میں فوج کو سیاسی عمل سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہ عمل مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ 2019 میں، انتخابات کے بعد جب سیاسی کشیدگی بڑھی، تو فوج نے امن و امان کے قیام کے نام پر غیر معمولی طاقت استعمال کی، جس پر عوامی اعتراضات سامنے آئے۔ فوج نے مختلف مواقع پر قومی سلامتی کے نام پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی بھی کی۔ پاپوا اور آچے میں علیحدگی پسند تحریکوں کو دبانے کے دوران فوج پر عام شہریوں کے خلاف طاقت کے غیر ضروری استعمال کا الزام لگایا گیا۔ اس طرح کے معاملات آئینی تنازعات کو جنم دیتے ہیں، کیونکہ ان کارروائیوں کے قانونی جواز پر سوالات اٹھتے ہیں۔ 2004 میں پہلی بار براہ راست صدارتی انتخابات ہوئے، لیکن فوج نے پس پردہ کئی امیدواروں کی حمایت یا مخالفت کی۔ اس کے بعد سول حکومت اکثر فوجی دباؤ کے تحت فیصلے کرتی ہے، جو جمہوری اصولوں کے خلاف ہے۔ فوج کو معاشی اداروں پر بھی اثر و رسوخ حاصل ہے۔ ملک کے کئی کاروباری اداروں پر اس کا کنٹرول ہے۔

شریعت اور سیکولر قوانین کے درمیان کشمکش

انڈونیشیا ایک متنوع مذہبی اور ثقافتی معاشرہ ہے، جس کی اکثریتی آبادی مسلمان ہے۔ اگرچہ انڈونیشیا کے آئین کا ڈھانچہ رسمی طور پر سیکولر ہے، لیکن شریعت کے اصول مختلف مقامی قوانین اور ضوابط میں شامل ہیں۔ انڈونیشیا کے آئین میں ریاست کو کسی مخصوص مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں کیا گیا۔

انڈونیشیا کی ریاست (Pancasila) کی بنیاد پانچ اصولوں پر قائم ہے، جن میں "اللہ پر یقین" بھی شامل ہے، لیکن یہ اصول سیکولر اور تمام مذاہب کے لیے غیر جانبدار رہنے کی ضمانت دیتا ہے۔

بعض مقامی حکومتوں کے قوانین میں شریعت کا نفاذ ہے۔ انڈونیشیا کے کئی صوبے، خاص طور پر آچے، نے مقامی سطح پر شرعی اصولوں کو قانونی شکل دی ہے۔ آچے میں 2001 کے بعد خصوصی خود مختاری کے تحت اسلامی قوانین نافذ کیے گئے، جن میں خواتین کے لباس کے ضوابط، شراب پر پابندی، اور کوڑوں کی سزا جیسے قوانین شامل ہیں۔

اس میں مسئلہ نہیں کہ بعض علاقوں میں شرعی قوانین کو ترجیح دی جاتی ہے، البتہ بعض علاقوں میں

غیر مسلم شہریوں پر بھی شریعت کے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جو مسائل کا سبب بنتا ہے۔ عدلیہ، شرعی اور سیکولر قوانین کے درمیان تنازعات کو حل کرنے میں اکثر دباؤ کا شکار رہتی ہے، جس سے قانونی عمل سست اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔

عوام میں شعور اجاگر کیا جائے کہ شریعت اور سیکولر قوانین کے درمیان توازن کیسے قائم کیا جا سکتا ہے تاکہ مذہبی اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ ملے۔ شریعت اور سیکولر قوانین کے درمیان کشمکش انڈونیشیا کے آئینی نظام کا ایک اہم مسئلہ ہے، جو نہ صرف قانونی تنازعات بلکہ سماجی اور سیاسی تقسیم کا بھی باعث بنتا ہے۔ اس تنازعے کو حل کرنے کے لیے آئینی اصلاحات، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، اور عدالتی عمل کو مضبوط بنانا ضروری ہے تاکہ انڈونیشیا کے جمہوری اور کثیر المذاہب تشخص کو برقرار رکھا جا سکے۔

بنگلہ دیشی دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات

بنگلہ دیش کی سیاسی تاریخ آئینی بحرانوں سے بھری ہوئی ہے، جس میں مختلف اوقات میں ہونے والی آئینی ترامیم نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ 1972 میں جب بنگلہ دیش کا آئین منظور کیا گیا، تو اس کا مقصد ایک مستحکم، جمہوری نظام کی بنیاد رکھنا تھا۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ مختلف حکمران جماعتوں نے اپنی سیاسی ضروریات اور اقتدار کو طول دینے کے لیے بارہا اس آئین میں ترامیم کیں۔ ان ترامیم نے نہ صرف سیاسی استحکام کو متاثر کیا بلکہ جمہوری عمل کو بھی کمزور کیا ہے۔

آئینی ترامیم

بنگلہ دیش کے آئین میں اب تک تقریباً 17 ترامیم کی جا چکی ہیں، جن میں سے کئی عوامی مفاد کے لیے تھیں، جبکہ بعض ترامیم، حکومتوں کے سیاسی مفادات کے تحت کی گئیں۔ عوامی مفاد کی ترامیم میں 1991 کی بارہویں ترمیم نمایاں ہے، جس نے پارلیمانی جمہوری نظام کو بحال کیا، اور اس میں عدلیہ کی آزادی کو یقینی بنانے کے اقدامات بھی شامل ہیں۔ تاہم، بیشتر ترامیم جیسے چوتھی ترمیم (1975) اور پانچویں ترمیم (1979) حکومتوں نے اپنے سیاسی اقتدار کو مضبوط کرنے اور اپوزیشن کو کمزور کرنے کے لیے کیں۔ مجموعی طور پر، ان ترامیم کا تقریباً 60 فیصد سیاسی مفادات اور اقتدار کی مرکزیت کے لیے، جبکہ 40 فیصد عوامی فلاح اور جمہوری اداروں کو مضبوط کرنے کے لیے تھا۔

بنگلہ دیش کے ابتدائی آئین میں سیکولرازم، قوم پرستی، جمہوریت، اور سوشلسٹ اصولوں کو بنیادی ستونوں کے طور پر پیش کیا گیا۔ بنیادی حقوق اور عدلیہ کی آزادی کو یقینی بنایا گیا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف حکومتوں نے ان اصولوں میں ترامیم کے ذریعے تبدیلیاں کیں، جن میں سیاسی اور مذہبی مفادات کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

جنرل ضیاء الرحمان کی فوجی حکومت کے دوران، پانچویں ترمیم کے ذریعے سیکولرازم کو ختم کر کے

مذہبی عنصر کو متعارف کروایا گیا۔ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم ''کو آئین کے دیباچے میں شامل کیا گیا، اور مذہبی جماعتوں کو دوبارہ سیاست میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی۔ صدر حسین محمد ارشاد کے دور (1988) میں اسلام کو ریاستی مذہب قرار دیا گیا۔ یہ ترمیم بنگلہ دیش میں مذہب کے کردار پر ایک مستقل تنازعے کا سبب بنی رہی۔

عوامی لیگ کی حکومت کے دوران، پندرہویں ترمیم (2011) کے ذریعے نگران حکومت کے نظام کو ختم کر دیا گیا، جو 1996 میں متعارف کیا گیا تھا تاکہ انتخابات شفاف اور غیر جانبدار ہوں۔ اس ترمیم کے سبب انتخابات کے دوران پچھلی حکومت کو کردار ملا، جس سے اپوزیشن نے انتخابات کی شفافیت پر سوالات اٹھائے۔ 2014 کے عام انتخابات کا بائیکاٹ اسی تنازعے کی وجہ سے کیا گیا، جس کے نتیجے میں یک جماعتی پارلیمنٹ وجود میں آئی۔

آئینی ترامیم کے اثرات

آئینی ترامیمی کے ذریعے مختلف حکومتوں نے اپوزیشن کے کردار کو محدود کیا اور خود کو مضبوط کیا۔ مثال کے طور پر، نگران حکومت کے خاتمے سے انتخابی عمل کی غیر جانبداری ختم ہو گئی، اور اپوزیشن جماعتوں نے انتخابات میں دھاندلی کے الزامات لگائے۔

پانچویں اور ساتویں آئینی ترامیم کے ذریعے فوجی حکومتوں کے اقدامات کو قانونی تحفظ دیا گیا، جس نے عدلیہ کی آزادی کو محدود کر دیا اور جمہوری اداروں کی فعالیت کو متاثر کیا۔

مذہبی عنصر کو آئین میں جگہ دی گئی جو کہ اچھی بات ہے، لیکن اس کی خاص تشریحات نہیں کی گئی اور اسے بھی بدقسمتی سے اشرافیہ نے اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ بعد میں سپریم کورٹ نے آٹھویں ترمیم کے کچھ حصوں کو غیر آئینی قرار دیا، جس سے ریاستی مذہب اور سیکولرازم کے مابین تنازعے کو ہوا بھی ملی۔

بنگلہ دیش کے آئینی بحران میں آرٹیکل 70 کا کردار

بنگلہ دیش کی آئینی سیاست میں آرٹیکل 70 ایک متنازعہ اور اہم شق ہے، جو ارکانِ پارلیمنٹ کو اپنی پارٹی

کے خلاف ووٹ دینے سے روکتی ہے۔ یہ شق بظاہر سیاسی استحکام کو یقینی بنانے کے لیے متعارف کرائی گئی تھی، لیکن وقت کے ساتھ اس کا استعمال جمہوری عمل کو محدود کرنے اور پارلیمانی آزادی کو سلب کرنے کے لیے کیا گیا۔ اس آرٹیکل نے نہ صرف پارلیمنٹ کی فعالیت کو متاثر کیا بلکہ حکمران جماعتوں کو غیر معمولی طاقت بھی فراہم کی، جس کی وجہ سے آئینی بحران مزید گھمبیر ہو گیا۔

1972 کے آئین میں شامل آرٹیکل 70 کے مطابق، کوئی بھی رکنِ پارلیمنٹ اپنی پارٹی کے فیصلے کے خلاف ووٹ نہیں دے سکتا، چاہے وہ پارلیمنٹ میں ہو یا اعتماد کے ووٹ کے دوران۔ اگر کوئی رکن ایسا کرتا ہے تو اس کی نشست ختم ہو جاتی ہے، اور اسے "فلور کراسنگ" کا عمل کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد سیاسی وفاداری کو یقینی بنانا اور پارٹیوں کے اندرونی انتشار کو روکنا تھا۔

یہ آرٹیکل پارلیمانی جمہوریت کے اصولوں کے برعکس ہے، جہاں ارکان کو آزادانہ طور پر اپنی رائے دینے کا حق ہونا چاہیے۔ آرٹیکل 70 کے تحت ارکانِ پارلیمنٹ کے لیے اپنے حلقوں کے مفادات کو ترجیح دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے تحت ارکانِ پارلیمنٹ اپنی پارٹی کے فیصلوں کے خلاف ووٹ نہیں دے سکتے، چاہے وہ فیصلے ان کے حلقوں کے عوام کے مفاد میں نہ بھی ہوں۔ اس کی وجہ سے پارلیمنٹ محض ایک رسمی ادارہ بن گیا، جہاں حکومتی فیصلوں پر کوئی مؤثر بحث یا اختلاف ممکن نہیں۔ ایسے ہی حکومت کے ارکان پارٹی کے خلاف بات کرنے سے قاصر رہتے ہیں، جس سے حکمران جماعت کے احتساب کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ اپوزیشن بھی حکومت پر مؤثر دباؤ ڈالنے میں ناکام رہتی ہے، کیونکہ قانون سازی کے دوران ارکان کی رائے پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے۔ اس سب کا نتیجہ غیر معیاری قانون سازی کی صورت میں نکلتا ہے، جو عوامی مفاد کے خلاف ہو سکتی ہے۔

2014 کے عام انتخابات کے دوران، آرٹیکل 70 کے باعث حکمران جماعت عوامی لیگ کے اندر کوئی اختلافی آواز نہیں اٹھی، جس سے اپوزیشن نے انتخابات کی شفافیت پر سوالات اٹھائے۔ کئی ارکانِ پارلیمنٹ نے نجی طور پر یہ اعتراف کیا کہ وہ عوامی مفادات کے برخلاف حکومتی پالیسیوں کی حمایت کرنے پر مجبور ہیں۔ مثال کے طور پر، بنگلہ دیش میں زمین کے متنازع قوانین اور توانائی کے شعبے میں غیر شفاف معاہدوں پر کھلی بحث کی اجازت نہیں دی گئی۔

فوج کا آئینی سیاست میں کردار

بنگلہ دیش کے آئین میں فوج کو ایک غیر سیاسی اور قومی دفاعی ادارے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جس کا بنیادی مقصد ملک کی آزادی، خود مختاری، اور جغرافیائی حدود کا تحفظ ہے۔ آئین کے آرٹیکل 61 کے تحت مسلح افواج حکومت کے کنٹرول میں رہتی ہیں، اور انہیں کسی بھی داخلی یا خارجی خطرے سے نمٹنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ آئین فوج کو عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں شامل ہونے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ جمہوری نظام کی پاسداری اور آئینی حدود میں رہنے کی پابندی کو یقینی بناتا ہے۔

آئین میں فوج کے اس خاص کردار کی تصریح کے باوجود، بنگلہ دیش کی تاریخ میں فوج کا کردار ایک اہم اور متنازعہ موضوع رہا ہے، جو ملک کے آئینی تسلسل اور جمہوری عمل پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ فوج نے نہ صرف متعدد بار آئینی حکومتوں کا تختہ الٹا بلکہ سیاست میں اپنی مداخلت سے آئینی بحران کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ 1975 میں شیخ مجیب الرحمن کی حکومت کا تختہ الٹنا بنگلہ دیش کی سیاست میں فوج کی مداخلت کا آغاز تھا۔ اس واقعے کے بعد ملک میں کئی فوجی حکومتیں آئیں، جنہوں نے جمہوریت کو متاثر کیا اور آئینی عمل کو روک دیا۔ جنرل ضیاء الرحمان (1975-1981) نے اقتدار میں آ کر نہ صرف آئین میں ترامیم کیں بلکہ سیاست میں فوج کے کردار کو بھی مضبوط کیا۔ انہوں نے سیاسی جماعتوں کو بحال تو کیا لیکن فوجی اثر و رسوخ کو برقرار رکھا۔ جنرل ارشاد (1982-1990) نے ایک اور فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار حاصل کیا اور تقریباً ایک دہائی تک ملک پر حکمرانی کی۔ ان کے دور میں آئینی جمہوریت کو مزید کمزور کیا گیا، اور فوجی اثرات ہر سطح پر واضح تھے۔

ان فوجی بغاوتوں نے آئین کی بالادستی کو چیلنج کیا اور ملک میں جمہوری نظام کے تسلسل کو متاثر کیا۔ فوجی حکومتوں نے عدلیہ، الیکشن کمیشن، اور مقننہ جیسے اداروں کو کمزور کیا، جنہوں نے جمہوری عمل کو تحفظ دینا تھا۔ فوج کی مداخلت سے سیاست میں خوف کا ماحول پیدا ہوا اور سیاسی جماعتوں کے اندر آزادانہ کام کرنے کی صلاحیت محدود ہو گئی۔

ان فوجی حکمرانوں نے آئین میں اپنی ضرورت کے مطابق ترامیم کیں، جنہوں نے جمہوری ڈھانچے کو

مزید کمزور کیا۔ مثال کے طور پر، جنرل ضیاءالرحمان کے دور میں آئین میں مذہبی عنصر کو ذاتی مفادات اور اپنے لیے عوامی ہمدردی کے حصول کے لیے استعمال کیا۔

بنگلہ دیش کے آئین میں 25 جنوری 1975 کو چوتھی ترمیم کی گئی، جو شیخ مجیب الرحمان کے دور حکومت میں متعارف کرائی گئی تھی جس نے فوجی قوت کو بڑھاوا دیا۔ اس آئینی ترمیم (1975) نے بنگلہ دیش میں جمہوریت کو سخت نقصان پہنچایا اور ایک جماعتی آمریت کو فروغ دیا۔ شیخ مجیب الرحمان کے قتل (15 اگست 1975) کے بعد فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ آئندہ آنے والے فوجی حکمرانوں نے چوتھی ترمیم کے اصولوں کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انہیں اپنے اقتدار کو قانونی جواز دینے کے لیے مزید تقویت دی۔

چوتھی ترمیم کے ذریعے تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی اور صرف ایک جماعت "بنگلہ دیش کرشک سرمک عوامی لیگ" (BAKSAL) کو قانونی حیثیت دی گئی۔ ملک کے پارلیمانی نظام کو صدارتی نظام میں تبدیل کر دیا گیا۔ صدر کو پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے، آئینی ترامیم کرنے، اور کسی بھی قانون کو نافذ کرنے کا مکمل اختیار دیا گیا۔ صدر کو عدلیہ اور انتظامیہ دونوں پر مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔

اس ترمیم نے صدر کو جو غیر معمولی اختیارات دیے تھے، وہ فوجی حکمرانوں کے لیے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بنیادی تھے۔ پارلیمنٹ اور عدلیہ کو محض رسمی ادارے بنا دیا گیا۔ سیاسی جماعتوں کو دبانے اور ان پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے چوتھی ترمیم کے اصولوں کا سہارا لیا گیا۔ یہ حکمت عملی سیاسی اپوزیشن کو کمزور کرنے اور اپنی حکمرانی کو طول دینے میں مددگار ثابت ہوئی۔

بعد میں بھی چوتھی آئینی ترمیم کو براہ راست ختم کرنے کے بجائے، اس کے اثرات کو بعد ازاں ترامیم اور جمہوری اصلاحات کے ذریعے زائل کرنے کی کوشش کی گئی۔ آج بھی بنگلہ دیش کی سیاسی تاریخ میں یہ ترمیم ایک متنازع باب کے طور پر جانی جاتی ہے۔

مقامی حکومتوں کی خود مختاری کا مسئلہ

بنگلہ دیش کے آئینی بحران میں مقامی حکومتوں کی خود مختاری کا فقدان بھی ایک نمایاں مسئلہ ہے۔

آئینی طور پر مقامی حکومتوں کو اختیارات تفویض کیے گئے ہیں تاکہ نچلی سطح پر جمہوری عمل کو مضبوط بنایا جا سکے، لیکن عملی طور پر ان پر مرکزی حکومت کا کنٹرول غالب رہا ہے۔ یہ صورتحال آئینی اصولوں کی نفی کرتی ہے اور ملک میں گورننس اور جمہوریت کو متاثر کرتی ہے۔

بنگلہ دیش کے آئین میں مقامی حکومتوں کو خود مختار ادارے قرار دیا گیا ہے۔ آئین کے آرٹیکل 59 اور 60 کے تحت مقامی حکومتوں کو اپنے اختیارات کے مطابق کام کرنے اور مالیاتی فیصلے کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ ان دفعات کے مطابق مقامی حکومتیں دیہی ترقی، تعلیم، صحت، اور دیگر سماجی شعبوں میں کام کر سکتی ہیں۔ اگرچہ آئین میں اختیارات کی تقسیم واضح ہے، لیکن عملی طور پر مرکزی حکومت مقامی حکومتوں پر حاوی ہے۔ مقامی سطح پر فیصلے اکثر مرکزی حکومت کے نمائندے یا افسران کے ذریعے کیے جاتے ہیں۔ مقامی حکومتوں کے انتخابات اور انتظامیہ میں سیاسی مداخلت بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ حکمران جماعت اکثر اپنے مفادات کو ترجیح دیتی ہے، جس سے مقامی حکومتوں کی آزادی متاثر ہوتی ہے۔

مقامی حکومتوں کی کمزوری کی وجہ سے عوام کی شمولیت محدود ہو جاتی ہے۔ یہ ادارے جمہوریت کی بنیاد ہیں، لیکن ان کی عدم فعالیت عوامی مسائل کے حل میں رکاوٹ بنتی ہے۔ مرکزی حکومت کے کنٹرول کی وجہ سے بعض علاقوں کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے، جبکہ دیگر علاقوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے، جس سے علاقائی عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔

بنگلہ دیش کے بڑے شہروں جیسے ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے میئرز اکثر شکایت کرتے ہیں کہ انہیں شہری منصوبہ بندی اور ترقی میں مکمل اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ مرکزی حکومت کی مداخلت ان کے کام میں رکاوٹ بنتی ہے۔ دیہی علاقوں میں یونین پریشد جیسے مقامی حکومت کے ادارے، جنہیں دیہی ترقی کے لیے اہم سمجھا جاتا ہے، مالی وسائل کی کمی اور مرکزی حکومت کے کنٹرول کی وجہ سے مؤثر طریقے سے کام نہیں کر پاتے۔

بنگلہ دیش میں مقامی حکومتوں کی خود مختاری کا فقدان آئینی بحران کا ایک اہم پہلو ہے، جو نچلی سطح پر جمہوریت اور ترقیاتی عمل کو متاثر کرتا ہے۔ آئینی اصولوں پر عمل درآمد اور عملی اصلاحات کے ذریعے

مقامی حکومتوں کو مضبوط کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

طاقت کی تقسیم اور ریاست و شہریت کے درمیان تعلق

بنگلہ دیش کی آئینی اور سیاسی تاریخ میں طاقت کی تقسیم اور ریاست و شہریت کے درمیان تعلق کا سوال ہمیشہ اہم رہا ہے۔ جمہوری نظام میں ریاست کے مختلف ستونوں کے اختیارات کی وضاحت اور شہریوں کے ساتھ ان کے تعلقات کا توازن ایک مستحکم حکومت کے لیے ضروری ہے۔ تاہم، بنگلہ دیش میں یہ پہلو ہمیشہ سے تنازعات کا شکار رہا ہے۔

بنگلہ دیش کے آئین کے تحت طاقت کی تقسیم کو تین بڑے ستونوں میں بانٹا گیا ہے:

مقننہ :(Legislature) قانون سازی کے اختیارات پارلیمنٹ کو دیے گئے ہیں، جو عوام کی نمائندہ ہے۔ پارلیمنٹ کے ذریعے قومی پالیسیوں کا تعین اور قوانین کا نفاذ کیا جاتا ہے۔

انتظامیہ :(Executive) انتظامیہ کی قیادت وزیرِاعظم اور کابینہ کرتے ہیں، جو پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ انتظامیہ کے ذمے قوانین کا نفاذ اور ریاستی امور کی انجام دہی ہے۔

عدلیہ :(Judiciary) عدلیہ آئین کی تشریح کرتی ہے اور قوانین کے مطابق انصاف فراہم کرتی ہے۔ اسے آئینی طور پر آزاد ہونا چاہیے تاکہ وہ دیگر دو ستونوں کے اختیارات کو متوازن رکھ سکے۔

ریاست اور شہریوں کے درمیان تعلق آئین میں دیے گئے حقوق و فرائض پر مبنی ہے۔ آئین شہریوں کو بنیادی حقوق فراہم کرتا ہے، لیکن ان کے ساتھ کچھ فرائض بھی عائد کرتا ہے۔

بنگلہ دیش میں انتظامیہ کے اختیارات اکثر حد سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے پارلیمنٹ کی نگرانی کا کردار محدود ہو جاتا ہے۔ وزیرِاعظم کے دفتر کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہیں، جو طاقت کے توازن کو متاثر کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ وزیرِاعظم کے اختیارات کو محدود کر کے پارلیمنٹ کی نگرانی کے کردار کو مضبوط کیا جائے۔ عدلیہ کو سیاسی مداخلت سے پاک رکھنے کے لیے اعلیٰ عدالتی تقرریوں کے طریقۂ کار کو بھی آئین میں مزید واضح بنانے کی ضرورت ہے۔

بہر حال، بنگلہ دیش میں طاقت کی تقسیم اور ریاست و شہریت کے درمیان تعلق کے مسائل جمہوری

استحکام کے لیے ایک بڑا چیلنج ہیں۔ آئینی اصولوں پر عمل درآمد، اختیارات کے توازن کی بحالی، اور شہری حقوق کے تحفظ کے ذریعے ہی ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اصلاحات کا یہ عمل نہ صرف آئینی بحران کو کم کرے گا بلکہ عوام کا ریاست پر اعتماد بھی بحال کرے گا

خلیجی ریاستوں کے دساتیر:
سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات

خلیجی ریاستوں کی آئینی تشکیل: ماضی سے عصر حاضر تک

خلیجی ریاستوں (بحرین، کویت، عراق، عمان، قطر، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات) کی آئینی تشکیل ایک پیچیدہ اور ارتقائی عمل ہے، جو تاریخی، ثقافتی، اور سیاسی عوامل سے متاثر ہوا ہے۔ یہ خطہ قدرتی وسائل، بالخصوص تیل و گیس کی دولت سے مالا مال ہے، جو اس کے آئینی ڈھانچے اور حکمرانی کے نظام پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ خلیجی ریاستوں کے آئینی ارتقاء کو سمجھنے کے لیے ماضی سے عصر حاضر تک کے عوامل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ا۔ قبائلی نظام سے ریاستی تشکیل تک

خلیجی ریاستوں کی موجودہ آئینی تشکیل کے آغاز کو سمجھنے کے لیے ان کے قبائلی ماضی پر نظر ڈالنا اہم ہے۔ خلیجی خطہ طویل عرصے تک قبائلی معاشرت کا حامل رہا، جہاں حکمرانی قبائلی سرداروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ نظام زبانی معاہدات اور سماجی روایات پر مبنی تھا۔ خلیج کے بیشتر علاقوں میں قبائلی اتحاد نے حکمرانی کا نظام تشکیل دیا۔ سردار قبیلے کے امور کا نگراں ہوتا اور فیصلے قبائلی مشورے سے کیے جاتے۔

19ویں اور 20ویں صدی کے اوائل میں برطانیہ نے خلیجی ریاستوں کے حکمرانوں کے ساتھ معاہدے کیے، جن کے تحت حکمرانوں کی داخلی خود مختاری برقرار رہی، لیکن خارجہ اور دفاعی امور برطانیہ کے تحت آ گئے۔ 1950 کے بعد تیل کی دریافت نے خلیجی ریاستوں کی اقتصادی اور سیاسی ساخت کو بدل کر رکھ دیا۔ تیل کی دولت نے حکمران خاندانوں کو مضبوط کیا اور ان عوامی فلاح و بہبود کے منصوبے شروع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ تیل کی آمدنی نے حکمران خاندانوں کو زیادہ مضبوط بھی

بنادیا، جس کی وجہ سے مرکزیت پر مبنی آئینی نظام ابھرا۔

۲۔ابتدائی آئینی ڈھانچے

1950ور 1960 کی دہائی میں خلیجی ریاستوں نے ابتدائی آئینی قوانین متعارف کرائے، جن میں حکمران خاندانوں کے اختیارات کو قانونی تحفظ دیا گیا۔ مثلاً، 1962 میں کویت نے اپنا آئین نافذ کیا، جو خطے میں پہلا تحریری آئین تھا اور اس میں پارلیمنٹ کے قیام کی گنجائش شامل تھی۔

۳۔ 1970 کی دہائی

خلیجی ریاستوں کو 1970 کی دہائی میں آزادی ملی، جس کے بعد ان کی آئینی تشکیل میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔

1971 میں متحدہ عرب امارات، قطر، اور بحرین نے آزادی حاصل کی اور اپنے آئینی ڈھانچے تشکیل دیے۔ متحدہ عرب امارات نے 1971 میں وفاقی آئین متعارف کرایا، جس نے سات امارات کے اتحاد کو قانونی بنیاد فراہم کی۔ قطر اور بحرین نے بھی اپنے آئین متعارف کرائے جنہوں نے حکمران خاندانوں کو مرکزی حیثیت دی اور عوامی نمائندگی کی حدود طے کیں۔ سعودی عرب نے تحریری آئین کی بجائے قرآن و سنت پر مبنی حکمرانی جاری رکھی، البتہ 1970 کی دہائی میں اس کا ڈھانچہ مزید منظم ہوا۔

۴۔ 2000 کی دہائی: آئینی اصلاحات کی لہر

21ویں صدی میں خلیجی ریاستوں میں آئینی اصلاحات اور جدیدیت کی لہر آئی، جس کی وجہ بین الاقوامی دباؤ، داخلی مطالبات، اور اقتصادی تبدیلیاں تھیں۔ کویت نے اپنی پارلیمنٹ کو مزید اختیارات دیے، لیکن حکمران خاندان کے اختیارات اب بھی غالب رہے۔

2002 میں بحرین نے ایک نئے آئین کا اعلان کیا، جس نے شوریٰ کونسل اور ایوان نمائندگان کے قیام کی گنجائش فراہم کی، لیکن شیعہ اکثریتی آبادی کے تحفظات برقرار رہے۔ 2003 میں قطر نے اپنا پہلا جامع آئین متعارف کرایا، جس نے انسانی حقوق، آزادئ اظہار، اور شوریٰ کونسل کے قیام کو

قانونی تحفظ دیا۔2015 کے بعد سعودی عرب میں محمد بن سلمان کے وژن 2030 کے تحت آئینی اور سماجی اصلاحات کا آغاز ہوا، جس میں خواتین کو گاڑی چلانے کی اجازت اور دیگر سماجی تبدیلیاں شامل تھیں، لیکن حکمرانی کا نظام اب بھی مرکزیت پر مبنی ہے۔

خلیجی ریاستوں کی آئینی تشکیل کا ارتقاء تاریخی، ثقافتی، اور اقتصادی عوامل کا نتیجہ ہے۔ ماضی میں قبائلی حکمرانی سے شروع ہو کر تیل کی دولت، آزادی کے بعد کی تشکیل، اور 21ویں صدی کی اصلاحات تک، ان ریاستوں کے آئینی ڈھانچے میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ تاہم، عصر حاضر میں بنیادی حقوق، عوامی نمائندگی، اور آئینی اصلاحات کے چیلنجز ان ریاستوں کی سیاسی اور قانونی پالیسیوں کا مرکز ہیں۔ خلیجی ریاستوں کو آئینی ڈھانچے کو مزید جامع اور شفاف بنانے کے لیے اصلاحات کی ضرورت ہے تاکہ وہ عالمی معیار کے مطابق سماجی اور سیاسی ترقی کو یقینی بنا سکیں۔

۵۔ شورائی نظام اور جمہوری اصلاحات کا تضاد

خلیجی ریاستوں کے آئینی ڈھانچے میں شوریٰ کے اصول شامل ہیں، جو اسلامی روایات کے مطابق عوامی مشاورت اور حکومتی فیصلوں میں اجتماعی سوچ کو اہمیت دیتے ہیں۔ تاہم، عملی طور پر جمہوری نمائندگی اور شفافیت کا فقدان ان اصولوں کو کمزور کرتا ہے۔ شوریٰ نظام کو اسلامی طرز حکمرانی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے اور خلیجی ریاستوں کے آئین میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سعودی آئین (بنیادی نظام حکومت) میں شوریٰ کو ایک اہم اصول کے طور پر شامل کیا گیا ہے، لیکن یہ شوریٰ کونسل حکمران کی مرضی سے نامزد کردہ اراکین پر مشتمل ہے اور اس کے پاس قانون سازی کے بجائے محض مشاورتی اختیارات ہیں۔

قطر کے آئین میں شوریٰ کونسل کے قیام کی بات کی گئی ہے، لیکن عوامی نمائندگی محدود ہے، اور عملی طور پر زیادہ تر فیصلے امیر کی صوابدید پر مبنی ہوتے ہیں۔

کئی خلیجی ریاستوں میں شوریٰ کونسل یا پارلیمنٹ کے لیے انتخابات کا عمل بہت محدود ہے۔ مثال کے طور پر کویت کی پارلیمنٹ خلیجی ریاستوں میں نسبتاً مضبوط ہے، لیکن حکمران خاندان کے فیصلے اکثر پارلیمانی منظوری کے بغیر بھی نافذ ہو جاتے ہیں۔ بحرین میں پارلیمنٹ کے لیے انتخابات منعقد ہوتے

ہیں، لیکن حکومتی پالیسیاں بادشاہ کی مرضی پر منحصر رہتی ہیں، اور اہم فیصلے پارلیمانی منظوری کے بغیر ہی کیے جاتے ہیں۔ شوریٰ کونسلز کو قانون سازی کے اختیارات بھی نہیں دیے گئے، جس کے نتیجے میں حکمران خاندانوں کی طرف سے نافذ کردہ قوانین پر کسی قسم کی بحث یا عوامی شمولیت ممکن نہیں ہوتی۔

خلیجی ریاستوں کو شوریٰ اور جمہوریت کے درمیان توازن قائم کرنے کے لیے آئینی اصلاحات کی ضرورت ہے۔

شوریٰ کونسلز میں انتخابات کو یقینی بنا کر عوامی شراکت داری کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ شوریٰ نظام اور جمہوری اصلاحات کے درمیان توازن پیدا کرنے سے خلیجی ریاستوں کے آئینی بحران کو مؤثر طریقے سے حل کیا جاسکتا ہے، اور یہ سیاسی استحکام اور معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

۶۔ آئینی ترامیم کا فقدان

خلیجی ریاستوں کے آئین زیادہ تر 20ویں صدی کے وسط میں تشکیل دیے گئے، جب یہ ممالک نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہو کر جدید ریاستی ڈھانچے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد سے ان دساتیر میں ترامیم یا اصلاحات کا عمل انتہائی محدود اور سست رہا ہے۔

خلیجی ممالک میں حالیہ دہائیوں میں تیزی سے سماجی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، خاص طور پر خواتین کے حقوق، نوجوانوں کے کردار، اور تارکین وطن کی بڑھتی ہوئی تعداد کے حوالے سے۔ تاہم، آئین میں ان تبدیلیوں کی عکاسی نہیں ہوتی۔ سعودی عرب میں حالیہ برسوں میں خواتین کو کئی نئے حقوق دیے گئے، جیسے ڈرائیونگ کی اجازت اور سرپرستی کے نظام میں نرمی، لیکن یہ اقدامات آئینی ترامیم کی بجائے شاہی احکامات پر مبنی تھے۔ ایسے ہی خلیجی ریاستیں تیل پر انحصار کم کرنے کے لیے اقتصادی اصلاحات کر رہی ہیں، لیکن آئینی ڈھانچے میں ان اصلاحات کے لیے مطلوبہ تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ متحدہ عرب امارات نے اپنی معیشت کو متنوع بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے، لیکن اماراتی آئین میں وفاقی اور مقامی حکومتوں کے معاشی کردار کے حوالے سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔

۷۔ نسلی اقلیتوں اور تارکین وطن کے حقوق

خلیجی ریاستوں کے آئین میں مقامی شہریوں کے حقوق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، لیکن تارکین وطن اور نسلی اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے واضح اور جامع ہدایات کی کمی ایک اہم آئینی بحران کو جنم دیتی ہے۔ خلیجی ریاستیں عالمی سطح پر اقتصادی ترقی کے لیے مشہور ہیں اور یہاں دنیا بھر سے تارکین وطن آکر کام کرتے ہیں، لیکن ان کا قانونی تحفظ اور حقوق کا تعین اکثر غیر یقینی اور محدود رہتا ہے۔ سعودی عرب اور قطر نے حالیہ برسوں میں کفیل نظام میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں، لیکن مکمل اصلاحات کے لیے آئینی تبدیلی ضروری ہے۔

خلیجی ریاستوں کے دساتیر کی خصوصیات

خلیجی ریاستوں کے آئینی ڈھانچے اور قوانین میں بہت سی ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو انہیں خطے کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی ضروریات کے مطابق بناتی ہیں۔ ان دساتیر نے حکومتی ڈھانچے کو مستحکم کرنے، عوامی فلاح و بہبود کے منصوبے بنانے، اور خطے میں استحکام کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ خصوصیات ان ریاستوں کے تاریخی پس منظر، ثقافتی روایات، اور موجودہ عالمی ضروریات کے امتزاج کی عکاسی کرتی ہیں۔

۱۔ اسلامی اصولوں پر مبنی آئینی ڈھانچہ

خلیجی ریاستوں کے دساتیر کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ اسلامی اصولوں اور شریعت کو بنیادی رہنما کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ تمام خلیجی ریاستوں کے آئین میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ شریعت یا اسلامی قانون قانون سازی کی بنیاد ہوگا۔

۲۔ ثقافتی اقدار کی ترویج

دساتیر میں اسلامی اصولوں کو فروغ دے کر معاشرتی اقدار کی حفاظت کا عزم ظاہر کیا گیا ہے، جو خلیجی ریاستوں کے ثقافتی تسلسل کو برقرار رکھنے میں مددگار ہے۔ آئینی طور پر ثقافتی ورثے، عربی زبان، اور اسلامی اقدار کے فروغ کو یقینی بنایا گیا ہے۔

۳۔ وفاقی نظام اور امارات کی خود مختاری

متحدہ عرب امارات جیسی ریاستوں کے آئین میں وفاقی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے، جو مختلف امارات کو خود مختاری دیتا ہے اور ان کے مقامی فیصلوں کی آزادی کو یقینی بناتا ہے۔

۴۔ وفاقی اور مقامی حکومتوں کا توازن

آئینی نظام وفاقی حکومت اور اماراتی حکمرانوں کے درمیان اختیارات کا واضح توازن پیش کرتا ہے، جس سے ہر امارت اپنی مقامی پالیسیاں بنا سکتی ہے۔

۵۔ اقتصادی ترقی کے لیے ہموار ی

خلیجی ریاستوں کے دساتیر نے تیل اور گیس کی دولت کو دانشمندی سے استعمال کرتے ہوئے اقتصادی ترقی کو فروغ دینے کی راہیں ہموار کی ہیں۔

۶۔ قانونی استحکام

آئینی ڈھانچے میں معاشی استحکام اور سرمایہ کاری کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا ہے، جس کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے خلیج ایک پر کشش خطہ بن گیا ہے۔ ان ریاستوں کے آئین میں سرمایہ کاری کے تحفظ، کاروباری آزادی، اور معیشت کی ترقی کے اصولوں کی باقاعدہ وضاحت کی گئی ہے۔

۷۔ رفاہی ریاست کا تصور

تیل کی آمدنی کو آئینی بنیادوں پر عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں، جیسے تعلیم، صحت، اور انفراسٹرکچر، پر خرچ کرنے کو یقینی بنایا گیا ہے۔

۸۔ سماجی استحکام اور قبائلی روایتوں کا امتزاج

خلیجی ریاستوں کے دساتیر میں جدید آئینی اصولوں کے ساتھ مقامی قبائلی روایات کا امتزاج شامل ہے، جو خطے کے سماجی ڈھانچے کو مضبوط بناتا ہے۔ آئین میں قبائلی سرداروں اور مقامی سماجی ڈھانچوں کے احترام کو یقینی بنایا گیا ہے، جو عوامی اعتماد کو برقرار رکھنے میں مددگار ہے۔ عمان میں روایتی قبائلی مشاورت کو آئینی حیثیت حاصل ہے، جس سے عوام اور حکومت کے درمیان تعلق مضبوط ہوتا ہے۔

۹۔ شوریٰ کے اصولوں کا نفاذ

دساتیر میں شوریٰ یا مشاورت کو حکمرانی کا ایک اہم اصول بنایا گیا ہے، جو حکمرانوں کو عوامی رائے کو اہمیت دینے کی ترغیب دیتا ہے۔

۱۰۔ عالمی معیارات کے ساتھ ہم آہنگی

خلیجی ریاستوں کے دساتیر نے کئی ایسے اصول اپنائے ہیں جو بین الاقوامی قوانین اور معیارات کے مطابق ہیں، خاص طور پر اقتصادی اور انسانی حقوق کے حوالے سے۔

۱۱۔ بین الاقوامی معاہدوں کی پاسداری

خلیجی ریاستیں آئینی طور پر کئی بین الاقوامی معاہدوں کی پابند ہیں، جو انسانی حقوق، مزدوروں کے حقوق، اور ماحولیاتی تحفظ جیسے شعبوں میں اصلاحات کو فروغ دیتے ہیں۔

۱۲۔ سماجی اصلاحات کی گنجائش

دساتیر میں وقت کے ساتھ تبدیلیوں اور اصلاحات کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ سماجی اور اقتصادی حالات کے مطابق قانون سازی کی جاسکے۔

۱۳۔ تعلیم کا فروغ

خلیجی ریاستوں کے آئین میں تعلیم کو عوام کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے اور حکومت کو مفت اور معیاری تعلیم فراہم کرنے کا پابند بنایا گیا ہے۔

خلیجی ریاستوں کے دساتیر میں کئی خصوصیات موجود ہیں جو انہیں خطے کی سیاسی، سماجی، اور اقتصادی ضروریات کے لیے موزوں بناتی ہیں۔ اسلامی اصولوں پر مبنی آئینی ڈھانچہ، وفاقی اور مقامی حکومتوں کے توازن، اقتصادی ترقی کے لیے سازگار ماحول، قبائلی روایات اور جدید اصولوں کا امتزاج، اور عالمی معیارات کے ساتھ ہم آہنگی ان دساتیر کی اہم خوبیاں ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے خلیجی ریاستیں نہ صرف خطے میں بلکہ عالمی سطح پر بھی استحکام اور ترقی کی مثال بنی ہوئی ہیں۔ تاہم، ان دساتیر کو مزید جامع اور عوامی نمائندگی کے پہلو سے بہتر بنانے کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔

ملائیشیا کا آئین: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات

بادشاہت سے جڑا آئینی بحران

ملائشیا کا آئینی بحران سب سے زیادہ بادشاہت اور جمہوریت کے اختیارات کے درمیان عدم توازن سے جڑا ہوا ہے۔ ملائشیا کے آئینی بحران میں بادشاہت اور جمہوریت کے درمیان توازن ایک بنیادی نکتہ ہے، جو ملکی سیاست میں کئی بار اہم تنازعات کا باعث بنا ہے۔

ملائشیا کی بادشاہت منفرد نوعیت کی حامل ہے کیونکہ یہ دنیا کے چند منتخب ممالک میں شامل ہے جہاں گردشی بادشاہت کا نظام رائج ہے۔ ملائشیا میں نو ریاستیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا اپنا بادشاہ یا سلطان ہے۔ ان میں سے ہر پانچ سال بعد ایک سلطان کو ملک کے بادشاہ (یانگ دی پرتوان آگونگ) کے طور پر منتخب کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کا کردار آئینی طور پر محدود ہے، اور وہ زیادہ تر رسمی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں، جیسے وزراء کی تعیناتی کی منظوری دینا، پارلیمنٹ کی تحلیل یا تحلیل کے بعد نئے انتخابات کا اعلان کرنا۔

بادشاہت کے ساتھ، ملائشیا ایک پارلیمانی جمہوری نظام پر مبنی ہے، جہاں وزیر اعظم کا عہدہ سب سے طاقتور ہوتا ہے۔ آئین بادشاہت کو ایک رسمی حیثیت دیتا ہے، لیکن کئی مواقع پر بادشاہ کو مخصوص حالات میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، جیسے کسی سیاسی بحران کے دوران وزیر اعظم کی تقرری۔

ملائشیا میں بادشاہت اور جمہوریت کے درمیان اختیارات کی کشمکش کے کئی نمایاں واقعات ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پہ:

وزیر اعظم مہاتیر محمد کے استعفے (2020) کے بعد کوئی واضح اکثریتی جماعت نہ ہونے کی وجہ سے بادشاہ نے ایک آزادانہ فیصلہ کرتے ہوئے محی الدین یاسین کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ اس فیصلے کو کئی حلقوں نے جمہوریت کی روح کے خلاف قرار دیا کیونکہ پارلیمنٹ میں محی الدین کی اکثریت غیر یقینی تھی۔

2021 میں اس وقت کے وزیر اعظم محی الدین نے پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کی تجویز دی، لیکن بادشاہ نے اسے مسترد کر دیا۔ یہ فیصلہ پارلیمانی جمہوریت کے تناظر میں غیر معمولی تھا کیونکہ عمومی طور پر بادشاہ کو ایسی تجاویز پر عمل کرنا ہوتا ہے۔

اختیارات کی تقسیم

ملائشیا کے آئینی بحران میں وفاقی اور ریاستی اختیارات کی تقسیم بھی ایک اہم مسئلہ ہے، جو کئی بار انتظامی تنازعات اور آئینی چیلنجز کا باعث بنتا ہے۔

ملائشیا ایک وفاقی ریاست ہے، جہاں اختیارات وفاقی حکومت اور تیرہ ریاستوں کے درمیان تقسیم ہیں۔ مرکزی حکومت کو زیادہ تر اختیارات حاصل ہیں، جیسے خارجہ امور، دفاع، تعلیم، مالیات، اور داخلی سلامتی۔ ریاستوں کو محدود مگر کئی اہم اختیارات دیے گئے ہیں، خاص طور پر زمین، زراعت، اور مذہبی معاملات کے حوالے سے۔ نو ریاستوں میں بادشاہت کا نظام ہے، اور ہر ریاست کا اپنا آئینی سربراہ ہوتا ہے۔

ملائشیا کا آئین وفاقی اور ریاستی اختیارات کی تقسیم کے لیے ایک فہرست فراہم کرتا ہے۔

وفاقی فہرست :(Federal List)ان امور کا احاطہ کرتی ہے جن پر وفاقی حکومت کا مکمل اختیار ہے، جیسے تجارت، مواصلات، اور مالی پالیسیاں۔

ریاستی فہرست :(State List)ریاستوں کے دائرہ اختیار میں آنے والے معاملات، جیسے مذہبی امور، زمین، اور مقامی قوانین۔

مشترکہ فہرست :(Concurrent List)کچھ امور پر وفاق اور ریاست دونوں کو قانون سازی کا اختیار ہے، جیسے فلاح و بہبود اور عوامی صحت۔

وفاقی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم پر تنازعات نے کئی بار آئینی بحران پیدا کیے ہیں۔ ریاستی حکومتیں خاص طور پر قدرتی وسائل جیسے تیل اور گیس پر اپنے اختیارات کا دعویٰ کرتی ہیں، جبکہ وفاقی حکومت ان پر کنٹرول چاہتی ہے۔ صباح اور سراواک، جو قدرتی وسائل سے مالا مال

ریاستیں ہیں، کئی دہائیوں سے وفاقی حکومت کے ساتھ وسائل کی تقسیم پر تنازعے میں ہیں۔ ان ریاستوں کا مؤقف ہے کہ وفاقی حکومت ان کے وسائل کا غیر منصفانہ حصہ لے رہی ہے۔ 1963 کے ملائشین معاہدے کے تحت صباح اور سراواک کو خصوصی خود مختاری دی گئی تھی، لیکن ان کے اختیارات وقت کے ساتھ محدود کیے گئے، جس سے سیاسی تنازعات پیدا ہوئے۔

تعلیم اور زبان کے معاملات

تعلیم کے معاملے پر بھی تنازعات سامنے آتے ہیں، کیونکہ یہ وفاقی فہرست میں شامل ہے، لیکن ریاستیں اپنی زبان اور ثقافت کو بچانے کے لیے اسے چیلنج کرتی ہیں۔ مثال کے طور پہ، وفاقی حکومت پر چینی اور تمل اسکولوں کو مناسب فنڈنگ نہ دینے کا الزام لگایا جاتا ہے، جو کہ نسلی کشیدگی کو ہوا دیتا ہے۔

مذہبی و نسلی تنازعات

ملائشیا کے آئینی بحران میں مذہبی اور نسلی تنازعات ایک اہم اور حساس پہلو ہیں، جو ملکی سیاسی، سماجی، اور آئینی استحکام پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ آئین میں تمام مذاہب اور نسلی گروہوں کے لیے مساوات کا دعویٰ کیا گیا ہے، لیکن عملی سطح پر اس دعوے کی تکمیل میں ناکامی نے کئی مسائل کو جنم دیا ہے۔

ملائشیا ایک کثیر النسلی اور کثیر المذہبی معاشرہ ہے جس میں چند اہم نسلیں رہتی ہیں۔ جیسے :

ملائی :(Malay)سب سے بڑی اکثریت، اور آئین کے تحت انہیں "بمائیپوترا" (اصل باشندے) کا درجہ حاصل ہے۔

چینی :(Chinese)دوسری بڑی کمیونٹی، جو زیادہ تر تجارت اور کاروبار میں نمایاں ہے۔

ہندوستانی :(Indian)زیادہ تر تمل نسل سے تعلق رکھنے والے افراد، جو زرعی اور صنعتی شعبے میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

مذہبی حوالے سے بھی تنوع ہے :

اسلام :ریاست کا سرکاری مذہب ہے، اور تمام ملائی افراد کو مسلمان سمجھا جاتا ہے۔

بدھ مت، عیسائیت، ہندو مت، اور دیگر مذاہب : غیر ملائی افراد کے مذہب، جنہیں آئینی طور پر مذہبی آزادی دی گئی ہے۔

ملائشیا کے آئین میں تمام شہریوں کے لیے مذہبی اور نسلی مساوات کی یقین دہانی کی گئی ہے۔ آرٹیکل 11 میں تمام افراد کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ آرٹیکل 153 میں ملائی اور دیگر مقامی باشندوں کو تعلیم، ملازمت، اور زمین کے معاملات میں خصوصی مراعات دی گئی ہیں۔ یہ شق غیر ملائی کمیونٹیز کے لیے عدم مساوات کا احساس پیدا کرتی ہے۔ ان مراعات نے چینی اور ہندوستانی کمیونٹیز میں ناراضگی پیدا کی ہے۔ اسی طرح، غیر مسلم شہری بعض اوقات شکایت کرتے ہیں کہ ان کے مذہبی معاملات میں وفاقی حکومت مداخلت کرتی ہے۔ چینی کمیونٹی تعلیم اور معیشت میں مضبوط ہے، لیکن انہیں بمائیپوترا مراعات(Bumiputera Privileges) کا حصہ نہ ملنے پر شکایت رہتی ہے۔ ہندوستانی کمیونٹی کو بھی اکثر نظرانداز کیا جاتا ہے، خاص طور پر دیہی علاقوں میں۔

شرعی اور سول قانون کا ٹکراؤ

کئی مقدمات میں شرعی اور سول قوانین کے درمیان تضاد سامنے آتا ہے، خاص طور پر جب معاملہ بین المذاہب شادی یا مذہبی تبدیلی سے متعلق ہو۔ غیر مسلموں کو اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر یا مذہبی تقریبات کے انعقاد میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ 1969 کا نسلی تنازعہ ملائشیا کی تاریخ کا سب سے خونریز واقعہ تھا، جو نسلی عدم مساوات اور سیاسی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اس واقعے کے بعد نیو اکنامک پالیسی (NEP) متعارف کروائی گئی، جس نے بمائیپوترا کے لیے اقتصادی اور تعلیمی مراعات بڑھائیں۔ مگر یہ پالیسی نسلی تفریق کو کم کرنے کے بجائے مزید گہرا کرنے کا سبب بنی۔ ماہرین کے مطابق، بمائیپوترا مراعات کے حوالے سے متوازن پالیسیوں کی ضرورت ہے جو تمام نسلی گروہوں کو فائدہ پہنچائیں۔

آئینی ترامیم کا کثرت سے استعمال

ملائشیا کے آئینی بحران میں آئینی ترامیم کا کثرت سے استعمال ایک اہم پہلو ہے، جو آئینی استحکام، سیاسی توازن، اور جمہوری اصولوں پر گہرا اثر ڈال چکا ہے۔ آئینی ترامیم کے ذریعے حکومتوں نے اپنی طاقت کو بڑھانے یا مخصوص سیاسی مفادات کو پورا کرنے کی کوشش کی، جس سے سیاسی عدم توازن اور عوام میں بے چینی پیدا ہوئی۔

ملائشیا کا آئین 1957 میں آزادی کے وقت تیار کیا گیا تھا اور اسے ایک "زندہ دستاویز" کے طور پر دیکھا گیا جو وقت کے ساتھ ترمیم کے ذریعے آگے بڑھے گا۔

آئین میں جمہوری اصولوں، بنیادی حقوق، اور وفاقی نظام کو تحفظ دینے کا عہد کیا گیا ہے۔ آئین میں ترمیم کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ملائشیا میں آئینی ترامیم کا عمل حکومتوں کی طرف سے کثرت سے کیا گیا ہے، جس کا مقصد اکثر سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنا یا مخالفین کو دبانا رہا ہے۔ 1957 سے اب تک 50 سے زائد ترامیم کی جا چکی ہیں، جو ایک غیر معمولی تعداد ہے۔ امریکہ کے آئین میں 200 سال سے زائد عرصے میں صرف 27 ترامیم کی گئی ہیں۔ ملائیشیا میں کئی ترامیم ایسی ہیں جو سیاسی ایجنڈے کو پورا کرنے یا مخصوص حکومتوں کے اقتدار کو طول دینے کے لیے کی گئیں۔ مثلاً، 1969 کے نسلی فسادات کے بعد، آئین میں ترمیم کے ذریعے آرٹیکل 10 میں ایسی شقیں شامل کی گئیں جو "حساس معاملات" پر عوامی بحث کو محدود کرتی ہیں۔ یہ ترمیم آزادی اظہار کے حق کو محدود کرنے کا باعث بنی اور سیاسی مباحثے کو دبانے کے لیے استعمال کی گئی۔

آئینی ترامیم کی کثرت نے آئین کی حیثیت کو ایک "مستقل دستاویز" کے بجائے "سیاسی ہتھیار" میں تبدیل کر دیا۔ حکومتوں نے اپنی طاقت کو طول دینے کے لیے آئین کو اکثر استعمال کیا۔ کئی ترامیم نے بنیادی حقوق، جیسے آزادی اظہار اور آزادی احتجاج، کو محدود کر دیا۔ سیڈیشن ایکٹ" اور دیگر قوانین کے ذریعے سیاسی مخالفین کو دبانے کے لیے آئینی ترامیم کا استعمال کیا گیا۔ ترامیم کے ذریعے ایگزیکٹو کو زیادہ طاقت دی گئی، جبکہ عدلیہ اور دیگر آزاد ادارے کمزور ہو گئے۔ 1988 میں مہاتیر محمد کی حکومت

نے عدلیہ کی آزادی کو محدود کیا۔

اپوزیشن اکثر اتنی مضبوط نہیں رہی کہ ان ترامیم کو روک سکے۔ عدلیہ اور دیگر ادارے بھی ترامیم کے عمل کو چیلنج کرنے میں ناکام رہے۔

ملائشیا میں آئینی ترامیم کا کثرت سے استعمال آئینی استحکام اور جمہوری اصولوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ 1971، 1983، اور 2007 کی ترامیم جیسے واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ حکومتوں نے اکثر سیاسی مفادات کے تحت آئین میں تبدیلیاں کیں۔

عدالتی تقسیم

ملائشیا میں شرعی اور سول قوانین کے درمیان تضاد ایک پیچیدہ اور اہم مسئلہ ہے، جو آئینی بحران، قانونی الجھنوں، اور سماجی تنازعات کا باعث بن رہا ہے۔ ملائشیا کے قانونی نظام کی دوہری نوعیت، جہاں شرعی عدالتیں اور سول عدالتیں دونوں موجود ہیں، اکثر ان کے دائرہ اختیار میں تصادم کا سبب بنتی ہے۔ یہ مسئلہ خاص طور پر ان معاملات میں شدید ہوتا ہے جو مذہب، خاندان، یا ذاتی حقوق سے متعلق ہوں۔

شرعی عدالتیں مسلمانوں کے ذاتی قوانین سے متعلق امور کا فیصلہ کرتی ہیں، جن میں شادی، طلاق، وراثت اور گود لینے کے معاملات شامل ہیں۔ ان عدالتوں کا دائرہ اختیار صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔ جبکہ سول عدالتیں تمام شہریوں (مسلمان اور غیر مسلم) پر لاگو ہوتی ہیں اور آئین، شہری قوانین، اور عمومی معاملات کا فیصلہ کرتی ہیں۔

شرعی اور سول عدالتوں کے دائرہ اختیار میں واضح حد بندی کا فقدان اکثر تنازعات کو جنم دیتا ہے۔ مثلاً، مذہب کی تبدیلی کے معاملات میں، جہاں ایک مسلمان مذہب تبدیل کرنا چاہتا ہے، شرعی عدالت اس پر اپنا دائرہ اختیار مانتی ہے، جبکہ سول عدالت میں بھی یہ معاملہ لایا جا سکتا ہے۔ ایسے میں عدالتوں کے فیصلے ایک دوسرے سے متصادم ہو سکتے ہیں۔

بین المذاہب شادیوں کے معاملات اکثر شرعی اور سول عدالتوں کے تصادم کا باعث بنتے ہیں۔ بچوں

کی تحویل اور مذہبی تعلیم کے معاملات مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے وراثت کے قوانین شرعی عدالتوں کے تحت آتے ہیں، جبکہ غیر مسلمانوں کے لیے سول عدالتیں فیصلے کرتی ہیں۔ ممنونہ بیبی کیس (2007) میں ایک ہندو خاتون نے دعویٰ کیا کہ اس کے شوہر نے بغیر اس کی اجازت کے اپنے بچوں کو مسلمان کر دیا۔ اس کے بعد سول اور شرعی عدالتوں کے درمیان یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ کس کا دائرہ اختیار لاگو ہوگا۔ یہ کیس عوامی توجہ کا مرکز بنا۔ اسی طرح لینا جوئے کیس (2001-2007) میں لیناجوئے، ایک مسلمان خاتون، نے اپنا مذہب تبدیل کر کے عیسائیت قبول کی اور سول عدالت میں اپنا نیا مذہبی تشخص رجسٹر کروانے کی درخواست دی۔ سول عدالت نے کہا کہ یہ معاملہ شرعی عدالت کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ اس سے مذہبی آزادی اور قانونی حدود پر ایک شدید عوامی بحث شروع ہوئی۔ یہ کیس اس بات کی علامت بن گیا کہ ملائشیا میں مذہبی تبدیلی کتنی حساس اور پیچیدہ ہے۔

ملائشیا کے آئین میں 1988 میں آرٹیکل 121 شامل کیا گیا، جس کے تحت شرعی عدالتوں کے فیصلوں کو سول عدالتوں میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اس شق نے شرعی عدالتوں کو خود مختاری تو دی، لیکن دائرہ اختیار کے تنازعات کو مزید پیچیدہ کر دیا۔

ملائشیا میں شرعی اور سول قوانین کے درمیان تضاد آئینی بحران کا ایک اہم پہلو ہے۔ دائرہ اختیار کے تنازعات، مذہبی آزادی کے مسائل، اور عدالتی پیچیدگیاں اس مسئلے کو مزید گھمبیر بناتی ہیں۔ لینا جوئے (Lina Joy) اور ممنونہ بی بی (Maimunah Bibi) جیسے مشہور کیسز ان چیلنجز کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان مسائل کا حل آئینی اصلاحات، دائرہ کار کی وضاحت، اور مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں ہے۔

ترکی کا دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات

آئینی تاریخ اور ترامیم کا سفر

خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد ترکی میں کئی آئینی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جو ملک کے سیاسی، سماجی، اور قانونی ڈھانچے میں بڑی تبدیلیوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ آئینی ارتقاء جدید ترکی کے قیام اور اس کے سیکولر، جمہوری نظام کے قیام کی بنیاد ہے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد، ترکی کی 'گرینڈ نیشنل اسمبلی' نے 1921 میں پہلا آئین منظور کیا۔ یہ آئین سادہ تھا اور زیادہ تر عبوری انتظامات پر مشتمل تھا۔ اس آئین نے پارلیمانی نظام کو بنیاد فراہم کی اور اقتدار کو عوام کے نمائندوں تک منتقل کیا۔ اس کے تحت مرکزیت کی جگہ زیادہ اختیارات مقامی حکومتوں کو دیے گئے۔ اسی آئین کے تحت مصطفیٰ کمال (اتاترک) نے جدید ترک ریاست کی تشکیل کے لیے اقدامات کیے۔

خلافت کے خاتمے کے بعد ترکی کا پہلا جامع آئین 1924 میں نافذ کیا گیا، جو جدید ترکی کا پہلا مکمل آئین تھا۔ اس میں خلافت کے خاتمے کو آئینی حیثیت دی گئی۔ سیکولرازم کی بنیاد رکھی گئی، اگرچہ یہ لفظ آئین میں شامل نہیں تھا۔ ریاستی ڈھانچے میں قانون سازی، عدلیہ، اور انتظامیہ کے شعبوں کو علیحدہ کیا گیا۔ اس کے بعد مذہب کو ریاست سے علیحدہ کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے، جیسے مدارس کی بندش اور اسلامی عدالتوں کا خاتمہ۔ خواتین کے حقوق میں اصلاحات کا آغاز کیا گیا، جن کی بدولت ترک سماج میں بڑی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔

1960 کی فوجی بغاوت کے بعد ترکی میں نیا 1961 میں وضع کردہ آئین نافذ کیا گیا۔ اس آئین میں جمہوری حقوق کو وسعت دی گئی اور شہری آزادیوں کو شامل کیا گیا۔ طاقت کے مختلف مراکز، جیسے پارلیمنٹ، عدلیہ، اور انتظامیہ، کے درمیان توازن قائم کیا گیا۔ آئینی عدالت (Constitutional Court) کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ آئین کی تشریح کی جا سکے۔ اسی آئین میں فوج کو ریاست کے

سیکولر کردار کا محافظ قرار دیا گیا۔ پھر فوج نے متعدد بار اس آئین کا سہارا لے کر حکومتوں کو برخاست کیا، جیسے 1971 اور 1980 میں۔

1980 کی فوجی بغاوت کے بعد، ترکی کا ایک اور آئین 1982 میں وضع کیا گیا جو آج تک چل رہا ہے۔ اس میں صدر کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا اور ایک مضبوط ایگزیکٹو سسٹم قائم ہوا۔ فوج کو سیاست میں نیشنل سیکیورٹی کونسل کے ذریعے زیادہ اختیارات دیے گئے۔ سیکولرازم کو مضبوط کیا گیا، البتہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں بھی عائد کی گئیں۔ عوامی آزادیوں کو محدود کیا گیا، جیسے آزادیِ اظہار اور تنظیم سازی پر سخت ضوابط لاگو ہوئے۔ اس آئین کو جمہوری سے زیادہ آمریت کی عکاسی سمجھا جاتا ہے۔ 1997 میں فوج نے اسلام پسند حکومت کو برخاست کرنے کے لیے اسی آئین کا سہارا لیا۔

2017 میں ترک عوام نے ریفرنڈم کے ذریعے ایک مرتبہ پھر آئینی ترامیم کی منظوری دی، جن کے تحت ترکی میں پارلیمانی نظام کی جگہ صدارتی نظام لایا گیا۔ وزیراعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور تمام ایگزیکٹو اختیارات صدر کو منتقل کر دیے گئے۔ پارلیمنٹ کے اختیارات کم کر دیے گئے اور عدلیہ کی آزادی متاثر ہوئی۔ صدر رجب طیب اردوان کے اختیارات میں بے پناہ اضافہ ہوا، جسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔

نئے آئین کی ضرورت کا مطالبہ

ترکی میں آئینی اصلاحات کی ضرورت پر بحث کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ موجودہ آئین، جو 1980 کی فوجی بغاوت کے بعد نافذ ہوا، ایک ایسے سیاسی نظام کی بنیاد پر بنایا گیا تھا جس میں فوجی اور سیکولر قوتوں کا غلبہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ترکی میں سماجی اور سیاسی تبدیلیوں نے اس آئین کو کئی حوالوں سے ناکافی اور غیر موزوں بنا دیا ہے۔ آئینی اصلاحات پر زور دینے والے حلقے ایک نیا آئین بنانے کی ضرورت کا مطالبہ کرتے ہیں جو جدید جمہوری اقدار، انسانی حقوق، اور ترکی کے بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں کو پورا کرے۔ تاہم، سیاسی اختلافات اور متنوع مفادات کی وجہ سے ایک جامع آئینی معاہدہ اب تک ممکن نہیں ہو سکا۔

موجودہ آئین کو اکثر "فوجی آئین" کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ 1982 میں اس وقت نافذ کیا گیا جب ترکی کی

فوجی قیادت نے جمہوری حکومت کو معزول کر دیااور ایک نیا آئین تشکیل دیا۔اس آئین کا مقصد فوجی اداروں کو مضبوط بنانااور سیاسی نظام کو فوج کے کنٹرول میں رکھنا تھا۔ یہ آئین جمہوری اقدار کی حمایت کے بجائے طاقت کے ارتکاز اور سیکولر نظریات کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے۔آئین میں فوج کو قومی سلامتی کا ضامن قرار دیا گیا ہے۔اس آئین کے تحت اختیارات کی مرکزیت اور حکومتی کنٹرول نے عوامی اور علاقائی خود مختاری کو محدود کیا ہے۔خاص طور پر کرد علاقوں میں اس مرکزیت نے سیاسی تنازعات کو جنم دیا۔ 2000 کی دہائی میں اصلاحات کے باوجود، آئین میں کئی ایسی شقیں موجود ہیں جو فوجی اداروں کے اثر ورسوخ کی حمایت کرتی ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق، جیسے کرد اور علوی کمیونٹی کے حقوق، آئینی طور پر تسلیم کیے جانے چاہییں۔نئے آئین میں اختیارات کی تقسیم اور ادارہ جاتی توازن کو یقینی بنانا ضروری ہے۔ترکی یورپی یونین میں شمولیت کا خواہاں ہے، اور موجودہ آئین یورپی جمہوری معیارات سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (AKP) ایک اسلامی رجحان رکھنے والی جماعت ہے جو آئینی تبدیلی کی حامی ہے۔ لیکن حزب اختلاف کی سیکولر جماعتیں نہیں چاہتیں کہ یہ اصلاحات رجب طیب اردغان کی ترجیحات کے مطابق ہوں۔ کرد حقوق اور دیگر اقلیتی مسائل پر سیاسی جماعتوں کے درمیان گہرے اختلافات ہیں، جو آئینی اصلاحات کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ عوامی سطح پر بھی ایک نیا آئین بنانے کی حمایت موجود ہے، لیکن آئین کے خدوخال اور ترجیحات پر کوئی واضح اتفاق رائے نہیں۔

ترکی کے عوام کی اکثریت ایک ایسے آئین کی حمایت کرتی ہے جو حقوق اور آزادیوں کو وسعت دے اور سیاسی استحکام کو یقینی بنائے۔تاہم، سیاسی تقسیم، اقلیتی مسائل، اور مختلف مفادات کی وجہ سے نیا آئین بنانا ایک مشکل چیلنج بن چکا ہے۔ ترکی میں آئینی اصلاحات کی کامیابی ملک کے جمہوری استحکام، عوامی اعتماد، اور بین الاقوامی حیثیت پر گہرے اثرات ڈال سکتی ہے۔

اقلیتی و نسلی حقوق کا مسئلہ

ترکی کے آئین میں اقلیتی حقوق اور نسلی تنازعات طویل عرصے سے ایک سنگین مسئلہ رہے ہیں، جو نہ صرف داخلی استحکام بلکہ بین الاقوامی سطح پر ترکی کی ساکھ پر بھی اثرانداز ہوئے ہیں۔ ترک آئین میں

ترک قومیت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اکثریتی ترک آبادی کی شناخت کو ریاستی ڈھانچے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں دیگر اقلیتوں، خصوصاً کردوں، کے حقوق کو محدود کیا گیا ہے۔

ترکی کا آئین ترک قومیت (Turkish identity) کو ملک کی بنیادی شناخت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ترکی کے آئین میں، "ہر شہری ترک ہے" کی شق شامل ہے، جو ملک میں موجود مختلف نسلی گروہوں کی شناخت کو تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے۔ آئین میں اقلیت کی تعریف صرف غیر مسلم اقوام تک محدود ہے، جو کہ لوزان معاہدے (1923) کے تحت تسلیم شدہ ہیں، جیسے کہ آرمینیائی، یونانی، اور یہودی اقلیتیں۔ کرد، عرب، لاز، اور دیگر مسلمان اقلیتوں کو آئینی طور پر اقلیت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

کرد جیسے بڑے نسلی گروہ کو ترکی کی اکثریتی ترک شناخت کے ساتھ ضم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو ان کی زبان، ثقافت، اور سیاسی خود مختاری کے مطالبات کا راستہ مسدود کرتی ہے۔ کرد ترکی کی سب سے بڑی نسلی اقلیت ہیں، جو تقریباً 15-20 فیصد آبادی پر مشتمل ہیں۔ 1982 کے آئین کے تحت کرد زبان کے استعمال پر ملک میں کئی دہائیوں تک پابندی رہی۔ سرکاری تعلیم اور میڈیا میں کرد زبان کے استعمال پر پابندی عائد تھی، جو کہ ایک بڑے نسلی طبقے کے لیے ثقافتی محرومی کا سبب بنی۔ کردوں کی نمائندگی کرنے والی جماعتیں اکثر پابندیوں کا شکار رہیں۔ کردستان ورکرز پارٹی جیسے مسلح گروہوں کے خلاف کارروائیوں کے دوران عام کرد عوام کے حقوق متاثر ہوئے۔ 1990 کی دہائی میں، کرد بستیوں میں فوجی آپریشنز کے دوران لاکھوں افراد بے گھر ہوئے۔ 2016 کے بعد کرد اکثریتی علاقوں میں مقامی بلدیاتی نمائندوں کو معطل کر کے ان کی جگہ دوسرے سرکاری افسران کو تعینات کیا گیا۔ حکومت نے کردوں کو اکثر علیحدگی پسند یا دہشت گرد کے طور پر پیش کیا۔ 1980 کی فوجی بغاوت کے بعد کردوں کے حقوق پر سختی کی گئی، جس سے کرد تنازعہ مزید شدت اختیار کر گیا۔ 2013 میں کرد زبان میں تعلیم کی اجازت دی گئی، لیکن یہ اقدامات محدود اور ناکافی سمجھے جاتے ہیں۔

ترک عوام کے اندر اقلیتوں کے لیے رائے تقسیم کا شکار ہے؛ کچھ لوگ ان کے حقوق کے حامی ہیں، جب کہ دیگر انہیں ریاست کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ ملک کے اندر نسلی تنازعات نے ترکی کے مشرقی

اور جنوب مشرقی علاقوں میں ترقی کو متاثر کیا ہے، جہاں زیادہ تر کرد آباد ہیں۔ عوامی رائے، ریاستی بیانیہ، اور بین الاقوامی دباؤ کے امتزاج نے ترکی میں اقلیتوں کے حقوق کو ایک متنازع اور اہم مسئلہ بنا دیا ہے، جسے آئین میں حل کرنا ضروری ہے۔

آئین کا سیکولر کردار اور مذہبی عناصر

ترکی کا آئین تاریخی طور پر سیکولر اصولوں پر مبنی رہا ہے، جو مصطفیٰ کمال اتاترک کے دور کی اصلاحات کا نتیجہ ہیں۔ تاہم، ترکی کی عوامی زندگی میں مذہب کی گہری جڑوں اور مذہبی عناصر کی مسلسل موجودگی کے باعث سیکولر اور مذہبی حلقوں کے درمیان تنازعات نے آئین کی تشریح اور نفاذ کو متنازع بنا دیا ہے۔ یہ تنازعہ ترکی کی سیاست، سماجی معاملات، اور آئینی قوانین پر نمایاں اثر ڈال رہا ہے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد 1923 میں جمہوریہ ترکی کے قیام کے ساتھ ہی مصطفیٰ کمال اتاترک نے سیکولرزم کو ریاست کا بنیادی اصول بنایا۔ مذہبی قوانین کو ختم کر کے سوئس سول کوڈ جیسے جدید قانونی نظام نافذ کیے گئے۔ مدارس کو ختم کر کے سیکولر تعلیمی نظام رائج کیا گیا۔ مذہبی لباس پر پابندیاں لگائی گئیں، خاص طور پر ریاستی اداروں میں۔ آئین کا آرٹیکل 2 ترکی کو "ایک سیکولر اور جمہوری ریاست" قرار دیتا ہے۔ مذہب کو ریاستی اداروں میں شامل کرنے یا مذہبی قوانین نافذ کرنے پر پابندی عائد ہے۔

آئین میں سیکولرازم کے غلبے کے باوجود، ترکی کی ایک بڑی مسلم اکثریت نے سیکولر اصولوں کو ہمیشہ قبول نہیں کیا۔ مذہبی جماعتوں اور گروہوں نے ریاستی اداروں میں مذہب کی شمولیت کا ہمیشہ مطالبہ کیا۔ خواتین کے حجاب، اذان کی عربی زبان میں واپسی، اور مذہبی اسکولوں کے فروغ جیسے معاملات تنازعات کا سبب بنے۔ 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں سیکولر حکومتوں نے ریاستی اداروں، یونیورسٹیوں، اور دیگر عوامی جگہوں پر حجاب پہننے پر پابندی عائد کی تھی۔ یہ اقدامات سیکولرازم کو مضبوط کرنے کے لیے کیے گئے، لیکن انہیں مذہبی حلقوں کی جانب سے مسلم خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا گیا۔ جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (AKP) نے 2000 کی دہائی میں حجاب پر پابندیاں ختم کر دیں، جس سے سیکولر حلقوں میں شدید ردعمل پیدا ہوا۔ 2013 میں یونیورسٹیوں اور

سرکاری دفاتر میں خواتین کو حجاب پہننے کی اجازت دی گئی۔ مذہبی اسکولوں (امام حاطب مدارس) کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ نصاب میں مذہبی تعلیم شامل کرنے کے فیصلے پر بھی سیکولر حلقے تنقید کرتے ہیں۔

آئینی عدالت سیکولر اصولوں کی محافظ سمجھی جاتی ہے۔ 2008 میں رجب طیب اردغان حکومت کو آئینی عدالت نے مذہبی رجحانات کی بنا پر تحلیل کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ ناکام رہی۔ مذہبی جماعتوں کی سیاسی شراکت سیکولر حلقوں کے لیے ہمیشہ ایک حساس معاملہ رہی ہے۔ جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی پر اکثر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ آئین کے سیکولر اصولوں کو کمزور کر رہی ہے۔

عوامی رائے بھی سیکولر اور مذہبی رجحانات کے درمیان تقسیم ہے۔ دیہی علاقوں میں مذہبی رجحانات زیادہ ہیں، جہاں لوگ AKP جیسے مذہبی رجحانات رکھنے والی جماعتوں کی حمایت کرتے ہیں۔ شہری علاقوں میں سیکولر اقدار کی حمایت زیادہ ہے، خاص طور پر استنبول، انقرہ، اور ازمیر جیسے شہروں میں۔

ترکی کے آئین کا سیکولر کردار اور مذہبی عناصر کے درمیان یہ تنازعہ ایک اہم سیاسی اور سماجی مسئلہ ہے۔ حجاب جیسے حساس معاملات، تعلیمی اداروں میں مذہب کی شمولیت، اور آئین کی تشریح پر اختلافات نے ترکی کی سیاست اور عوامی زندگی کو گہرے اثرات سے دوچار کیا ہے۔ اس تنازعے کے حل کے لیے ایک جامع اور متوازن آئینی اصلاح کی ضرورت ہے، جو سیکولر اور مذہبی حلقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر سکے اور ترکی کو ایک جدید جمہوری ریاست کے طور پر مستحکم کرے۔

مصر کا دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات

سیاسی جماعتوں کے لیے محدود آزادی

مصر میں سیاسی جماعتوں کے حوالے سے دستور میں سخت پابندیاں عائد رہی ہیں، جن کا مقصد زیادہ تر حکمران جماعت کی اجارہ داری کو برقرار رکھنا اور اپوزیشن کو محدود کرنا تھا۔ 1971 کا آئین، جو صدر انور السادات کے دور میں بنایا گیا، اس میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل کو محدود کیا گیا تھا اور جماعتوں کے قیام کے لیے سخت قوانین بنائے گئے تھے۔ ان قوانین کے تحت سیاسی جماعتوں کو حکومت کی جانب سے منظوری لینا لازمی تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران جماعت (نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی) کے علاوہ دیگر جماعتوں کی تشکیل کو مشکل بنا دیا گیا۔ 1977 میں سیاسی جماعتوں کا قانون منظور ہوا، جس کے تحت نئے سیاسی گروہوں کی رجسٹریشن کو انتہائی پیچیدہ بنایا گیا اور ان کی سرگرمیوں کو کڑی نگرانی میں رکھا گیا۔

حسنی مبارک کے دور حکومت میں یہ نظام مزید سخت ہو گیا۔ 1980 کی آئینی ترامیم نے سیاسی جماعتوں کے قیام کے عمل کو مزید پیچیدہ کر دیا اور مذہبی یا نسلی بنیادوں پر جماعتوں کی تشکیل کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔ اس دوران اخوان المسلمون جیسے گروہوں کو غیر قانونی قرار دے کر سیاسی میدان سے باہر رکھا گیا۔ مزید برآں، حزب اختلاف کی جماعتوں کو حکومتی دباؤ، مالیاتی رکاوٹوں، اور ان کے رہنماؤں کی گرفتاری جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مظاہروں، جلسوں، اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندیوں نے اپوزیشن کی آزادی کو مزید محدود کر دیا، جبکہ سرکاری میڈیا کے ذریعے حکمران جماعت کو مکمل حمایت فراہم کی جاتی رہی۔

مصر کے آئین اور قوانین میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل اور ان کی سرگرمیوں پر عام طور پہ متعدد پابندیاں عائد رہی ہیں، جو سیاسی تنوع اور جمہوری عمل کے فروغ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ یہ پابندیاں

مختلف قانونی، آئینی، اور عملی اقدامات کے ذریعے سیاسی جماعتوں کو محدود کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں نہ صرف اپوزیشن کی موثر موجودگی کمزور ہوتی ہے بلکہ جمہوری نظام بھی غیر مستحکم ہوتا ہے۔

آئین میں پابندی عائد ہے کہ مذہبی، نسلی، یا جغرافیائی بنیادوں پر سیاسی جماعتیں قائم نہیں کی جا سکتیں۔ اگرچہ اس شرط کا مقصد قومی یکجہتی کو فروغ دینا ہے، لیکن اس کا استعمال اکثر سیاسی تنوع کو دبانے کے لیے کیا گیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو حکومت سے منظوری لینا لازمی ہے، جس میں حکومتی مداخلت کی جاتی ہے۔ نئے سیاسی گروہوں کو رجسٹریشن میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، خاص طور پر اگر وہ حکومت مخالف نظریات رکھتے ہوں۔

2014 کے آئین کے تحت مذہب کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کا قیام ممنوع قرار دیا گیا، جس کی وجہ سے اخوان المسلمون جیسی تنظیمیں غیر قانونی قرار دی گئیں۔ 2013 میں صدر مرسی کی حکومت کے خاتمے کے بعد اخوان المسلمون کو ایک دہشت گرد تنظیم قرار دے دیا گیا، اور اس کے سیاسی بازو "فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی" کو تحلیل کر دیا گیا۔ سیاسی جماعتوں کے عوامی اجتماعات، مظاہروں، اور سیاسی فعالیت پر بھی قانونی رکاوٹیں عائد ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو اپنی فنڈنگ کے ذرائع ظاہر کرنے کا پابند بنایا گیا ہے، اور حکومتی ادارے اکثر اپوزیشن جماعتوں کے فنڈز کو روک دیتے ہیں یا ان کی تحقیقات شروع کرتے ہیں۔ 2019 کے دوران کئی اپوزیشن جماعتوں کے رہنماؤں کو بغیر کسی واضح الزام کے گرفتار کیا گیا، اور ان کی جماعتوں کی سیاسی سرگرمیاں معطل کر دی گئیں۔ سیاسی جماعتوں پر پابندیوں کی وجہ سے مصر میں جمہوری عمل محدود ہو گیا ہے۔ اپوزیشن کی غیر موجودگی حکومت کو جوابدہ بنانے کے عمل کو متاثر کرتی ہے۔

سیاسی جماعتوں کے قیام اور سرگرمیوں پر پابندیوں کو نرم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مصر میں آئینی ترامیم کی جائیں، تاکہ جمہوری عمل میں تنوع پیدا ہو۔ اسی طرح، مذہب کی بنیاد پر جماعتوں کے قیام پر پابندیوں کو ختم کر کے ان کے سیاسی کردار کو قومی دھارے میں شامل کیا جانا چاہیے، تاکہ وہ جمہوری نظام میں شراکت دار بن سکیں۔

سیاسی جماعتوں کے لیے محدود آزادی مصر کے جمہوری نظام کی ایک بڑی کمزوری ہے، جو سیاسی تنوع،

عوامی نمائندگی، اور شفافیت کو متاثر کرتی ہے۔ آئینی اور قانونی اصلاحات کے ذریعے سیاسی جماعتوں کی آزادی کو یقینی بنانا نہ صرف مصر کی سیاست کو مستحکم کرے گا بلکہ عوام کا اعتماد بحال کرنے میں بھی معاون ہو گا

اختیارات کی غیر متوازن تقسیم

1952 کے انقلاب کے بعد، مصر میں اختیارات کی تقسیم کا ڈھانچہ بنیادی طور پر صدر کے گرد گھومتا تھا۔ 1971 کے آئین میں صدر کو ریاست کا سربراہ، حکومت کا قائد، اور مسلح افواج کا سپریم کمانڈر قرار دیا گیا۔ اس آئین کے تحت صدر کو وسیع اختیارات حاصل تھے، جن میں قانون سازی، ایمرجنسی نافذ کرنے، اور وزراء کی تقرری شامل تھی، جبکہ پارلیمنٹ اور عدلیہ کے کردار کو محدود رکھا گیا تھا۔ پارلیمنٹ، اگرچہ آئینی طور پر قانون سازی کا اختیار رکھتی تھی، لیکن عملی طور پر صدر کی منظوری کے بغیر کوئی بھی اہم قانون نافذ نہیں ہو سکتا تھا۔ عدلیہ کو آئینی طور پر آزاد قرار دیا گیا، لیکن ججوں کی تقرری اور عدالتی نظام پر صدر اور ایگزیکٹو کے اثر و رسوخ نے اس کی آزادی کو کمزور کر دیا تھا۔

حسنی مبارک کے تین دہائیوں پر مشتمل دور حکومت (1981-2011) میں اختیارات کی غیر متوازن تقسیم مزید نمایاں ہوئی۔ 1980 کی آئینی ترامیم کے ذریعے ایمرجنسی اختیارات کو مزید مضبوط کیا گیا، جس کے تحت صدر کو پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر غیر معینہ مدت کے لیے ایمرجنسی نافذ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس دوران پارلیمنٹ صدر کی پارٹی (نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی) کے زیر اثر رہی، اور اپوزیشن جماعتوں کو محدود اختیارات دیے گئے۔ عدلیہ کو کبھی کبھار آزادی سے کام کرنے کی اجازت دی گئی، جیسے 2000 کی دہائی میں انتخابات کی نگرانی، لیکن مجموعی طور پر عدلیہ صدر کے اختیارات کو چیلنج کرنے سے قاصر رہی۔ یہ غیر متوازن نظام حسنی مبارک کی آمریت کا سبب بنا، جس کا 2011 کی عوامی تحریک کے نتیجے میں زوال ہوا۔

مصر میں آئینی طور پر ریاست کے تین اہم ستون، یعنی صدر، پارلیمنٹ، اور عدلیہ، کے اختیارات کی تقسیم غیر متوازن ہے۔ یہ عدم توازن ایک طویل سیاسی تاریخ اور آئینی ترامیم کا نتیجہ ہے، جس نے صدر کو مرکزی حیثیت دی، جبکہ پارلیمنٹ اور عدلیہ کو نسبتاً کمزور کیا۔

مصر کے آئین میں صدر کو غیر معمولی اختیارات دیے گئے ہیں، جو سیاسی نظام میں ان کی بالادستی کو یقینی بناتے ہیں:

- صدر کو پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر قانون سازی کے اختیارات حاصل ہیں، خاص طور پر ایمرجنسی کی حالت میں۔
- صدر کو وزراء، گورنرز، اور اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کی تقرری اور برطرفی کا مکمل اختیار حاصل ہے۔
- صدر مسلح افواج کے سپریم کمانڈر ہیں اور فوجی پالیسیوں اور بجٹ پر حتمی اختیار رکھتے ہیں۔
- آئین کے تحت، صدر کو ہنگامی حالات میں پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر ایمرجنسی نافذ کرنے کا اختیار حاصل ہے، جسے اکثر سیاسی اختلافات دبانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔
- پارلیمنٹ، جو عوامی نمائندگی کی علامت ہے، آئینی طور پر کمزور اور صدر کے اثر و رسوخ کے تابع ہے۔
- پارلیمنٹ صدر کی جانب سے پیش کیے گئے قوانین پر مہر ثبت کرنے کا کردار ادا کرتی ہے۔
- پارلیمنٹ کو صدر یا ان کے وزراء کو مؤثر طور پر احتساب کے دائرے میں لانے کا اختیار نہیں ہے۔
- اعلیٰ عدالتی مناصب پر تقرریاں صدر کی منظوری سے مشروط ہیں۔

اختیارات کی غیر متوازن تقسیم مصر کے سیاسی نظام کی ایک بنیادی کمزوری ہے، جو سیاسی عدم استحکام، جمہوری عمل کی ناکامی، اور عوامی اعتماد کے فقدان کا سبب بنتی ہے۔ آئینی اور ادارہ جاتی اصلاحات کے ذریعے اس عدم توازن کو دور کیا جا سکتا ہے، جو مصر کو ایک مستحکم اور مضبوط جمہوری ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

فوج کا کردار

مصر کے آئین میں فوج کو ایک طاقتور اور خود مختار ادارہ تسلیم کیا گیا ہے، جسے ریاست کی حفاظت، داخلی استحکام، اور خارجہ پالیسی کے حوالے سے اہم کردار دیا گیا ہے۔ فوج کا یہ کردار کئی دہائیوں سے مصر کی

سیاست، معیشت، اور گورننس میں مرکزیت رکھتا ہے۔ آئینی ترامیم کے ذریعے فوج کے اختیارات کو مزید مضبوط کیا گیا۔

آئینی دفعات میں فوج کے کردار کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

- آئین میں فوج کو ریاست کی خود مختاری، سلامتی، اور جغرافیائی سرحدوں کے تحفظ کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔
- فوج کے مالی معاملات پارلیمنٹ یا حکومت کے دائرہ کار سے باہر ہیں، اور بجٹ کی منظوری بھی پارلیمان سے باہر داخلی طور پر کی جاتی ہے۔
- آئین فوج کو اپنے داخلی امور کے حوالے سے خود مختار عدالتی نظام رکھنے کی اجازت دیتا ہے، جس میں عام شہریوں کو بھی فوجی عدالتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔
- 1971 کے آئین میں فوج کو ریاست کی سلامتی اور استحکام کا ضامن قرار دیا گیا۔
- 2012 کے آئین میں فوج کے اختیارات کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ فوج کے بجٹ اور داخلی معاملات پر پارلیمنٹ کی نگرانی کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ تاہم، فوج نے اس آئین کی مخالفت کی، اور جلد ہی اسے ختم کر دیا گیا۔

2014 کے آئین (صدر عبدالفتاح السیسی کا دور) فوج کے اختیارات میں مزید نمایاں اضافہ کیا گیا۔ فوج کو آئینی طور پر "ریاست کا محافظ" قرار دیا گیا، جس میں داخلی اور خارجی استحکام شامل ہے۔ فوجی عدالتوں کے دائرہ کار کو بڑھا کر عام شہریوں پر بھی لاگو کیا گیا۔ آئینی شق 234 کے تحت، وزیر دفاع کا تقرر فوجی قیادت کی منظوری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آئین میں فوج کے معاشی معاملات کی خود مختاری کا ذکر نہیں، لیکن مصر میں عملی طور پر فوج کا ایک وسیع کاروباری نیٹ ورک موجود ہے، جو آئینی تحفظ کے تحت سیاسی مداخلت سے محفوظ ہے۔ فوج ملک کے کئی بڑے انفراسٹرکچر اور ترقیاتی منصوبوں میں شامل ہے۔

غیر مؤثر آئینی عدالت

مصر میں آئینی عدالت کو آئینی تنازعات کو حل کرنے، قوانین کے جائزے، اور آئین کے تحفظ کے

لیے ایک اہم ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم، آئینی طور پر آزاد ہونے کے باوجود، اس کے فیصلوں کا اثر عملی طور پر محدود رہتا ہے۔ عدالت کے فیصلے اکثر سیاسی دباؤ اور فوجی اداروں کے اثر و رسوخ کی زد میں آ جاتے ہیں، جس کے باعث جمہوری نظام کی شفافیت اور عدالتی خود مختاری متاثر ہوتی ہے۔ آئینی عدالت کے فیصلے، جو حکومتی پالیسیوں یا قوانین کے خلاف ہوں، عموماً نافذ نہیں کیے جاتے یا ان پر عمل درآمد کو دانستہ طور پر تاخیر کا شکار کیا جاتا ہے۔

چونکہ مصر کے سیاسی نظام میں فوج اور ایگزیکٹو کا کردار انتہائی طاقتور رہا ہے، اور یہ اثر آئینی عدالت کے فیصلوں پر بھی واضح نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر، 2012 میں آئینی عدالت نے پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کا فیصلہ سنایا، جس کی وجہ یہ تھی کہ پارلیمانی انتخابات غیر آئینی طریقے سے ہوئے تھے۔ اس فیصلے کے بعد، فوج نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ اختیارات حاصل کیے، اور عبوری حکومت کے فیصلوں پر اثر انداز ہوئی۔ عدالت کے اس فیصلے کو عوامی سطح پر جمہوری عمل کے خلاف سمجھا گیا، جبکہ فوج نے اس کا استعمال اپنے اختیارات کو مزید مستحکم کرنے کے لیے کیا۔ 2016 میں جب آئینی عدالت نے سعودی عرب کو تیران اور صنافیر جزائر منتقل کرنے کے حکومتی معاہدے کو غیر آئینی قرار دیا۔ اس کے باوجود، حکومت نے عدالت کے فیصلے کو نظرانداز کرتے ہوئے معاہدے کو برقرار رکھا۔

مصر میں آئینی عدالت کے فیصلوں کے محدود اثرات کا سب سے بڑا نقصان جمہوری نظام کو ہوتا ہے۔ یہ رویہ جمہوری عمل کی شفافیت اور ریاستی اداروں کی ساکھ کو متاثر کرتا ہے۔ مزید برآں، عدالت کے فیصلے اکثر سیاسی اختلافات کو دبانے یا حکومتی پالیسیوں کو قانونی حیثیت فراہم کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، جس سے عدالت کی غیر جانبداری مشکوک ہو جاتی ہے۔

اس مسئلے کا حل عدلیہ کی خود مختاری کو مضبوط بنانا اور آئینی عدالت کے فیصلوں پر عمل درآمد کو یقینی بنانا ہے۔ فوجی اور ایگزیکٹو اداروں کی مداخلت کو کم کیے بغیر عدالتی فیصلوں کا اثر بڑھانا ممکن نہیں۔ آئینی عدالت کو واقعی آزاد بنانے کے لیے قانونی اور آئینی اصلاحات ضروری ہیں تاکہ وہ سیاسی دباؤ سے آزاد ہو کر اپنے فیصلے نافذ کر سکے۔

پاکستان کا دستور: سیاسی و قانونی مسائل اور خصوصیات

پاکستان کے آئینی بحرانوں کی تاریخ

پاکستان کی آئینی تاریخ مختلف بحرانوں سے بھری ہوئی ہے، جنہوں نے ریاست کی سیاسی، سماجی، اور ادارہ جاتی ترقی کو متاثر کیا۔ ان بحرانوں کا آغاز قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ہو گیا جب نوزائیدہ ریاست کو ایک جامع اور قابل عمل آئین کی ضرورت تھی، لیکن یہ ضرورت فوری طور پر پوری نہ ہو سکی۔ آئینی بحرانوں کی وجوہات میں قیادت کی ناکامی، سیاسی جماعتوں کی کمزوری، فوجی مداخلت، عدلیہ کی غیر جانبداری کا فقدان، اور نظریاتی اختلافات شامل ہیں۔ یہ بحران نہ صرف ملکی استحکام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے بلکہ عوام کے آئینی نظام پر اعتماد کو بھی متزلزل کرتے رہے۔

پاکستان کو ابتدا میں حکومتِ ہند ایکٹ 1935 کو عبوری آئین کے طور پر اپنانا پڑا، جو ایک نوآبادیاتی ڈھانچہ رکھتا تھا اور نئے ریاستی مقاصد کے مطابق نہیں تھا۔ آئین سازی میں تاخیر کی بڑی وجہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نمائندگی کے مسائل اور نظریاتی اختلافات تھے۔ مشرقی پاکستان کی اکثریتی آبادی بنگالی زبان کو سرکاری حیثیت دینے اور مساوی حقوق کا مطالبہ کرتی تھی، جبکہ مغربی پاکستان کے حکمران طبقے ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھے۔ اس کا نتیجہ 1954 میں اسمبلی کی تحلیل کی صورت میں نکلا، جسے عدلیہ نے مولوی تمیز الدین کیس میں جواز فراہم کیا۔

1956 میں پہلا آئین تو منظور ہوا، لیکن یہ زیادہ دیر تک نافذ نہیں رہا۔ 1958 میں صدر اسکندر مرزا نے آئین معطل کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا اور جنرل ایوب خان کو اقتدار منتقل کیا۔ اس واقعے نے پاکستان میں آئینی عمل کی جڑوں کو ہلا دیا اور فوج کو سیاست میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ 1962 میں ایوب خان نے ایک نیا آئین متعارف کروایا، جو صدارتی نظام پر مبنی تھا اور جمہوری اصولوں کے بجائے ایک مرکزی قیادت پر انحصار کرتا تھا۔ یہ آئین سیاسی قوتوں کے درمیان تناؤ کا باعث بنا اور عوام کی

جانب سے اسے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

1971 میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا آئینی اور سیاسی بحران تھا۔ 1970 کے انتخابات میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں واضح اکثریت حاصل کی، لیکن مغربی پاکستان کے حکمران طبقے نے انہیں اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر دیا۔ آئینی بحران اس وقت مزید سنگین ہو گیا جب مشرقی پاکستان میں سیاسی مطالبات کے بجائے فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا گیا، جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ یہ واقعہ اس بات کی واضح مثال ہے کہ آئینی بحرانوں کو طاقت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کیسے تباہ کن نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

1973 میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے ایک نیا آئین منظور کیا، جو پاکستان کا موجودہ آئین ہے۔ لیکن 1977 میں بھٹو حکومت کے خلاف تحریک کے بعد جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کیا اور آئین کو معطل کر دیا۔ آئینی بحران اس وقت پیدا ہوا جب عدلیہ نے "نظریہ ضرورت" کے تحت ضیاء الحق کے اقدامات کو جائز قرار دیا۔ آئین میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے صدر کو اضافی اختیارات دیے گئے، جس سے پارلیمانی نظام کمزور ہوا اور صدارتی مداخلت کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ بحران پاکستان میں جمہوریت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

2007 میں جنرل پرویز مشرف کے دور میں آئینی بحران نے ایک نئی شکل اختیار کی، جب انہوں نے عدلیہ کو برطرف کیا اور ایمرجنسی نافذ کی۔ وکلاء تحریک اور عوامی احتجاج کے بعد آئینی بحران مزید گہرا ہو گیا۔ 18ویں ترمیم (2010) کے ذریعے آئین میں صوبائی خودمختاری دی گئی، لیکن اس ترمیم نے مرکز اور صوبوں کے درمیان طاقت کی تقسیم میں نئے چیلنجز پیدا کیے۔ آئینی بحران کا ایک اور پہلو فوجی اسٹیبلشمنٹ کا سیاسی معاملات میں مداخلت اور عدلیہ کے کردار پر سوالات ہیں، جو جمہوری عمل کو متاثر کر رہے ہیں۔

بحران، عملی یا نظری؟

پاکستان کے آئینی بحران سے جڑے مسائل کا تجزیہ کرتے وقت یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ بحران نہ صرف عملی ہیں بلکہ ایک حد تک نظری معاملات سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ نظری سطح پر، آئین کی

تشریح اور اس کے بنیادی اصولوں پر اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ آئین کے تحت پاکستان کو ایک اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا ہے، لیکن اسلامی اور جمہوری اصولوں کے درمیان توازن قائم کرنے میں ہمیشہ مشکل پیش آتی رہی ہے۔ یہ نظریاتی اختلاف سیاسی، مذہبی، اور سماجی سطح پر تنازعات کو جنم دیتا ہے، جو آئینی ڈھانچے کو متاثر کرتے ہیں۔

عملی مسائل ان نظری اختلافات کے اطلاق میں زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ آئینی اقدار کو نظرانداز کرنا، اختیارات کی غیر مساوی تقسیم، اور سیاسی قیادت کی ناکامی عملی سطح پر آئینی بحرانوں کو جنم دیتے ہیں۔ 18ویں ترمیم کے باوجود، مرکز اور صوبوں کے تعلقات میں مسلسل کھچاؤ اور مالیاتی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اس کی بڑی مثال ہیں۔ اسی طرح، آئینی اداروں جیسے عدلیہ، مقننہ، اور انتظامیہ کے درمیان طاقت کی کشمکش نے آئینی اصولوں کی عملی حیثیت کو متاثر کیا۔ عدالتوں کی جانب سے آئینی ترامیم کی معطلی یا پارلیمنٹ کی غیر فعال قانون سازی جیسے مسائل آئین کے عملی پہلو پر سوالیہ نشان کھڑے کرتے ہیں۔

یہ نظری اور عملی مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کا ایک دوسرے پر گہرا اثر ہے۔ جب نظریاتی سطح پر آئینی اصولوں پر اتفاق نہ ہو، تو ان اصولوں کا عملی اطلاق بھی مشکلات کا شکار ہوتا ہے۔ ان بحرانوں کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نظریاتی اختلافات کو کم کرنے کے لیے مکالمے کو فروغ دیا جائے اور آئینی اصولوں کے عملی نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے شفاف اور مستحکم نظام تشکیل دیا جائے۔

ریاست و شہریت کے مابین توازن

پاکستان کے دساتیر میں ریاست اور شہریت کے درمیان طاقت اور حقوق کے توازن کی صورتحال ہمیشہ ایک مسئلہ رہی ہے۔ 1956 کے آئین سے لے کر 1973 کے آئین تک، ریاست کو طاقتور بنانے اور عوامی حقوق کو متوازن کرنے کی کوششیں کی گئیں، لیکن عملی طور پر یہ توازن مکمل طور پر حاصل نہ ہو سکا۔ ابتدائی آئین میں شہریوں کو بنیادی حقوق فراہم کیے گئے، لیکن ان حقوق پر ریاست کی حاکمیت ہمیشہ غالب رہی۔ مثال کے طور پر، 1962 کے آئین میں بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی تھی، لیکن

فوجی حکمران ایوب خان کے دور میں سیاسی آزادیوں پر قدغن لگائی گئی، اور عوام کو اپنے حقوق تک رسائی میں عملی طور پر محدود کر دیا گیا۔

1973 کا آئین شہریوں کے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے ایک اہم سنگ میل تھا، کیونکہ اس میں بنیادی انسانی حقوق، آزادی اظہار، مذہبی آزادی، اور مساوات کو آئینی تحفظ دیا گیا۔ تاہم، ریاست کی طاقت میں اضافے اور شہری آزادیوں پر قدغنوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ضیاء الحق کے مارشل لا کے دوران آئینی ترامیم کے ذریعے ریاست کے اختیار کو بڑھایا گیا اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے نام پر شہری آزادیوں کو محدود کیا گیا۔ مثال کے طور پر، خواتین اور اقلیتوں کے حقوق پر پابندیاں عائد کی گئیں، جس سے ریاست اور شہریوں کے درمیان حقوق کا توازن متاثر ہوا۔

حالیہ دہائیوں میں، جمہوری حکومتوں نے شہری حقوق کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ 18ویں ترمیم کے ذریعے صوبائی خود مختاری اور مالیاتی تقسیم کا نظام بہتر بنایا گیا۔ تاہم، عملی سطح پر شہری حقوق کے نفاذ میں اب بھی کئی مسائل موجود ہیں۔ عدلیہ، انتظامیہ، اور مقننہ کے اختیارات میں کشمکش اور ریاستی اداروں کی جانب سے شہری آزادیوں کی خلاف ورزی، جیسا کہ میڈیا پر پابندیاں اور اظہار رائے کی آزادی میں کمی، اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ توازن کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔

آئینی بحرانوں میں عدلیہ کا کردار

پاکستان کی آئینی تاریخ میں عدلیہ نے کئی مواقع پر ایسے فیصلے دیے جو نہ صرف آئین کی تشریح بلکہ سیاسی بحرانوں کا سبب بنے۔ تاہم، یہ کردار ہمیشہ یکساں مثبت نہیں رہا بلکہ بعض اوقات عدلیہ پر آئین کی بالادستی کے بجائے طاقتور حلقوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کا الزام بھی لگا۔

پاکستان میں عدلیہ کا سب سے زیادہ متنازع کردار "نظریۂ ضرورت (Doctrine of Necessity) " کے نفاذ کے ذریعے سامنے آیا۔ 1954 میں مولوی تمیز الدین کیس میں اس وقت کے چیف جسٹس محمد منیر نے گورنر جنرل غلام محمد کی جانب سے آئین ساز اسمبلی کی تحلیل کو جائز قرار دیا۔ یہ فیصلہ پاکستانی آئینی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوا، کیونکہ اس نے نہ صرف آئینی عمل کو کمزور کیا بلکہ فوج اور بیوروکریسی کو آئینی معاملات میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ بعد ازاں، 1958 میں جنرل ایوب خان

کی فوجی بغاوت اور 1977 میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کو بھی عدلیہ نے "نظریۂ ضرورت" کے تحت جائز قرار دیا۔ یہ فیصلے آئین کی بالادستی کے بجائے طاقتور حلقوں کے حق میں دیے گئے اور آئینی بحرانوں کو مزید گہرا کرنے کا باعث بنے۔

عدلیہ نے آئینی ترامیم کے حوالے سے بھی متنازع کردار ادا کیا ہے۔ 1973 کے آئین میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ترامیم کے ذریعے جمہوری نظام مضبوط کیا گیا، لیکن 1977 میں جنرل ضیاء الحق نے آٹھویں ترمیم کے ذریعے صدارتی اختیارات کو بڑھا دیا، جسے عدلیہ نے قبول کیا۔ اسی طرح، 1990 کی دہائی میں سپریم کورٹ نے بارہا آئینی معاملات میں مداخلت کی، خاص طور پر صدر اور وزیر اعظم کے درمیان جاری تنازعات میں۔ 1993 میں، سپریم کورٹ نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے استعفوں کا راستہ ہموار کیا، جو ایک سیاسی بحران کا حل نکالنے کے بجائے عدلیہ کی غیر جانبداری پر سوالات اٹھانے کا باعث بنا۔

2007 میں جنرل پرویز مشرف کے دور میں عدلیہ نے ایک بار پھر آئینی بحران میں اہم کردار ادا کیا۔ حالیہ برسوں میں بھی عدلیہ کے کردار پر سوالات اٹھے، جب بعض فیصلے سیاسی جماعتوں کے حق یا مخالفت میں دیے گئے۔ عدلیہ کے متنازع کردار نے سیاسی استحکام پر منفی اثر ڈالا اور آئینی بحرانوں کو حل کرنے کے بجائے پیچیدہ بنا دیا۔

پاکستان کے آئینی بحرانوں میں سیاستدانوں کا کردار

پاکستان کی آئینی تاریخ میں سیاستدانوں کا کردار نہایت اہم اور بعض اوقات متنازع رہا ہے۔ سیاستدانوں نے جہاں آئینی وقار کی بحالی میں حصہ لیا، وہیں کئی مواقع پر ان کے ذاتی مفادات، باہمی اختلافات، اور غیر جمہوری رویوں نے آئینی بحرانوں کو بھی جنم دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد 1947 سے 1956 تک آئین کی تشکیل نہ ہو سکی، جس کی بنیادی وجہ سیاستدانوں کے درمیان اختلافات اور اقتدار کی رسہ کشی تھی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے نمائندے آئین کے خدوخال پر متفق نہ ہو سکے، خاص طور پر زبان، طاقت کی تقسیم، اور اسلامی یا سیکولر ریاست کے سوال پر اختلافات گہرے تھے۔ مثال کے طور پر، 1954 میں آئین ساز اسمبلی کو گورنر جنرل غلام محمد نے

تحلیل کر دیا، جس کی ایک بڑی وجہ سیاستدانوں کی نااتفاقی اور مؤثر قیادت کا فقدان تھا۔

1970 میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ایک اہم سبب سیاسی قیادت کا غیر لچکدار رویہ اور آئین پر اتفاق نہ ہونا تھا۔ شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے اکثریتی نشستیں حاصل کیں، لیکن ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر مغربی پاکستانی سیاستدانوں نے اقتدار کی منتقلی میں رکاوٹیں ڈالیں، جس سے ایک آئینی بحران نے جنم لیا اور ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ مزید برآں، 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے کے خلاف غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کیے، جس سے جمہوری عمل کمزور ہوا اور آئین بارہا معطل یا تبدیل ہوا۔

سیاستدانوں نے آئینی ترامیم کو بھی اکثر اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے استعمال کی۔ 1973 کے آئین کی منظوری کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے ترامیم کے ذریعے اختیارات کو مرکز میں جمع کر دیا۔ بعد ازاں، 1985 میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں آٹھویں ترمیم نے صدارتی اختیارات کو بڑھایا، جسے بعد میں سیاستدانوں نے اپنے حق میں استعمال کیا۔ 1999 میں نواز شریف نے تیرہویں ترمیم کے ذریعے صدر کے اختیارات کو محدود کیا، لیکن یہ ترامیم اکثر سیاسی مفادات کے تحت کی گئیں، جنہوں نے آئینی عمل کی شفافیت پر سوال اٹھائے۔

طاقت کی تقسیم

1947 میں قیامِ پاکستان کے بعد سے لے کر آج تک، ملک میں بننے والے تین دساتیر (1956، 1962، اور 1973) نے طاقت کی تقسیم کے اصول وضع کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن بہر حال ان میں موجود کئی چیلنجز اور تنازعات نے آئینی استحکام کو متاثر کیا۔

1956 کا آئین پاکستان کا پہلا آئینی ڈھانچہ تھا، جس میں طاقت کی تقسیم کا تصور موجود تھا، لیکن حقیقت میں یہ ایک مضبوط مرکزیت کی عکاسی کرتا تھا۔ اس آئین میں اختیارات زیادہ تر وفاق کے پاس تھے، جب کہ صوبے محدود خود مختاری رکھتے تھے۔ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) نے اس مرکزیت پر شدید تحفظات کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات پیدا ہوئے۔ 1962 کا آئین صدر ایوب خان کے دور میں نافذ کیا گیا اور اس میں صدارتی نظام متعارف

کرایا گیا، جس نے اختیارات کو مزید مرکزیت دی۔ صدر کو وسیع اختیارات دیے گئے، جب کہ پارلیمنٹ اور عدلیہ کے کردار کو محدود کر دیا گیا۔ اس آئین نے طاقت کے توازن کو مکمل طور پر ایک شخص کے حق میں جھکا دیا، جس نے سیاسی بے چینی اور عوامی ردعمل کو جنم دیا۔

1973 کا آئین پاکستان کا پہلا متفقہ آئین تھا، جس نے طاقت کی تقسیم کے حوالے سے واضح اصول وضع کیے۔ اس میں پارلیمانی نظام حکومت کو اپنایا گیا، جہاں اختیارات کا منبع پارلیمنٹ کو قرار دیا گیا، اور صدر کا کردار علامتی رہ گیا۔ آئین نے وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کو متوازن کرنے کے لیے مشترکہ فہرست (Concurrent List) متعارف کرائی، لیکن اس فہرست میں شامل اختیارات اکثر مرکز کے حق میں جھکاؤ رکھتے تھے۔

18ویں ترمیم (2010) نے طاقت کی تقسیم میں ایک بڑا انقلاب برپا کیا۔ مشترکہ فہرست کو ختم کر دیا گیا، اور کئی اختیارات صوبوں کو منتقل کیے گئے۔ اس ترمیم نے وفاقیت کے اصول کو مضبوط کیا، لیکن عملی طور پر صوبوں کو مالی اور انتظامی معاملات میں چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان میں آئینی طور پر طاقت کا توازن واضح ہے، لیکن عملی طور پر اداروں کے درمیان کشمکش برقرار رہی ہے۔ عدلیہ، فوج، اور مقننہ اکثر اوقات ایک دوسرے کے دائرہ کار میں مداخلت کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، عدلیہ نے کئی مواقع پر آئینی ترامیم اور پارلیمانی اختیارات کو چیلنج کیا، جب کہ فوج نے غیر آئینی طور پر مداخلت کر کے طاقت کے توازن کو بگاڑا۔ سیاستدانوں نے طاقت کی تقسیم اور توازن کے لیے قابلِ قدر کوششیں کی ہیں، لیکن یہ مسئلہ اب بھی مکمل طور پر حل نہیں ہوا۔ طاقت کے توازن کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام ادارے اپنی آئینی حدود کا احترام کریں اور مرکز و صوبوں کے درمیان اعتماد سازی کو فروغ دیا جائے۔

آئینی خصوصیات

مسائل اور مشکلات کے باوجود، اگر موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کا آئین باقی مسلم دنیا کے دساتیر کے مقابلے میں کئی حوالوں سے بہتر اور جامع ہے، خاص طور پر جمہوری اصولوں، اسلامی اقدار، اور وفاقی نظام کو یکجا کرنے کے حوالے سے۔ پاکستان کے آئین کی ایک اور خصوصیت اس کا

وفاقی نظام ہے، جو صوبائی خود مختاری اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بناتا ہے۔ 18ویں آئینی ترمیم نے اس خصوصیت کو مزید مضبوط کیا، جس کے تحت تعلیم، صحت، اور دیگر اہم امور صوبوں کو منتقل کیے گئے۔ یہ پہلو کئی مسلم ممالک میں ناپید ہے، جہاں زیادہ تر اختیارات مرکز میں مرتکز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، مصر اور ترکی جیسے ممالک میں مرکزیت پسند نظام غالب ہے، جو صوبائی یا علاقائی سطح پر خود مختاری کے لیے زیادہ گنجائش نہیں چھوڑتا۔ پاکستان کا آئین وفاقی نظام کے ذریعے مختلف قومیتوں اور علاقوں کو ایک آئینی فریم ورک میں باندھنے کی کامیاب کوشش ہے۔ مزید برآں، آئین میں اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام، شریعت کے مطابق قوانین بنانے کی گنجائش، اور اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت شامل ہیں، جو اسے مسلم دنیا کے کئی دیگر دساتیر سے ممتاز بناتے ہیں۔ پاکستان کا آئین دو انتہاؤں کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کرتا ہے، جس میں اسلامی تعلیمات کو بھی تحفظ دیا گیا ہے اور جمہوری اداروں کی تشکیل اور استحکام پر بھی زور دیا گیا ہے۔

تین بڑے مسائل

پاکستان کے آئینی بحران کے حل کے لیے تین اہم مسائل کو فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پہلا مسئلہ مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا ہے۔ 18ویں ترمیم کے بعد کئی اختیارات صوبوں کو منتقل کیے گئے، لیکن انتظامی صلاحیت کی کمزوری، این ایف سی ایوارڈ پر تنازعات اور مالی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم نے مرکز اور صوبوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا کی ہے۔

دوسرا مسئلہ آئینی اداروں کے کردار میں غیر ضروری مداخلت کا ہے۔ پاکستان میں پارلیمنٹ، عدلیہ، اور فوج جیسے ادارے اکثر اپنے دائرہ کار سے تجاوز کرتے ہیں، جس سے آئینی نظام متاثر ہوتا ہے۔ عدلیہ کی جانب سے سیاسی معاملات میں مداخلت اور آئینی ترامیم کی معطلی، فوج کے مارشل لا کے نفاذ، اور سیاسی جماعتوں کے درمیان عدم اتفاق نے جمہوری عمل کو نقصان پہنچایا ہے۔ آئینی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آئینی اداروں کے درمیان طاقت کا توازن قائم کیا جائے، قانون کی بالادستی کو یقینی بنایا جائے، اور آئینی حدود کے احترام کو فروغ دیا جائے۔

تیسرا مسئلہ اقلیتوں اور انسانی حقوق کے تحفظ کا ہے۔ آئین اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے، لیکن

عملی طور پر ان کے حقوق اکثر نظرانداز ہوتے ہیں۔ توہینِ مذہب کے قوانین اور دیگر قانونی مسائل اقلیتوں کے خلاف استعمال کیے جاتے ہیں، جبکہ خواتین اور دیگر پسماندہ طبقات کے لیے مساوی مواقع کی عدم موجودگی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ان مسائل کے حل کے لیے آئینی اصلاحات، قوانین پر مؤثر عمل درآمد، اور انسانی حقوق کے فروغ کے لیے سماجی آگاہی کی مہم چلانا ضروری ہے۔ ان تینوں مسائل کو حل کیے بغیر ملک میں ایک مستحکم اور منصفانہ آئینی نظام کا قیام ممکن نہیں ہو گا۔

پاکستان کے دستور کا اسلامی تشخص

پاکستان کے قیام کے بعد ابتدائی چند سالوں میں آئینی بحرانوں کا آغاز ہوا۔ آزادی کے بعد پاکستان کو ایک مستقل آئین کی ضرورت تھی، لیکن 1947 میں کوئی واضح آئین موجود نہیں تھا۔ اس دوران گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کو عبوری آئین کے طور پر نافذ کیا گیا۔ یہ ایک قانونی فریم ورک تھا جو اس وقت تک پاکستان کی آئینی ضرورتوں کو پورا کرتا رہا، مگر اس کے اندر وہ لچک اور سیاسی جواز نہیں تھا جو ایک آزاد ریاست کے لیے ضروری تھا۔ اس عبوری آئین کی موجودگی کے باوجود پاکستان میں آئینی بحران اس لیے بڑھا کیونکہ یہ ملک کی خاص ضروریات اور مقاصد کے مطابق نہیں تھا، اور اس میں عوام کی براہ راست شراکت کا فقدان تھا۔

پاکستان کا پہلا آئین 1956 میں منظور ہوا، جو ایک اہم آئینی سنگ میل تھا۔ لیکن اس آئین کی منظوری اور اس کے نفاذ میں جو طریقہ کار اپنایا گیا، وہ بھی آئینی بحران کو دور کرنے میں ناکام رہا۔ اس آئین کو ایک آئین ساز اسمبلی نے تشکیل دیا تھا جس کے اراکین کا انتخاب براہ راست عوامی رائے دہی سے نہیں ہوا بلکہ یہ بالواسطہ طور پر صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے منتخب ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عوامی رائے اور سیاسی نمائندگی کی نوعیت محدود تھی، اور اس آئین کے ذریعے ایک ایسا سیاسی نظام تشکیل دیا گیا جو ملک کی مختلف قوموں اور سیاسی جماعتوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ نتیجتاً، یہ آئین تین سال سے زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا اور 1958 میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

1962 میں ایوب خان نے ایک نیا آئین تشکیل دیا جس میں جمہوری اصولوں سے زیادہ حکومتی طاقت اور استحکام کو اہمیت دی گئی۔ یہ آئین ایوب خان کی آمریت کو آئینی جواز فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا اور اس کا مقصد ملک میں سیاسی استحکام لانا تھا۔ تاہم، اس آئین میں عوامی نمائندگی کی کمی تھی کیونکہ قومی اسمبلی کے اراکین بالواسطہ انتخاب کے ذریعے منتخب ہوئے تھے۔ اس آئین کے تحت سیاسی جماعتوں کی آزادی کو محدود کیا گیا اور ایوب خان کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اس آئین کی بنیادی

کمی یہ تھی کہ یہ ایک مرکزیت پسند حکومتی نظام پر زیادہ زور دیتا تھا، جس سے صوبوں اور مختلف سیاسی گروپوں کو مناسب نمائندگی نہیں مل سکی۔

1973 کا آئین پاکستان کے آئینی بحران سے نکلنے کی ایک کوشش تھی کیونکہ یہ آئین قومی اسمبلی کے براہ راست منتخب نمائندوں نے بنایا تھا اور اس میں جملہ سیاسی جماعتوں کی تائید بھی حاصل تھی۔ اس آئین کی منظوری کے بعد پاکستان میں ایک آئینی استحکام کا امکان پیدا ہوا، لیکن عملی طور پر یہ آئین بھی مسلسل بحرانوں کا شکار رہا۔ دو مرتبہ اس آئین کو معطل کیا گیا، اور یہ آئین کبھی بھی مکمل طور پر اپنے مقاصد کو حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس آئین میں پاکستان کے مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی تناظرات کی مکمل عکاسی نہیں کی گئی۔

اصلاحات کی ضرورت اور متعدد مسائل کے باوجود 1973 کا آئین پاکستان کی تاریخ کا سب سے جامع اور بہتر آئین ہے۔ اس کی تدوین میں تمام سیاسی، عوامی اور مذہبی نمائندگان کو حصہ دیا گیا اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ آئین ملک کی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے ساتھ مذہبی تشخص کو بھی بہت حد تک تسلیم اور نمایاں کرتا ہے۔ اسے مسلم ممالک کے بہترین اسلامی دساتیر میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس آئین میں ذکر کردہ اسلامی شناخت سے متعلق چند اہم دفعات وامور کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں آزادی کے بعد اسلامی دستور کی تشکیل اور اس کے نفاذ کے حوالے سے مختلف علماء اور مذہبی جماعتوں کی جانب سے کئی دستوری سفارشات پیش کی گئیں۔ ان سفارشات میں پاکستان کے آئین کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے اور اسلامی شریعت کو بنیادی قانونی فریم ورک بنانے کی کوششیں شامل ہیں۔ ان سفارشات کا مقصد ملک کی سیاست اور قانون سازی کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ اسلام سے متعلق علماء کی ان دستوری سفارشات کو 1956ء کے دستور میں کچھ زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ 1962ء کے دستور میں تو انہیں بالکل ہی قابل توجہ نہیں سمجھا گیا۔ لیکن 1973ء کے اصل دستور اور اس کی موجودہ شکل کا جائزہ لینے سے جو صورت حال سامنے آئی ہے، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

دیباچہ

دستور کے دیباچے میں یہ اقرار کیا گیا ہے کہ تمام کائنات پر اللہ تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ ہے اور پاکستان کے عوام اللہ کی مقررہ حدود میں رہتے ہوئے نیابتی اختیارات استعمال کریں گے[1]۔

ریاست کا نام

ریاست کا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' قرار دیا گیا[2]۔

ریاست کا مذہب

دستور کے ابتدائی حصے میں ریاست کا مذہب (State Religion) اسلام قرار دیا گیا[3]۔

قرارداد مقاصد

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں منظور کی گئی قرارداد مقاصد، 1973ء کے دستور میں بھی بطور دیباچہ موجود ہے[4]۔ یہ قرارداد اصل دستور کے قابل عمل حصے میں شامل نہیں تھی۔ بعد میں اسے ایک صدارتی فرمان کے ذریعے دستور کا حصہ بنایا گیا[5]۔

تقریر و اظہار کی آزادی مشروط بہ اسلام

جمہوری ملکوں میں شہریوں کا حقِ اظہار ان ملکوں کی پیشانی کا جھومر ہوا کرتا ہے۔ وطن عزیز کے دستور میں بھی اس حق کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے اسے اسلام کی عظمت (Glory of Islam) سے مشروط رکھا گیا[6]۔

---

[1] ملاحظہ ہو، تمہید (Pre-emble) دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان 1973ء

[2] دستور پاکستان 1973ء، آرٹیکل 1

[3] ایضاً، آرٹیکل 2

[4] ملاحظہ ہو، اصل دستور پاکستان 1973ء

[5] صدارتی فرمان 14 مجریہ 1985ء

[6] ایضاً، آرٹیکل 19

اسلامی طرز زندگی کی ضمانت

کاروبار مملکت کے رہنما اصول (Principles of Policy) بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ مسلمانان پاکستان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھالنے پر اقدامات کئے جائیں گے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کی جائیں گی جن کے بموجب وہ قرآن و سنت کے مطابق زندگی کا تصور سمجھنے کے اہل ہو سکیں[7]۔

اسلامیات کا اہتمام

ریاست کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دے۔ عربی سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرے۔ ایسی سہولتیں مہیا کرے کہ قرآن مجید کی درست اور اغلات سے مبرا طباعت کا اہتمام ہو۔ اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیارات کی پابندی کو فروغ دے اور زکوۃ، عشر اور اوقاف و مساجد کی تنظیم کا اہتمام کرے[8]۔

شراب اور دیگر اخلاقی برائیوں کا امتناع

ریاست کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ قحبہ گری، جوئے اور منشیات کا قلع قمع کرے۔ ناشائستہ مواد کی طباعت، اشاعت، اس کا فروغ اور سر عام نمائش ممنوع ہو۔ طبّی مقاصد کو چھوڑ کر مسلمانوں کے لیے شراب کا امتناع ہو[9]۔

سود کی ممانعت

ممکنہ حد تک سود کے خاتمے کا عہد بھی دستور میں موجود ہے[10]۔

---

[7] آرٹیکل 31

[8] آرٹیکل 31(2)

[9] آرٹیکل 37

[10] آرٹیکل 38، چھبیسویں ترمیم

اسلامی اتحاد اور مسلم ممالک سے برادرانہ تعلقات

دستور ریاست کو پابند کرتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں مسلم ممالک سے برادرانہ تعلقات کو فروغ دے اور انہیں مستحکم کرے[11]۔

صدر کا مسلمان ہونا

ریاست کا صدر مسلمان ہوگا[12]۔

شرائط رکنیت پارلیمنٹ

پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے لازم ہے کہ امیدوار کی عام شہرت احکام اسلام سے روگردانی کرنے والے کی نہ ہو۔ لازم ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کا مناسب علم رکھتا ہو، ایماندار، متقی اور امین ہو، فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو، یہ شرط غیر مسلم امیدواروں پر عائد نہیں ہوتی[13]۔

وفاقی شرعی عدالت

اپنے چیف جسٹس سمیت آٹھ مسلمان ججوں پر مشتمل صدر مملکت کی قائم کردہ یہ عدالت، اپنی کسی تحریک پر، یا پاکستان کے کسی شہری، وفاقی یا کسی صوبائی حکومت کی درخواست پر کسی قانون یا اس کی کسی شق کا جائزہ لے سکتی ہے اور یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ یہ قانون یا اس کی شق قرآن و سنت میں مذکور احکام اسلام سے متصادم تو نہیں ہے۔ اس عدالت میں زیادہ زیادہ تین علماء جج بھی ہوتے ہیں۔14۔

شریعت اپیلیٹ بنچ

وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایک بنچ ''شریعت اپیلیٹ بنچ'' کے نام سے موجود ہے۔ یہ بنچ سپریم کورٹ کے تین مسلمان ججوں اور زیادہ

---

[11] آرٹیکل 40

[12] آرٹیکل 41(2)

[13] آرٹیکل 62

[14] باب 3۔اے

سے زیادہ تین مسلمان علماء ججوں پو مشتمل ہوتا ہے[15]۔

اسلامی نظریاتی کونسل

مختلف مکتب ہائے فکر میں سے چیئر مین سمیت، کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ بیس افراد پر مشتمل اس ادارے کا دستوری نام کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی ہے۔ اس ادارے کا کام اسلامی تعلیمات کے حوالے سے گزشتہ قوانین کا جائزہ لینا اور وفاقی قانون کی صورت میں صدر اور صوبائی قانون کی صورت میں گورنر، یا کسی ایوان (قومی اسمبلی، سینٹ یا صوبائی اسمبلی) کی مجموعی رکنیت کے چالیس فیصد ارکان کے مطالبہ پر رائے دینا ہے۔ رائے طلب کیے جانے پر کونسل پندرہ دن کے اندر رائے دیتی ہے، یا سوال کنندہ کو مطلع کرتی ہے کہ جواب کے لیے اسے کتنی مدد درکار ہو گی[16]۔

قرارداد مقاصد کی ابتدا

قرارداد مقاصد کا اصل متن دستور کے ضمیمہ جات میں دیا گیا ہے۔ متن کی ابتدا تسمیہ (بسم اللہ الرحمن الرحیم) سے ہوتی ہے[17]۔

صدارتی حلف کی ابتدا اور متن

صدارتی حلف کی عبارت دستور میں ضمیمے کے طور پر ہے۔ اس کی ابتدا تسمیہ سے ہوتی ہے۔ اس عبارت میں صدر اقرار کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، اللہ کی وحدانیت اور توحید، الہامی کتب جن میں قرآن پاک آخری کتاب ہے، ختم نبوت کہ حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں، روز قیامت اور قرآن وسنت کی جملہ تعلیمات واحکام پر ایمان رکھتا ہے۔ اس عبارت میں صدر کی طرف سے یہ عہد ملتا ہے کہ وہ اس اسلامی نظریے کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہے گا جو قیام پاکستان کی بنیاد ہے۔ آخر

---

[15] آرٹیکل 203۔ای(3)

[16] آرٹیکل 227 نیز آرٹیکل 228تا231

[17] ضمیمہ آرٹیکل 2۔اے

میں اللہ سے نصرت کی دعا ہے[18]۔

وزیر اعظم کے حلف کی عبارت

یہ حلف بھی تسمیہ سے شروع ہوتا ہے۔ حلف کی ابتدا میں وزیر اعظم اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اللہ کی وحدانیت اور توحید، کتب الہیہ جن میں قرآن آخری کتاب ہے، حضرت محمد ﷺ کی نبوت جن کے بعد کوئی نبی نہیں، یوم حساب اور قرآن و سنت کی جملہ تعلیمات و احکام پر ایمان رکھنا وزیر اعظم کے حلف کی عبارت میں شامل ہے۔ پھر وہ قیام پاکستان کی بنیاد---اسلامی نظریہ---کے تحفظ کا عہد کرتے ہوئے آخر میں اللہ سے استعانت کی دعا کرتا ہے[19]۔

دیگر دستوری مناصب کے حلف کی عبارتیں

ماسوائے وفاقی شرعی عدالت کے جج صاحبان کے اور شریعت اپیلیٹ بنچ کے جج صاحبان کے دیگر دستوری مناصب کے لیے اسلام شرط نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دیگر عہدوں کے حلف کی عبارتوں میں اسلام کی جھلک نظر نہیں آتی لیکن غالباً غیر شعوری طور پر ان تمام مناصب کی حلف کی عبارتیں تسمیہ سے شروع ہوتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ تقریباً 98 فیصد مسلم آبادی والے اس ملک میں یہ گمان کرنا بعید از قیاس نہیں ہے کہ ان عہدوں پر مسلمان عہدیدار ہی ہوں گے[20]۔

مسلمان ملازمینِ حکومت کو فرائض دین کی پابندی اور شعائر اسلام کے التزام میں پوری سہولتیں باہم پہنچائی جائیں۔

عوام کی اسلامی تربیت

پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر، اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور تصورات مرتب کرنے کے قابل بنانے اور انہیں ایسی سہولیات مہیا کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے

---

[18] جدول سوم، صدر، آرٹیکل 42

[19] جدول سوم، وزیر اعظم، آرٹیکل 91(4)

[20] جدول سوم، وفاقی وزیر یا وزیر مملکت، آرٹیکل 92(2)

جن کی مدد سے وہ قرآن پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں۔[21]

حکومت ملک کے مسلمانوں کے لیے یہ کوششیں کرے گی:

- قرآن اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دینا، عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کے لئے سہولیات فراہم کرنا اور قرآن پاک کی صحیح اور من و عن طباعت اور اشاعت کا اہتمام کرنا۔
- ہر قسم کے منشیات، جوئے اور عصمت فروشی کا زیادہ زیادہ تین سال کے اندر قانون سازی کے ذریعے مکمل انسداد کیا جائے۔
- دہریت و الحاد کی تبلیغ اور قرآن و سنت کی توہین اور استہزاء کا بذریعہ قانون سازی انسداد کیا جائے۔[22]

نشرواشاعت کی نگرانی

ریاست عصمت فروشی، قمار بازی اور ضرر رساں ادویات کے استعمال اور فحش ادب اور اشتہارات کی طباعت، نشرواشاعت اور نمائش کی روک تھام کرے گی۔[23]

شراب پر پابندی

نشہ آور مشروبات کے استعمال کی، سوائے اس کے کہ وہ طبّی اغراض کے لیے یا غیر مسلموں کی صورت میں مذہبی اغراض کے لئے ہوں، روک تھام کرے گی۔[24]

معاشی پالیسی

ریاست کی معاشی پالیسی اسلام کے اصول عدلِ عمرانی پر مبنی ہونی چاہیے اور بلا امتیاز مذہب، نسل یا

---

[21] آرٹیکل 31(1)

[22] آرٹیکل 31(1)

[23] آرٹیکل 37

[24] آرٹیکل 37(3)

رنگ عوام کی ہر قسم کی بہبود کا انتظام کیا جائے۔[25]

پارلیمانی امیدوار کے لیے اخلاقی ضابطہ

امیدوار صوبائی اسمبلی کے نااہلیت کی چار اسباب میں مندرجہ ذیل پانچویں سبب کا اضافہ اور امیدوار قومی اسمبلی کے لیے ان پانچوں کا ہونا ضروری ہے:

(۱) وہ فرائض اسلام کا پابند اور کبائر سے مجتنب ہو۔

کوئی شخص مجلس شوری کا رکن منتخب ہونے یا چنے جانے کا اہل نہیں ہوگا اگر:

(۲) وہ اچھے کردار کا حامل نہ ہو اور عام طور پر احکام اسلام سے انحراف میں مشہور ہو۔

(۳) وہ اسلامی تعلیمات کا کافی علم نہ رکھتا اور اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند، نیز کبیرہ گناہوں سے مجتنب نہ ہو۔

(۴) وہ سمجھ دار، پارسانہ ہو اور فاسق ہو، ایماندار اور امین نہ ہو۔

(۵) انتخابی نہ اہلی کے لیے کسی عدالت سے کسی جرم کے ارتکاب پر سزا یافتہ ہونے کی بجائے کسی اخلاقی جرم میں سزا یافتہ ہو۔ کسی اخلاقی پستی میں ملوث ہونے یا جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں سزا یافتہ شخص مجلس شوری کا رکن منتخب ہونے یا چنے جانے کا اہل نہیں ہوگا۔[26]

غیر مسلم کی تعریف

''غیر مسلم'' سے مراد ایسا شخص ہے جو مسلمان نہ ہو اور اس میں مسیحی، ہندو، سکھ، بدھ یا پارسی فرقے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص، قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ کا (جو خود کو احمدی یا کچھ اور کہلاتے ہیں) یا کوئی اور جیسے بہائی، اور جدولی ذاتوں میں سے کسی سے تعلق رکھنے والا شخص شامل ہے۔[27]

---

[25] آرٹیکل 38(3)

[26] آرٹیکل 26

[27] آرٹیکل 260(3)

پاکستان کے تجربات سے اسلامی آئین سازی کا سبق

عمران احمد*

مسلمان اکثریتی ممالک کو اکثر یہ چیلنج درپیش ہوتا ہے کہ وہ جدید مغربی طرز پر مبنی ریاستی اور آئینی نظام میں مذہب کے کردار اور مقام کو کس طرح ہم آہنگ کریں۔ یورپی نوآبادیاتی تسلط سے آزادی کے بعد کئی ممالک میں آئینی معاملات کا محور یہی سوال رہا ہے۔

یہ صورتحال خاص طور پر ملائیشیا اور انڈونیشیا میں دیکھی گئی، جہاں آزادی کے بعد آئینی تشکیل کے دوران مذہب ایک اہم اور متنازع موضوع کے طور پر ابھرا۔ ملائیشیا کو ایک اسلامی ریاست کے طور پر قائم کرنے کا منصوبہ نہ صرف مبہم بلکہ مشکل بھی ثابت ہوا۔ سیاستدان اس سوال پر مختلف اور متضاد مؤقف رکھتے ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کیسی ہونی چاہیے؟

ملائیشیا کے آئین میں کئی دفعات اور شقیں اسلام کی سیاسی اور قانونی اہمیت کو تسلیم کرتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں نے بھی اسلامائزیشن کے پروگرام شروع کیے ہیں، لیکن فیڈریشن کی اسلامی شناخت ایک مستقل تنازع اور بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔

اسلام کو سیاست کا محور بنانے سے کئی آئینی اور قانونی مسائل پیدا ہوئے ہیں، خاص طور پر سول اور شرعی عدالتوں کے دائرہ اختیار کے حوالے سے۔ اسلامائزیشن کی تجاویز، جن میں بعض اوقات حدود شامل ہوتی ہیں (قرآنی سزاؤں کا نفاذ)، سیاسی منظرنامے میں نمایاں ہیں، حالانکہ ان پر انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق کے علم برداروں کی جانب سے سخت مخالفت کی جاتی ہے۔ یہ تنازعات کئی بار فسادات اور تشدد کا باعث بنے ہیں، مذہبی اقلیتوں کو خطرات لاحق ہوئے ہیں، اور ملک میں فرقہ

*مضمون نگار 'انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز' سنگاپور میں ریسرچ فیلو ہیں۔

وارانہ بداعتمادی اور دشمنی کو ہوا ملی ہے۔

1945 میں آزادی کے وقت انڈونیشیا کی سیاسی شناخت کافی حد تک غیر واضح تھی۔ اس کی وجہ قوم پرست تحریک میں موجود مختلف اور متضاد سیاسی نظریات تھے۔ تاہم، قومی اتحاد کی ضرورت فوری اور ناگزیر تھی تاکہ ایک متحد انڈونیشیائی ریاست کو جواز فراہم کیا جاسکے۔

اگرچہ انڈونیشیا دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی کا حامل ملک ہے، لیکن اس نے اپنی قومی نظریہ سازی کی بنیاد اسلام کو نہیں بنایا۔ اس کے بجائے، انڈونیشیا نے پانچ اصولوں یا "پنچاسیلا" کو اپنایا، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ خدا پر ایمان

۲۔ قومی اتحاد

۳۔ انسانیت

۴۔ عوامی حاکمیت

۵۔ سماجی انصاف اور خوشحالی

یہ اصول اتنے وسیع اور عمومی تھے کہ مختلف سیاسی دھڑوں نے کسی حد تک انہیں قبول کر لیا۔ اسلام کو سرکاری مذہب کا درجہ نہیں دیا گیا، جیسا کہ ملائیشیا میں کیا گیا تھا، اور نہ ہی سربراہ مملکت کے لیے مسلمان ہونا ضروری تھا۔

اسلامی سیاسی گروہوں نے "پنچاسیلا" کے فلسفے یا صدر سوئیکارنو (1945-1967) کی سیکولر قیادت کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کی۔ یہ گروہ نظریاتی معاملات پر اکثر منقسم رہے اور کبھی متحد ہو کر واضح سیاسی مؤقف پیش نہ کر سکے۔ صدر سہارتو (1967-1998) کے آمرانہ دور میں جب اسلامی نظریات نے قومی فلسفے کو چیلنج کرنے کی کوشش کی، تو انہیں سخت جبر کا سامنا کرنا پڑا۔

1998 میں سہارتو کے اقتدار سے علیحدگی کے بعد "پنچاسیلا" کی مقبولیت کم ہو گئی اور قومی سیاست میں اس کا اثر زائل ہوتا گیا۔ اسلام کے کردار اور مقام کے بنیادی سوالات بدستور متنازع رہے اور ان

معاملات کو اکثر آئینی عدالتوں میں اٹھایا گیا۔

جمہوریت کی طرف منتقلی نے مذہبی فرقوں، جیسے احمدیوں، کی حیثیت اور مذہبی آزادی کے آئینی حقوق کی حدود پر سیاسی مباحث کو جنم دیا۔ سہارتو کے بعد کے دور میں انڈونیشیا نے اپنی تاریخ کے کچھ بدترین مذہبی فسادات اور فرقہ وارانہ تنازعات کا سامنا کیا، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام اور ریاست کے تعلقات پر بحث آج بھی جاری ہے۔

انڈونیشیا کا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مذہب اور ریاست کے تعلق کو واضح طور پر طے نہ کرنے سے طویل مدتی تنازعات اور فرقہ وارانہ مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ قومی شناخت اور اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے متوازن، جامع اور عادلانہ نظام کی ضرورت ہوتی ہے جو مختلف سیاسی اور مذہبی گروہوں کے خدشات کو مدنظر رکھے۔

عرب بہار کے بعد سامنے آنے والے سیاسی اور آئینی مباحث نے بھی یہ ظاہر کیا کہ مذہب کو آئینی طور پر ریاست میں جگہ دینے کے مسائل آج تک حل نہیں ہو سکے۔ خاص طور پر مصر میں 2011 کے انقلاب کے بعد آئین سازی کے تجربے نے ریاست اور مذہب کے تعلق پر تلخ اختلافات کو دوبارہ جنم دیا۔ مصر کی سیاسی جماعتیں آئین میں مذہب اور مذہبی قوانین کی حیثیت پر شدید طور پر منقسم رہیں۔ 2012 کا آئین، جو اس وقت ایک غیر مقبول سیاسی معاہدہ تھا، ان تنازعات کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ 2012 کے آئین میں شرعی عدالتوں کا کوئی الگ نظام متعارف نہیں کرایا گیا، اور تمام قانونی معاملات (بشمول مذہبی قوانین) کا فیصلہ سپریم آئینی عدالت (SCC) کے ذریعے ہونا تھا۔ تاہم، یہ واضح نہیں تھا کہ آیا SCC کو قانونی معاملات میں الازہر کے فتووں کی پیروی کرنا لازم تھا یا صرف ان سے رہنمائی لینا تھی۔

مصر کا تجربہ یہ واضح کرتا ہے کہ شریعت کو قانون سازی کی بنیاد بنانے اور مذہبی اداروں کو اختیارات دینے سے اقلیتوں اور خواتین کے تحفظات سمیت کئی اہم مسائل ابھرتے ہیں، جنہیں حل کیے بغیر سیاسی استحکام ممکن نہیں۔ مصر کا 2012 کا آئین نہ صرف غیر مقبول تھا بلکہ اس کی سیاسی عمر بھی بہت مختصر رہی۔ جیسا کہ رینر گروٹے اور ٹلمن جے روڈر نے لکھا، یہ دستاویز "اسلامی ریاست کے واضح اور

مربوط تصور کو نافذ کرنے میں ناکام رہی۔"

2014 کا آئین، جو فوجی حکومت کے زیر سایہ تیار کیا گیا، نے مذہب کے کردار کو واضح طور پر محدود کر دیا۔ اس آئین نے روایتی فقہ یا قانون سازی کے عمل میں الازہر کے سینئر علما سے مشاورت کا ذکر ہی ختم کر دیا۔ اسلام اور شریعت کے حوالے سے آئینی زبان کو بہت مبہم اور غیر واضح رکھا۔ مذہبی معاملات میں ریاستی مداخلت کو روکنے کے لیے عمومی دفعات متعارف کرائیں۔ نئے آئینی فریم ورک کے تحت الازہر کی ریاستی سرپرستی تو برقرار رہی، لیکن اس کا سیاسی اثر و رسوخ ختم کر دیا گیا۔ نئے آئین کا سب سے نمایاں اور متنازع پہلو آرٹیکل 74 تھا، جس کے تحت مذہب کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کو واضح طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔

اسلامی جماعتوں کی مخالفت کرنے والے عناصر آج بھی جیلوں میں ہیں، جو ظاہر کرتا ہے کہ مصری سیاست میں اسلام کے کردار اور مقام پر قومی اتفاق رائے ابھی بہت دور ہے۔ یہ صورتحال اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ریاست اور مذہب کے تعلقات پر مباحثہ ابھی جاری ہے اور اس کا حل نکالنا ایک پیچیدہ اور وقت طلب عمل ہوگا۔

مسلم اکثریتی ممالک کی اپنے آئین میں اسلام کی حیثیت پر اتفاق رائے پیدا کرنے میں ناکامی ایک اہم مسئلے کی نشاندہی کرتی ہے۔ مختلف ممالک کی صورتِ حال اس چیلنج کی پیچیدگی کو واضح کرتی ہے۔

ملائیشیا نے آئین میں کئی اسلامی شقیں شامل کی ہیں اور بارہا اپنے قوانین اور اداروں کو اسلامیانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود، ملک اپنی اسلامی شناخت کے حوالے سے غیر یقینی کا شکار ہے۔

انڈونیشیا نے اپنے آئین میں اسلام کا کوئی نمایاں ذکر نہیں کیا۔ لیکن یہ حکمت عملی بھی ریاست کے مذہبی کردار سے جڑے بنیادی سوالات کو حل کرنے میں ناکام رہی۔ ان مسائل کو اکثر آئینی عدالتوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

مصر نے دونوں راستے اختیار کیے۔ ایک طرف شریعت سے متعلق جامع آئینی شقیں شامل کیں، اور دوسری طرف مذہب کو محض علامتی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ تاہم، یہ جھول قومی سطح پر اتفاق رائے پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

یہ تمام تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ مسلم اکثریتی ممالک کو آئین سازی اور آئینی اصلاحات کے دوران درج ذیل سوالات کا سامنا رہتا ہے:

۱۔ قومی اور اسلامی شناخت کے درمیان تعلق

۲۔ اسلام کا کردار اور اسلامی قانون کی حیثیت

۳۔ مذہبی تنوع اور ریاست کی مذہبی شناخت میں ہم آہنگی کیسے ممکن ہو؟

یہ مسائل ہر ملک کے لیے ایک جیسے نہیں ہوتے، اور ان کا کوئی واحد اور حتمی حل موجود نہیں ہے۔ ہر ملک کی سیاسی، تاریخی اور سماجی صورتِ حال مختلف ہوتی ہے، جس کی بنیاد پر اس کا آئینی راستہ متعین کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ہر ملک کا تجربہ مختلف ہے، لیکن ان تجربات سے اہم سبق حاصل کیے جا سکتے ہیں جو دیگر ممالک کو اپنے مسائل کے حل میں مدد دے سکتے ہیں۔ یہ سبق یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ آئینی تصفیے کے لیے عملی اور متوازن حکمت عملی اپنانا ضروری ہے، جو مذہبی، سیاسی اور سماجی عوامل کو یکجا کر سکے۔

پاکستان کا تجربہ ان چند ممالک میں سے ہے جو آئین میں مذہب کی حیثیت کو آئینی طور پر تسلیم کرنے کے معاملے پر انتہائی گہرائی اور مستقل مزاجی سے جدوجہد کر چکے ہیں۔ پاکستان کے تجربات نہ صرف موجودہ دور کے مسلم اکثریتی ممالک میں اسلام کے کردار پر ہونے والی بحثوں کے لیے اہم ہیں، بلکہ عالمی سطح پر مذہب اور سیاست کے تعلقات پر ہونے والی بحثوں کے لیے بھی مفید ہیں۔

ملائیشیا، انڈونیشیا اور مصر جیسے تجربات، جو اوپر تفصیل سے بیان کیے گئے، ایک مشترکہ نمونہ پیش کرتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا مطالعہ خصوصاً اہم اور مفید ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ آزادی کے بعد مسلم اکثریتی ممالک میں قومی شناخت کسی نہ کسی طریقے سے اسلام سے جڑی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر، بنگلہ دیش جو پاکستان سے علیحدہ ہو کر اپنی بنگالی ثقافت کی بنیاد پر الگ ہوا تھا، اب اسلام کی یکجہتی کی طاقت کی طرف رجوع کرتا نظر آ رہا ہے۔

یہ تمام ممالک اس سوال کا سامنا کرتے ہیں کہ آیا اسلام آئینی طور پر اہم ہے یا نہیں، اور آئینی مقدمات

اکثر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اسلام ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم، اصل تنازعہ یہ ہے کہ اسلام کو عملی قانونی اور سیاسی اصطلاحات میں کیا معنی دیے جائیں یا اداروں کے ڈھانچے میں اسلام کا کردار کیا ہو۔ اس ضمن میں پاکستان جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا، ایک خاص نوعیت کا حامل ملک ہے اور اس کا مطالعہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

پاکستان کا آئین ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ جمہوری اور اسلامی اصولوں کے امتزاج کو عملی شکل دیتا ہے، جو مسلم دنیا کے لیے ایک اہم نمونہ ہے۔ 1973ء کے آئین میں اسلامی شریعت کو بنیادی رہنما اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا، جبکہ جدید ریاستی ڈھانچے میں جمہوریت، مساوات، اور بنیادی انسانی حقوق کو بھی شامل کیا گیا۔ پارلیمانی نظام حکومت کے تحت عوامی رائے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ریاستی معاملات میں اسلامی نظریات کی پاسداری کی گئی ہے، جیسا کہ قرارداد مقاصد اور اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام سے ظاہر ہوتا ہے۔

پاکستان کے آئین میں اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت، عورتوں کے حقوق کے تحفظ، اور بنیادی آزادیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق شامل کیا گیا ہے، جس سے آئین کی جامعیت اور ہمہ گیری کا ظاہر ہوتی ہے۔ دیگر مسلم ممالک پاکستان کے آئین سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ جمہوریت اور اسلام کو ایک دوسرے کے ساتھ کیسے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے تاکہ ریاست میں اعتدال، سماجی ہم آہنگی، اور سیاسی استحکام کو فروغ دیا جا سکے۔ مزید برآں، آئین میں صوبائی خود مختاری کا تصور، عدلیہ کی آزادی، اور بنیادی حقوق کی ضمانت جیسے پہلو ایسے ہیں جنہیں مسلم دنیا کے دیگر ممالک اپنی آئینی اصلاحات میں شامل کر سکتے ہیں تاکہ عوامی رائے کو اہمیت دی جا سکے اور ترقی پسند ریاستی نظام قائم کیا جا سکے۔

پاکستان کی آئینی سیاست اور مذہب کے تعلق کا تجزیہ اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ مسلم اکثریتی ممالک میں اسلامی شناخت اور آئینی ڈھانچے کے درمیان تعلقات پر مسلسل بحث ہوتی رہتی ہے، اور پاکستان اس بحث میں ایک منفرد اور اہم کردار ادا کرتا ہے، جس کے تجربات سے دوسرے مسلم ممالک استفادہ کر سکتے ہیں۔

- Fundamental Human Rights in the Constitution of Muslim Countries 136
- Religious Freedom and Protection of Minority Rights in the Constitution of Muslim Countries 146
- Constitutional Crises, Colonial Influences, and Challenges ... 152
- Impact of Arab Spring on Constitutions 159
- Criteria for an Islamic State and the Values of Political Formation..... 168

Chapter 04: Religious Movements and Constitutional Theories

- Modern Constitutional Formation: Analysis of the Ideologies of Religious Groups 179
- Afghan Jihad and Islamic Constitution..... 188
- Sharia Status of the State of Pakistan and Argument of Militants 201

Chapter 05: Constitution in Muslim World and its Political and Legal Aspects

- Constitution of Tunisia: Features and Political and Legal Crisis 211
- Constitution of Indonesia: Features and Political and Legal Crisis 219
- Constitution of Bangladesh: Features and Political and Legal Crisis 227
- Constitution of Gulf States: Features and Political and Legal Crisis 235
- Constitution of Malaysia: Features and Political and Legal Crisis 242
- Constitution of Turkey: Features and Political and Legal Crisis 249
- Constitution of Egypt: Features and Political and Legal Crisis..... 255
- Constitution of Pakistan: Features and Political and Legal Crisis 261
- Islamic Framework of the Constitution of Pakistan 270
- Lessons from Pakistan's Experiences in Islamic Constitution-Making 279

TABLE OF CONTENTS

- Foreword ..... *Allama Dr. Raghib Hussain Naeemi* 05
- Constitutions of the Muslim World, crisis, and possible Solutions ..... *Muhammad Israr Madani* 07

Chapter 01: Constitution Concepts, History and Elements of Composition

- Introduction and Key Features of a Constitution 17
- The Constitution in the West: History, Evolution, and Challenges..... 21
- An Exploratory Study of the Relationship between Religion and State ..... *Jonathon Fox* 29
- Contemporary Constitutions and Religion 33

Chapter 02: Constitutions of the Muslim World: Historical, Cultural and National Aspects

- Beginning of Constitutional Development in the Muslim World 39
- Islamic Constitution: Evolutionary Phases and Technical Framework ..... Dr. Ikram ul Haq Yaseen 52
- Struggle of Islamic Constitution in Contemporary World..... 71
- Constitutional Crisis in Islamic Civilization 82
- Constitution Making Powers and Islamic Approach in Contemporary World 97
- Islamic Jurisprudential Perspectives and Modern Constitution Concepts..... 105

Chapter 03: Constitutions in Muslim Countries: Islamic Belief and Practical Efforts

- The significance of Human Rights in Islamic Constitution 115
- Inclusiveness of Constitutions in Muslim Countries 128
- Islamic Elements in the Constitution of Muslim OIC Member Countries 133

Finally, the book examines the political and legal aspects of constitutions across various Muslim-majority countries, presenting case studies of Tunisia, Indonesia, Bangladesh, the Gulf states, Malaysia, Turkey, Egypt, and Pakistan. Each case highlights unique challenges, features, and political crises, along with efforts to embed Islamic frameworks within governance structures. Special emphasis is placed on Pakistan's constitutional journey, offering lessons on the successes and struggles of Islamic constitution-making. This analysis provides a nuanced understanding of the dynamic interplay between religion, law, and politics in shaping the constitutional landscape of the Muslim world.

Muslim World and Constitutional Crisis

Abstract

This book provides an in-depth exploration of the constitutions in the Muslim world, analyzing their historical, cultural, and ideological evolution. It begins by defining the fundamental concepts, history, and elements of constitutional development, examining key features and challenges in both Islamic and Western contexts. The relationship between religion and state is critically studied, providing insights into how contemporary constitutions incorporate or struggle with religious principles. This section sets the stage for understanding the complexities of blending modern governance structures with traditional and religious beliefs.

The book then delves into the historical, cultural, and national aspects of constitution-making in the Muslim world, tracing the beginning of constitutional development and exploring the efforts to establish Islamic constitutions in modern times. It highlights the constitutional crises that have emerged within Islamic civilizations and the interplay of Islamic jurisprudence with modern constitutional concepts. This discussion broadens into the practical and ideological efforts of Muslim countries to reconcile religious beliefs with human rights, inclusiveness, and minority protections in their constitutions. Critical challenges, including colonial legacies, the impact of the Arab Spring, and evolving criteria for Islamic governance, are analyzed to provide a comprehensive understanding of the subject.

BOOK SERIES

YEARLY ISLAMABAD

TAHQIQAAT

2024

4

Muslim World and Constitutional Crisis

تحقیقات

TAHQIQAAT.PK

INTERNATIONAL RESEARCH COUNCIL FOR RELIGIOUS AFFAIRS

IRCRA Publications

+92 311 02 99 995, +92 51 22 25 650
Islamabad, Pakistan

ircra.org IRCRA ircra3 IRCRA3